اس سالنامے کے جملہ حقوق نظم و نثر بحق ادبی دنیا محفوظ ہیں
سالنامہ ادبی دُنیا لاہور
قیمت ایک روپیہ چار آنے (عہ)
سالانہ چندہ پانچ روپے (صہ)
ایڈیٹر:۔ صلاح الدین احمد
جائنٹ ایڈیٹر:۔ میراجی۔
کتبہ محمد شریف صالح پوری
(اندرونی صفحات گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں اور ٹائیٹل اور تصاویر ایلائیڈ پریس موری گیٹ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر پرنٹر پبلشر
لاہور سے شائع ہوا)

Good News!
ان گھڑیوں کی ساخت میں بے نظیر خوبی
اور ناقابلِ انکار امتیاز کے بلند
معیار کو مدِ نظر رکھا گیا ہے
WEST END WATCH CO.
مینی اے چر - کیو ۲
ایدبرائٹ اسٹیل ـــــ ۶۵ روپے
۱۸ قیراط سونا ـــــ ۱۶۰ روپے
سیکنڈس مینی اے چر - چوکور
رولڈ گولڈ ـــــ ۳۴ روپے
۱۸ قیراط سونا ـــــ ۶۵ روپے
نیو کے لی بر مد ای"
رولڈ گولڈ ـــــ ۴۸ روپے
۱۸ قیراط سونا ـــــ ۱۴۵ روپے
سیکنڈس نیو کے لی بر چوکور
رولڈ گولڈ ـــــ ۳۸ روپے ـــــ ۱۸ قیراط سونا - ۹۵ روپے
گھڑی رکھنے والوں کے حلقے میں ویسٹ اینڈ کا نام خوبی اور ان کا ضامن سمجھا جاتا ہے۔ اور اس کا باعث یہ ہے کہ ویسٹ اینڈ کی ہر گھڑی نہایت صحیح وقت دیتی ہے، اور خریدار کو اپنے روپیہ کا پورا بدل وصول ہو جاتا ہے۔ ویسٹ اینڈ کی گھڑی ہر قیمت پر مل سکتی ہے۔ مگر اس کا خیال رکھیں کہ آپ سچ مچ ویسٹ اینڈ خرید رہے ہیں
آرڈر کے وقت ہم سے ان قیمتوں کی تصدیق کرا لینی چاہیئے
کیونکہ آجکل قیمتیں گھٹتی بڑھتی ہیں
Free!
ویسٹ اینڈ واچ کمپنی بمبئی و کلکتہ
WEST END
WATCH CO.
BOMBAY
CALCUTTA
قیمتیں نہایت مناسب
اور قابلِ اعتبار ہیں

ادبی دنیا لاہور

سالنامہ ۱۹۴۰ء

فہرستِ مضامین

حصۂ نظم

اُنہیں ایک "گلزار" بنا دیا ہے۔ باغ کی کسی روش کا ایک ٹکڑا ہے، سفید رنگ کے پھول کھلے ہیں، ایسے پھول کہ جن میں شاید کسی طرح کی خوشبو نہیں۔ خوشبو تو ہو ہی نہیں سکتی کیونکہ حقیقتاً یہ برف کے سیدھے سادے گالے ہیں!

"نقاشِ شاعر" —— بچوں کے چہروں کا مطالعہ عکاسی فن کار کا ایک محبوب موضوع ہے۔ اس سلسلے میں وہ بعض دفعہ اتفاقاً ایسی کیفیات کو کیمرے کی گرفت میں لے آتا ہے جن سے فوٹو پر مصور کے فن کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ اس تصویر میں بچے کی فکر انگیز آنکھیں، پریشاں بال اور لبوں کے خم میں رکھی ہوئی اُنگلی عنوان کا جواز ہیں۔

"ننھی تماشائی" ریل گاڑی کے کسی ڈبے میں ایک کھڑکی میں بیٹھی ہے اور پیچھے کی طرف بہتے ہوئے منظر کو دیکھنے میں محو ہے۔ وہ کیا دیکھ رہی ہے؟ —— شاید دُور رہٹ چل رہا ہے، شاید کوئی کسان ہل چلاتے ہوئے رُک کر گاڑی کو دیکھ رہا ہے اور یہ اُسے دیکھ رہی ہے، شاید ریل کی پٹڑی سے کچھ دور کوئی گاؤں ہے اور وہاں کے بچے بالے (اور بڑے بوڑھے بھی!) اُن گذرتے ہوئے مسافروں کی ایک نامعلوم کیفیت پر متحیر ہیں جو پاس ہوتے ہوئے بھی اُن سے بہت ہی دُور ہیں، شاید پھیلے ہوئے کھیتوں میں ہرنوں کی ڈار بوئے ہوئے اناج کی تباہ کاری میں مصروف تھی اور اب ریل کی آواز سے ڈر کر قلانچیں بھرتی بھاگ اُٹھی ہے۔ شاید...

"ساکن زندگی" —— عکاسی فن کار کیمرے کے لئے ہمیں ایک اور دنیا میں بھی لے گیا ہے۔ بچوں کے چہروں کی طرح اُس کا ایک محبوب مشغلہ بے جان چیزوں میں جان ڈالنا بھی ہے۔ یہ انگوروں کا خوشہ کیوں چپ ہے؟ یہ چار دانے کہاں جا رہے ہیں؟ —— اور ایک دانہ اُن سے علیحدہ کیوں ہے، کیا وہ اسے ساتھ لے جانے پر رضامند نہیں؟ کیا وہ انہیں گھر ہی پر رہنے کی ناکام تلقین کے بعد کشمکش و پیچ میں کھڑا ہے کہ اُن کا ساتھ دے یا گھر کو لوٹ جائے؟ اور وہ سیب ماتھے پر جھکا ہوا اُس سے اس پانچویں انگور پر "پانچویں سوار" کی پھبتی کی داد کا طالب ہے!

"تنہائی" —— پرندے کو تنہائی کا احساس ہے یا ہماری موجودگی کا؟ دُور جہاں درختوں کی دیواریں آپس میں ملتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں، اندھیرا ہے۔ یہ پرندہ وہاں جانے سے ڈرتا ہے —— نہیں، یہ پرندہ کہانی کا وہ شہزادہ ہے جو سنہرے پانی اور بولتی چڑیا کی تلاش میں نکلا تھا اور جسے ایک پری نے بتا دیا تھا کہ راستے میں تمہیں پشت پر خوفناک آوازیں سنائی دیں گی، لیکن مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ پتھر بن جاؤگے۔ ہم سمجھے! اس نے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ یہ پتھر بن گیا، اور اب یہ پرندہ نہیں بلکہ پتھر ہے۔

"جھیل کے کنارے" —— یہ پرندے پتھر نہیں! یہ پرندے ہیں! جھیل کے کنارے پک نک منا رہے ہیں۔ جھیل چپ چاپ پھیلی ہوئی زمین کے سینے پر لیٹی ہوئی ہے۔

"خزاں کی ایک صبح" —— درخت خزاں کے نمائندے ہیں، اور اُن میں سے چھنتا ہوا نور اور دھندلکا صبح کا اظہار کر رہا ہے۔

"پجارن" —— یہ تصویر جنائز کی ایک رقاصہ کی ہے۔ اُس کے جسم کا سنگیں حسن مندر کی فضا قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور دیوار پر کا "چھتری نما" سایہ ایک تفکر آمیز خموشی پیدا کرتا ہے۔

"یاس" —— یہ تصویر فوٹو آرٹ سے تعلق نہیں رکھتی۔ مصور نے جرمن ڈرامہ نگار گوئٹے کے "فاؤسٹ" سے اپنے موضوع کو لیا ہے۔ اس ڈرامے کی ہیروئن مارگریٹ اپنے مصائب کے لحاظ سے مغربی ادب میں ایک غیر فانی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت مارگریٹ قید خانے کے دروازے پر ہے، جہاں اُسے محبت کا جرم لے گیا ہے۔ فاؤسٹ، اُس کا عاشق ملعون ہو چکا ہے۔ اور وہ خود سماجی لحاظ سے مردود۔ حزن اور یاس کا ایک مجسمہ ہے جو مصور کی الم پرستی میں کھویا ہوا ہے۔ لیکن یہ نور کیسا ہے؟ یاس میں بھی شاید اُمید کی کوئی جھلک موجود ہے۔

"ہجوم عشق" —— یہ تصویر بھی قلم کاری ہی کا نمونہ ہے۔ فضائے بعید سے بے شمار کیوپڈ چلے آ رہے ہیں اور پروانوں کی طرح اپنے مرکز کے پاس پہنچ رہے ہیں۔

افسوس کہ اس دفعہ جنگ کے باعث آپ اُن نئی صورتوں سے آشنا نہ ہو سکے جن کے ذہنوں کی پیداوار اس نمبر کی زینت ہے۔ لیکن یار زندہ اور صحبت باقی کہہ کر ہم رخصت ہوتے ہیں۔ آپ سالنامے کے نگارخانے ہی میں کھوئے رہیئے۔ ہاں، ایک بات یاد رہے کہ سرورق کی دلکشی اس دفعہ بھی حسب معمول سرفراز کے قلم کی رہین ہے۔

میراجی

کُل تصویریں جن کا ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔ رنگین ۶ سادہ ۱۲

سالنامہ ادبی دنیا

سالِ گزراں

آخری رات آ گئی آخر
ہر طرف یاس چھا گئی آخر
زندگی مجھ کو کھا گئی آخر

پھول کھلتے تھے لالہ زاروں میں
نغمے بہتے تھے جوئباروں میں
رقصِ فطرت تھا آبشاروں میں

کس قدر شاق یہ جدائی ہے
عمرِ رفتہ تری دہائی ہے

میرا بچپن یونہی تمام ہوا
پھر جواں سال میرا نام ہوا

ہو چکیں ختم ساری تدبیریں
کٹ گئیں زندگی کی زنجیریں
مٹ رہی ہیں جو میری تصویریں

اب زمانہ تھا میرا شیدائی
ہوش میں آ چکی تھی خود رائی
لے رہی تھی بہار انگڑائی

پھر مجھے ان کو دیکھ لینے دو
آخری بار داد دینے دو

دن یہ تھے میری نوجوانی کے
کامرانی کے، شادمانی کے

روح پرور بسنت کی زردی
دھان کے کھیت کی ہری وردی
دھوپ سے بھاگتی ہوئی سردی

موسمِ گل تھا اور جواں تھا میں
حسنِ ہستی کا رازداں تھا میں
بزمِ عشرت میں نغمہ خواں تھا میں

آنکھ کھولی تو یہ زمانہ تھا
زندگی اک حسیں فسانہ تھا

تھی زمیں میری آسماں میرا
ذرّے ذرّے پہ تھا نشاں میرا

میرے سینے میں شعلے پلتے تھے
میری صورت سے باغ جلتے تھے
پتھروں کے جگر پگھلتے تھے

سردمہری جہاں پہ چھائی تھی
عاقبت کا پیام لائی تھی
کانپتی رہتی سب خدائی تھی

یوں بڑھی گرمیٔ نفس میری
دھوم دنیا میں تھی تو بس میری

میری صورت بھی ایسی بدلی تھی
سرخ چہرے پہ اب سفیدی تھی

عالمِ رنگ و بو پہ مستی تھی
ابر کے ساتھ مے برستی تھی
نشے میں غرق روحِ ہستی تھی

گھٹ گیا دن گھٹی نظر میری
بارِ شب سے جھکی کمر میری
ہو گئی موت ہم سفر میری

ہوش ساون میں تھا نہ جینے کا
زندگی نام ہی تھا پینے کا

اب کہاں فرصتِ اسیری تھی
یادِ ماضی عصائے پیری تھی

کیف زا اب تھی وحشت پیمائی
بار خاطر رہی نہ تنہائی
راس آنے لگی شکیبائی

اب نہ کھلتی تھی چاندنی لبِ جو
اب نہ آتا تھا خوشِ رمِ آہو
اب نہ دنیا میں تھا کوئی مہ رو

پھر بڑھا اس قدر جنوں میرا
مضطرب ہو گیا سکوں میرا

تھا سبھی کچھ مگر نہیں تھا میں
ایک گوشے میں اب کہیں تھا میں!

دیکھتے دیکھتے شباب گیا
میری آنکھوں سے لطفِ خواب گیا
آ رہا تھا جو انقلاب، گیا،

میں کہ آیا تھا مسکرانے کو
باغِ دنیا میں چہچہانے کو
جا رہا ہوں کبھی نہ آنے کو

اب کہاں تھیں بہار کی باتیں؟
سامنے تھیں پہاڑ سی راتیں!

آخری لو سلام ہے میرا،
اب عدم میں قیام ہے میرا!

قیوم نظر

بزم ادب

(۱)

ناظرین اور احباب کو نیا سال مبارک ہو۔ آج ادبی دنیا اپنی زندگی کی بارھویں اور دورِ جدید کی آٹھویں منزل میں قدم رکھتا ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود ہم اپنے سینے میں امید کا چراغ روشن پاتے ہیں۔ ادبی دنیا نے اس مختصر عرصے میں اردو ادب کی جو خدمت انجام دی وہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں اور شاید اس کا سب سے نمایاں پہلو وہ ادبی تحریک ہے جس نے ملک کے نوجوان طبقے میں لکھنے لکھانے کا شوق پیدا کر کے آتش نوا شاعروں اور حقیقت نگار ادیبوں کی ایک خاصی جماعت تیار کر دی ہے۔ اس جماعت کے ممتاز افراد زندگی اور ادب کو آپس میں اس قدر قریب لا رہے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب ان کے کارنامے ادبیاتِ عالیہ میں شمار ہونے لگیں گے۔

گذشتہ بارہ مہینے میں ادبی دنیا ترقی کی جن نئی راہوں پر گامزن رہا، ان میں سے ایک خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ ہم مدت سے سوچ رہے تھے کہ ملک کے سر برآوردہ رسائل میں آئے دن جو بلند پایہ مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں، اُن کا یک جا تذکرہ کہیں میسّر آجائے تو وہ نہ صرف بقائے ادب کا باعث ہوگا بلکہ پڑھنے والوں کے لئے ایک لازوال دلچسپی کا ذریعہ ثابت ہوگا۔ ہماری اپنی حالت یہ تھی کہ معقول ضخامت اور کشادہ تقطیع کے باوجود منتخب مضامین نظم و نثر کی فراوانی تنگیٔ داماں کی شاکی رہتی تھی۔ کچھ روز اسی گومگو میں گذرے مگر آخر شوق نے مصلحت پر غالب آکر ہمیں مجبور کر دیا کہ اس خوشگوار مگر سخت مشکل کام کی خود ہی ابتدا کریں۔ چنانچہ کچھ کتابت باریک کی گئی، کچھ صفحات بڑھائے گئے اور خدا کا نام لے کر "دنیائے ادب" کے زیرِ عنوان یہ دلچسپ سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ آج اسے جاری ہوئے چھ ماہ ہوتے ہیں، سالنامے کو چھوڑ کر جنوری سے حسبِ معمول شائع ہوتا رہے گا اور جہاں اس سے اور فائدے مرتب ہوں گے۔ وہاں یہ ہمارے ناظرین اور ہمارے معزز معاصرین میں ربط و شناسائی بڑھانے کے اسباب مہیّا کرے گا۔

اس سال، ہماری محفل میں جو نئے اہلِ قلم اور شعراء شامل ہوئے، ہم انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ ان کے متعدد مضامین نظم و نثر ہمارے صفحات کی زینت بنے، اور ہمیں امید ہے کہ ادبی دنیا سے اُن کا تعلق ہمارے لئے باعثِ فخر و مسرّت اور ان کے لئے موجبِ ترقی و کامیابی ثابت ہوگا۔ نئے آنے والوں میں سے محترمہ عصمت چغتائی، ظہیر الدین احمد دھرم پرکاش آنند، ابومسلم صدیقی، محی الدین زورؔ قادری، اپندر ناتھ اشک، انور اعجاز قیصر، علی احمد، ناکارہ حیدر آبادی، منیب الرحمٰن۔ سحرؔ رام پوری۔ علی عباس جلال پوری، مجنوں گورکھ پوری اور عبدالسلام خورشید خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ لیکن جہاں ہمیں نئے آنے والوں کی خوشی ہے، وہاں چند ایسے بزرگوں اور دوستوں کے نہ آنے کا غم بھی ہے جنہیں دنیا کے دوسرے مشاغل نے اس سال ہماری بزم کو رونق بخشنے کا موقعہ نہ دیا۔ ان میں حفیظ ہوشیارپوری ہیں، جنہیں ریڈیو ہم سے چھین کر لے گیا، عاشق بٹالوی ہیں جو سیاست کے بحرِ ذخّار میں اس طرح غوطہ زن ہوئے، کہ اب تک اُن کی سلامتی کی کوئی خبر نہیں ملی۔ حامد علی خاں ہیں جن کی روائتی کم فرصتی اور "ہمایوں اسیری" ادبی دنیا کے لئے سات شعر کی ایک غزل کہنے کی روادار نہ ہوئی۔ فیاض محمود ہیں جن کا ماہِ عسل بڑھ کر اب سالِ عسل کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ وقار انبالوی ہیں جن کی نسبت سنا ہے کہ سال بھر میں تین سو پینسٹھ مقالات افتتاحیہ لکھنے کے باوجود اب تک زندہ ہیں، علامہ برج موہن کیفی ہیں جن پر دہلی کی "نئی نویلی" نے کچھ ایسے ڈورے ڈالے کہ پرانے نیاز مندوں کو یکسر بھلا دیا۔ ادبی دنیا کے پرانے سرپرست سر عبدالقادر ہیں، جنہیں سرکارِ دولت مدار نے پہلے سات سمندر پار ہم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رکھا اور اب ہندوستان میں اس طرح سینے سے لگائے بیٹھی ہے کہ کسی اور کو پاس تک پھٹکنے نہیں دیتی۔ غرض کہ کس کس کو یاد کریں اور کس کس کی شکایت۔ بسا غنیمت ہے کہ فراموشگار احباب ہمیں شاید دل سے کبھی دور نہیں کرتے۔

اب لیجئے سالنامہ! آپ دیکھیں گے کہ کاغذ کی ہوشربا گرانی اور

سامان تصویر سازی کی کم یابی کے باوجود اس کی ظاہری شکل وصورت میں کوئی فرق نہیں آیا، بلکہ ضخامت اور دوسری خوبیوں کے اعتبار سے موجودہ سالنامہ اپنے پیشرو نمبروں سے کچھ بڑھ کر ہی قدم رکھتا ہے۔ معنوی لحاظ سے بھی کم وبیش یہی کیفیت پائی جاتی ہے۔ مضامین نظم ونثر کے علاوہ تصاویر کا معیار بھی پہلے سے بلند ہے۔ اور ان میں تنوع کی خوبی بہت نمایاں ہے۔ تصاویر اور حصۂ نظم کا تفصیلی تذکرہ آپ کو ان صفحات کے عین پہلے اور عین بعد علٰحدہ صورت میں ملے گا۔ یہاں علمی اور ادبی مضامین اور افسانوں اور ڈراموں کے متعلق ہمیں چند تمہیدی باتیں کہنی ہیں لیکن سب سے پہلے ہم نہایت خلوص سے اپنے اُن قلمی معاونین سے معذرت خواہ ہیں جن کے مضامین نظم ونثر دیر میں موصول ہونے کے باعث یا کسی اور ادارتی مجبوری کی وجہ سے سالنامے میں درج ہونے سے رہ گئے۔ ان میں سے اکثر مضامین کی کتابت بھی ہو چکی تھی اور ان میں سے کسی ایک کا پایہ کسی لحاظ سے بھی ان مضامین سے کمتر نہیں تھا جنہیں سالنامے میں جگہ دی گئی ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہاں بیشتر وہی مضامین دیئے گئے ہیں جن کا اعلان نومبر کے پرچے میں ہو چکا تھا، بعد میں آنے والے مقالے، افسانے اور نظمیں نہایت مجبوری کی حالت روک لی گئیں۔ اب یہ مضامین ادبی دنیا کے آئندہ نمبروں کی زینت بنیں گے، ہمیں امید ہے کہ ہمارے معزز معاونین بالخصوص مرزا عظیم بیگ چغتائی۔ سید بادشاہ حسن حیدرآبادی منشی پیارے لال شاکر، ملک عطاء اللہ کلیم اور سید شہنشاہ حسین رضوی ہماری مجبوریوں کے پیش نظر ہماری معذرت قبول کرنے سے دریغ نہیں فرمائیں گے۔

علمی اور ادبی مضامین

نظیر اکبرآبادی اور اس کی شاعری پر پروفیسر ظہیر الدین احمد نے ایک نہایت دلچسپ اور بے لاگ تبصرہ کیا ہے اور جہاں نظیر کے فن کی خوبیاں اُجاگر کی ہیں، وہاں اس کے کلام کی کمزوریوں پر بھی ایک گہری نگاہ ڈالی ہے۔ اس مضمون میں بعض باتیں ایسی ہیں جو نظیر کے متعلق پہلی بار کہی گئی ہیں۔ مثلاً عام طور پر اردو کے انگریزی داں حلقوں میں نظیر کا مقابلہ شکسپیئر سے کیا جاتا ہے، پروفیسر صاحب نے اس روش کی نہایت معقول مخالفت کی ہے۔ ان کی رائے میں اول تو اس قسم کے مقابلوں کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ یہ موازنے اپنی بدیہی کمزوریوں کے باعث ہمیں کسی صحیح نتیجے تک پہنچنے میں کوئی مدد نہیں دیتے، دوسرے اگر کسی مغربی فن کار سے مقابلہ کئے بغیر چارہ ہی نہ ہو تو پھر نظیر کا انگریزی مماثل چارلس ڈکنز کو بنایا جاسکتا ہے شکسپیئر کو نہیں، اور اس انتخاب کے جواز میں انہوں نے متعدد دلیلیں پیش کی ہیں۔

آگے چل کر صاحب مضمون نے نظیر کا تجزیۂ نفسی کیا ہے۔ اور بڑے دلچسپ پیرائے میں اس کے نفسیاتی رجحانات کا اس کی ہجوم پسندی سے ایک قدرتی تعلق ظاہر کیا ہے۔ ہمارے ہاں اس موضوع پر اب تک کسی نے قلم نہیں اٹھایا تھا۔ مضمون کے آخر میں ظہیر صاحب نے نظیر کی خصوصیات کلام کا نہایت جامع انداز میں یکجا تذکرہ کر دیا ہے، جو پڑھنے والے کے دماغ پر نظیر کے متعلق ایک صاف اور صحیح نقش چھوڑ جاتا ہے۔

حالی، حیات جاوید کی روشنی میں۔ مسدس کے بعد مولانا حالی کا سب سے بڑا کارنامہ سر سید احمد خاں کی لائف حیات جاوید ہے۔ اس میں حالی ایک مخلص سوانح نگار، ایک اثر آفریں انشا پرداز اور ایک یار وفادار کی حیثیت سے ہماری توجہ بے اختیار اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ابو مسلم صاحب صدیقی نے بڑے سلیقے سے مولانا حالی کی ان خصوصیات کا جائزہ لیا ہے اور ان کا مقابلہ بہت سی باتوں میں ڈاکٹر جانسن کے سوانح نگار باسول سمتھ سے کیا ہے۔ اور ان کی صاف گوئی، دیانت داری اور مبالغے سے اجتناب کے پہلوؤں کو حیات جاوید کے سیاق وسباق سے ثابت کیا ہے۔ حالی کا سادہ لیکن پر خلوص اسلوب بیان، اُن کی فطری متانت، اور خودنمائی سے اُن کا گریز ایسی خصوصیات ہیں جو حالی کو سوانح نگار اور انشاپرداز کی حیثیت سے ایک بہت بلند درجہ عطا کرتی ہیں اور صدیقی صاحب کے گراں پایہ مضمون میں حالی کی ان خصوصیات پر ایک جامع بحث کی گئی ہے۔

جرمنی کا یہودی شاعر، ہائینے۔ میراجی نے دنیا کے ان شاعروں پر جن سے ہم لوگ نسبتاً کم آگاہ ہیں تنقیدی اور بیانیہ مضامین کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اسے ملک بھر میں قدر ومنزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا ہے۔ زیر نظر مضمون اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے اور اپنے عالمانہ انداز اور دل آویز منظوم تراجم کے لحاظ سے اس سلسلے کے اکثر مضامین پر فوقیت رکھتا ہے۔ صاحب مضمون نے ابتدائی اوراق میں مغربی ادب کی رومانی تحریک پر ایک گہری نگاہ ڈالی

ہے اور اس کے بدلتے ہوئے رنگوں کی خوب خوب عکاسی کی ہے۔
مضمون کا سب سے پُرلطف حصہ وہ ہے جہاں انہوں نے اپنے مطالب کی وضاحت کے لئے اردو کے مشہور شعراء کے کلام سے مثالیں لی ہیں۔ ہماری رائے میں یہ قیمتی مضمون، جہاں عام ناظرین کے لئے دلچسپی اور واقفیت کا سامان بہم پہنچائے گا، وہاں ادب کے طالبعلموں کے لئے بے حد مفید ثابت ہوگا۔

عہد محمد قلی قطب شاہ میں عید میلاد النبی - دکن کے مشہور اہلِ قلم محی الدین صاحب زور کے قلم سے ایک بیش قیمت اور دل آویز تاریخی مضمون ہے، جس میں قطب شاہی خاندان کے سب سے شاندار، خوش باش اور شاعر بادشاہ کے اُن نفیس و جمیل مشاغل کی تصویر کشی کی گئی ہے، جو اُس زمانے کے قومی تہواروں، خصوصاً عید میلاد سے مخصوص تھے ضمناً اس کی شاعری کے چند دلکش نمونے بھی شامل مضمون کر دیئے گئے ہیں جن سے مضمون کا لطف دوبالا ہو گیا ہے۔

جاپان میں براڈ کاسٹنگ - پروفیسر نور الحسن صاحب برلاس مقیم ٹوکیو ہر سال ادبی دنیا میں جاپانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو پر ایک دلچسپ اور پراز معلومات مضمون لکھا کرتے ہیں۔ اس سال انہوں نے مندرجہ بالا عنوان کے ماتحت جاپان میں ریڈیو کے نشوونما اور جاپان کی قومی زندگی میں اس کی اہمیت اور اثر پر ایک سیر حاصل بحث کی ہے۔ از بسکہ ہندوستانی سوسائٹی میں ریڈیو ایک نسبتاً نیا عنصر ہے اور اس کے اچھے اور فائدہ مند پہلو ابھی جمہور کے سامنے اچھی طرح نمایاں نہیں ہوئے۔ اس لئے یہ مضمون ہماری پوری توجہ کا مستحق ہے۔

مہدی حسن افادی کا اسلوبِ نگارش - پروفیسر احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کا یہ دلچسپ مقالہ ہمیں ایک ایسے ادبی ستارے کی یاد دلاتا ہے جو آمدِ سحر سے بہت پہلے آسمان سے ٹوٹا اور اپنی دل نواز لیکن مختصر درخشانی سے آنکھوں کو روشن کرتا ہوا فضائے بسیط کی تاریکیوں میں کھو گیا۔ ہماری مراد مہدی الافادی مرحوم سے ہے جو مبداء فیاض سے ادب کا نہایت صحیح ذوق لے کر آئے تھے لیکن زمانے نے انہیں فرصت نہ دی کہ وہ اپنی کوئی مستقل ادبی یادگار چھوڑ جاتے اپنی مصروف زندگی میں انہوں نے جو کچھ لکھا وہ چند مقالوں اور تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے لیکن اس مختصر سی پونجی کے باوجود ان کی ادبی حیثیت اس قدر بلند ہو گئی تھی کہ علامہ شبلی جیسے مسلم الثبوت انشا پرداز اُن پر رشک کھاتے تھے زیرِ نظر مضمون میں پروفیسر مجنوں نے مہدی مرحوم کے چند نجی خطوط کے اقتباسات بھی دیئے ہیں۔ جن سے اُن کے اندازِ تحریر کی خصوصیات آنکھوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کی وضع کی ہوئی ایسی ادبی اصطلاحات کا ذکر بھی کیا ہے جو آج بیشتر ادیبوں کی زبان و قلم پر ہیں۔ اُن کے اسلوبِ بیان اور زاویۂ نگاہ کا تجزیہ کیا ہے اور مغربی ادبیات سے مثالیں لے لے کر مہدی کے فن پر نئی روشنی ڈالی ہے۔ پروفیسر مجنوں کا اپنا اندازِ بیان بھی بہت دلکش ہے۔ اور اس پر "ذکر اُس پری وش" کا، مضمون کی دلچسپی کہیں سے کہیں جا پہنچی ہے۔

ترقی پسند ادب اور کثرتِ تعبیر - پروفیسر فیض احمد اپنے مطالب کو جس سادگی اور پُرکاری سے ادا کرتے ہیں وہ کچھ انہی کا حصہ ہے اس مضمون میں انہوں نے "ترقی پسند ادب" کی وضاحت اور وکالت کا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ کہیں اتفاق سے ہم نے "دنیائے ادب" کے ماتحت دو ایک مضامین پر تبصرہ کرتے ہوئے دبی زبان سے "غریب نوازی" کے اُس رجحان کا ذکر کر دیا تھا جو ہمارے چند نوجوان افسانہ نگاروں میں سوشلزم کے ذوق نے پیدا کر دیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اپنے قیمتی مضمون میں ہماری اس بات کا جواب دیا ہے۔ اور خوب دیا ہے۔

اپنے متعلق ہم اتنا ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ ہمیں دنیا کی کسی ایسی تحریک سے دشمنی نہیں جو عوام کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لئے جاری کی گئی ہو اور نہ ہم سرمایہ دارانہ نظام کے گرویدہ ہیں۔ ہم نے محض یہ گذارش کی تھی کہ جس چیز کو آپ "ترقی پسند ادب" کہتے ہیں، اسے آپ نے انسان کی بنیادی اور اجتماعی ضروریات اور سوسائٹی کے لئے زیادہ سے زیادہ فائدہ رساں تحریکوں کے اظہار کا ایک مخصوص ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہ بات "ترقی پسند" کی بلیغ ترکیب سے ظاہر نہیں ہوتی۔ ہماری ناچیز رائے میں ہر وہ ادب ترقی پسند ہے جس میں خلوص، جرأت، حقیقت نگاری اور ژرف نگاہی کے عناصر پائے جاتے ہوں، عام اس سے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کا ترجمان ہو یا انفرادی کا۔ مزدور کے جذبات کی آئینہ داری کرے یا سرمایہ دار کے مشاغل کا نقشہ کھینچے۔ بس ہمارا اور آپ کا اتنا سا اختلاف ہے۔

مضمون زیرِ نظر میں پروفیسر صاحب نے نہایت قابلیت سے ترقی پسند ادب کی وضاحت کی ہے اور اس گروپ کا نقطۂ نظر بیان کیا ہے جو ادب میں ترقی پسندی کے ایک خاص معنے لیتا ہے، اور اس کے ذریعے سے سوسائٹی کی خدمت میں مصروف ہے۔

محلاتِ جانِ عالم اور ان کی شاعری ایک دل آویز مضمون ہے
جسے ہمارے دوست سید تسکین عابدی نے لکھا ہے۔ دو برس پہلے
آپ نے "بیگماتِ اودھ کے خطوط" کے نام سے ایک اسی قسم کا دلچسپ
سلسلہ ادبی دنیا کو عنایت فرمایا تھا جسے بہت پسند کیا گیا تھا۔ یہ مضمون
اُسی سلسلے کی دوسری کڑی ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسے بھی ناظرین
نہایت شوق سے پڑھیں گے۔ یہ مضمون کافی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا
ہے اور اس کے مطالعے سے واجد علی شاہ کے علمی و ادبی ذوق اور ادب
نوازی کے متعلق بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

خضر مرزا سے میری ملاقات۔ مضمون کا عنوان دیکھ کر پہلی
چیز جو ہمارے دماغ میں آئی وہ مرزا غالب کا یہ شعر تھا

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا   گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

مرزا غالب خضر سے ملے ہوں یا نہ ملے ہوں، لیکن ان کے ایک
ممتاز عقیدت مند حمید احمد خاں صاحب ضرور مل آئے ہیں اور یہ کیسی خوش
قسمتی کی بات ہے کہ جنابِ خضر لاہور سے ریل کے ذریعے فقط ایک
رات کی مسافت پر دہلی کے قریب مہرولی میں مقیم ہیں۔

ڈیڑھ دو سال کا ذکر ہے کہ ہمارے عزیز دوست پروفیسر
حمید احمد خاں اپنے ایک ادبی جنون کے زیرِ اثر غالب مرحوم کی زندگی
اور کلام کی نسبت مزید تحقیقات کے سلسلے میں لاہور سے ایک لمبے
سفر پر روانہ ہوئے۔ اور کئی ہفتے اس میں گذار کر اور ہزاروں فرسخ و میل
طے کر کے جب واپس لاہور تشریف لائے تو میں نے اُن کی خدمت میں
گذارش کی کہ حضرت اس دلکش سفر کے مزے تو آپ ہی آپ لیتے رہے
ہمیں سفرنامہ ہی سنا ڈالیئے۔ وہ مسکرائے اور کہنے لگے کہ اچھا کچھ نہ کچھ
ہو جائے گا۔ اِس "کچھ نہ کچھ کے ہونے نے" کم و بیش دو سال لے لئے۔
بارے کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے، اس دلچسپ سفرنامے کی پہلی قسط ناظرین
کے سامنے ہے، اگر خدا کو منظور ہوا تو آئندہ نمبروں میں اس سفر کی کچھ
اور منزلیں بھی پیش کی جائیں گی۔ مضمون زیرِ نظر نہایت دل آویز پیرائے میں
لکھا گیا ہے اور حمید احمد خاں کے بے ساختہ اور پر زور اندازِ نگارش کا
آئینہ دار ہے۔

افسانے اور ڈرامے

اس نمبر میں ڈرامے فقط دو ہیں لیکن دونوں اپنی اپنی جگہ نہایت
پُر لطف اور دل پذیر ہیں۔ پہلا ڈرامہ
"**شوہر کی بھوک ہڑتال**" نسبتاً مختصر ہے اور ایک ایکٹ
میں ختم ہو جاتا ہے۔ مناظر بدلنے نہیں پڑتے۔ ایک ہی ڈرائنگ
روم میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ ڈرامہ وقت کے ایک ہنگامہ خیز مسئلے
"حقوقِ نسواں" اور زمانۂ حال کے ایک کارگر کاروباری حربے "اشتہار" پر ایک
لطیف اور چلتی ہوئی طنز ہے۔ مکالمہ نہایت چست ہے اور کردار نگاری
بے عیب۔ اخباری رپورٹروں کے کیرکٹر کا مطالعہ بہت گہرا ہے۔ جنابِ ناکارہ
حیدرآبادی پہلی بار ہماری بزم میں شریک ہوئے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ
آئندہ بھی ادبی دنیا کے لئے وہ ایسی ہی کامیاب چیزیں لکھتے رہیں گے۔

دوسرا ڈرامہ "**تیسری بہن**" فاروق علی خاں صاحب نے لکھا ہے۔
جب پچھلی دفعہ اس نوجوان ادیب نے ادبی دنیا کے سالنامے کے لئے
"بدلا ہوا زمانہ" لکھا تو اگرچہ ہم اتنا ضرور محسوس کرتے تھے کہ یہ ڈرامہ اپنی
بہت سی خوبیوں خصوصاً نسوانی کرداروں کی کامیاب صورت گری
کے باعث اہلِ ذوق میں خاص دلچسپی پیدا کر دے گا۔ لیکن ہم اس کے
لئے تیار نہیں تھے کہ اسے کالجوں اور سکولوں خصوصاً زنانہ مدارس میں
بڑے شوق سے ایکٹ بھی کیا جائے گا۔ مگر ہوا یوں ہی، اور ہماری
معلومات کے مطابق یہ ڈرامہ کئی تعلیمی اداروں میں کھیلا جا چکا ہے۔
فاروق صاحب کا موجودہ ڈرامہ "تیسری بہن" دلچسپی کے لحاظ سے اُن کے
گذشتہ ڈرامے سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ شاید کچھ بڑھا ہوا ہی ہو۔ لیکن
اس کا موضوع بالکل مختلف ہے اور مدارس میں کھیلنے کے لئے موزوں
نہیں۔ ہاں کلب، خصوصاً مکسڈ کلب اسے کامیابی سے کھیل سکتے
ہیں — مگر انہیں سین بدلنے کا خاص اہتمام کرنا پڑے گا۔ کیونکہ اس
میں مناظر بہت جلد جلد بدلے جاتے ہیں (کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ڈرامہ اجازت
کے بغیر دکھایا جا سکتا ہے۔ مصنف اور پبلشر کی اجازت ضروری ہے) فاروق صاحب
نے اپنی کردار نگاری کے جوہر اس ڈرامے میں بھی دکھائے ہیں، لیلا کا
کردار بڑا شاندار ہے اور اس کی "عشوہ گری" اور "محبت سازی" دیکھنے
کے قابل۔ بوٹ پالش والے لڑکے کا پچ بہت خوب رہا اور اسی
طرح سیٹھی صاحب کے نوکر کا۔ بحیثیت مجموعی "تیسری بہن" ایک نہایت
کامیاب کوشش ہے اور ہمیں امید کرنی چاہئے کہ آئندہ سال
فاروق علی خاں ہمیں اس سے بھی اچھی چیزیں دیں گے۔ لیکن ذرا
وقت پر۔

افسانے اس دفعہ اگرچہ تعداد کے لحاظ سے کم ہیں لیکن ضخامت اور خوبی کے اعتبار سے گذشتہ سال کے افسانوں سے بڑھ گئے ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کے آپ کو افسانوں میں ایک بالکل نئی چیز ملے گی اور وہ ہے ایک طویل مختصر افسانہ، "زندگی کے موڑ پر" جسے ہمارے محترم دوست اور پنجاب کے مایۂ ناز افسانہ نگار کرشن چندر ایم اے نے لکھا ہے۔ طویل مختصر افسانہ اگرچہ مغربی ادبیات میں رواج پا چکا ہے۔ لیکن اردو میں تقریباً ایک بالکل نئی چیز ہے۔ تقریباً، اس لئے کہ اس کی ایک اور شاید اکیلی روشن مثال رائے بہادر ماسٹر پیارے لال مرحوم کا افسانہ "من سکھی اور سندر سنگھ" کا قصہ ہے جو مغربی طرز کی ٹکنیک سے عاری ہونے کے باوجود اردو کے کامیاب ترین مختصر افسانوں میں شمار ہونے کا حق رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بعض لمبی مختصر کہانیاں لکھی گئی ہیں لیکن ان کے مصنفین کو فن کاری کے اس پہلو کا احساس نہ تھا۔ محض پلاٹ کے بڑھ جانے ہی سے ان کے مختصر افسانے طویل مختصر افسانے بن گئے۔ کرشن چندر کا افسانہ ان تمام خصوصیات کو لئے ہوتے ہے جو موجودہ مغربی ادب میں اس سے وابستہ ہیں۔ "زندگی کے موڑ پر" انسانی روح کی پکار کا ایک حیرت انگیز ریکارڈ ہے جس میں آرٹسٹ نے سوز و غم کے نغمے قہقہوں اور مسکراہٹوں میں چھپا چھپا کر بھرے ہیں اور اگرچہ اس افسانے کی فضا کو اس نے رومانیت کے سائے سے بچا بچا کر روح کی تشنگی، حیرانی اور سراسیمگی کو آخر دم تک برقرار رکھا ہے لیکن ازبسکہ افسانہ نگار خود فطرت سے شدید طور پر ہم آہنگ ہے اس لئے اس کا ہیرو جب زخمِ دل کے مرہم کی تلاش میں دیوانہ وار بھاگتا ہے تو اسے کچھ سکون قدرت کی حسین آغوش ہی میں ملتا ہے۔ مگر سکون کہاں! وہ سوال جو تہذیب کا ستایا ہوا انسان صدیوں سے دہرا رہا ہے، ابھی تشنۂ جواب ہے۔

اس افسانے میں مصنف نے جہاں بہت کچھ بلند آواز میں کہا ہے وہاں اُس نے کچھ سرگوشیاں بھی کی ہیں اور شاید یہ سرگوشیاں اس کی دوسری باتوں سے زیادہ نتیجہ خیز ہیں۔ شادی کے بعد آخر شب کا وہ منظر جہاں افسانہ نگار آپ کو سونے والوں کی زنگار رنگ کیفیتیں دکھاتا ہے، اپنے معانی کے اظہار کے لئے الفاظ کا شرمندہ نہیں ہے۔ لیکن زبانِ خاموشی سے آپ کو وہ سب کچھ بتا رہا ہے جو جاننے کے قابل ہے۔ زیرِ نظر افسانہ کرشن چندر کے بہترین افسانوں میں سے ہے اور ہمیں ان کی تازہ مصروفیتوں کے پیشِ نظر یہ اندیشہ ہے کہ وہ اس پائے کا افسانہ اب بہت جلد نہیں لکھ سکیں گے۔

شادی کے سادہ عنوان کے ماتحت محترمہ عصمت چغتائی نے ایک "پرکار" کہانی لکھی ہے۔ جہاں تک ہمیں مطالعہ کا موقعہ ملا ہے ہم نے دیکھا ہے کہ اظہار کی نزاکت میں اردو کا کوئی افسانہ نگار عصمت کا حریف نہیں۔ اور بعض دفعہ تو یہ خوبی نقص کے درجے تک پہنچ جاتی ہے، جب ہم سے اچھے اچھے لکھے پڑھے مرد اور خاصی پڑھی لکھی عورتیں کہتی ہیں کہ بھئی افسانہ تو بے حد دلچسپ ہے مگر وہ ...... وہ.. ... وہاں ...... وہ کیا معاملہ تھا، کچھ ٹھیک سمجھ میں نہیں آیا.... اور جب ہم انہیں وہ نازک سی بات بتاتے ہیں جسے وہ سرسری نگاہ سے دیکھتے ہوئے گذر گئے اور جس پر سارا افسانہ گھوم گیا، تو ان کے منہ کھلے رہ جاتے ہیں، اور اُن کی آنکھوں میں ایک نئے احساس کی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

"شادی" بھی اسی رنگ کی ایک خاص چیز ہے۔ ذرا دھیان سے پڑھئے گا اور اگر آپ نے ہمارے مشورے پر عمل کیا تو یقین رکھئے کہ آپ کی توجہ نہایت دلچسپ نتائج پیدا کرے گی۔

عصمت چغتائی کی ایک حیرت انگیز خصوصیت یہ ہے کہ وہ آرٹسٹ پہلے ہیں اور ہمارے ہندوستان کی ایک "بے چاری عورت" بعد میں۔ دیگر فنون کی طرح، ادب میں بھی بے باکی اور حقیقت پرستی ایک ایسا عنصر ہے جو نہ صرف فن کار کو بلکہ اُن کو بھی جو اظہارِ فن سے متاثر ہوتے ہیں، کیف و سرور کی انتہائی بلندیوں پر لے جاتا ہے، اس کیف و سرور کے اوج پر جو آرٹ میں حقیقت کی بے خوف اور بے باک آمیزش سے پیدا ہوتا ہے مثلاً افسانۂ زیرِ نظر میں وہ مقام جہاں "میں" کو "اُن" کی قربت، کپڑوں کی مخصوص خوشبو، اور سگرٹ کی بھینی بھینی مہک، سے نیند سی آنے لگتی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر وہ موقعہ جب "وُہ" "میں" کے گھر آئے اور "میں" کی آنکھوں نے سوٹ کیس کھلنے کے بعد اس میں ایک خوبصورت مردانہ نائٹ سوٹ اور دو ایک اُلٹی سیدھی چیزیں دیکھ کر جھٹ جانا مناسب سمجھا۔ اُف کیسی شاندار حقیقت نگاری، کس قدر بے خوف صداقت پرستی!

تو یہ ہے عصمت چغتائی کا آرٹ ...... "ترقی پسند ادب! تو کہاں ہے؟" فیض صاحب جواب دیں۔

کونپل۔ ایک نہایت لطیف سوشل افسانہ ہے جسے ہمارے

صوبے کے سب سے سرگرم افسانہ نگار اُپندر ناتھ صاحب اشکؔ نے اپنے خاص رنگ سے ذرا ہٹ کر لکھا ہے اور خوب لکھا ہے اُن کا معمول یہ ہے کہ یا تو وہ ایک خالص فنی چیز لکھتے ہیں جو عموماً غم انجام ہوتی ہے، اور یا منشی پریم چند مرحوم کی طرح کسی سماجی برائی کو مرکز بنا کر اس کے گرد اپنی کہانی کا جال بنتے ہیں اور پڑھنے والے کے دل و دماغ پر اُس برائی کا ایسا گہرا اثر ڈالتے ہیں جو مدتوں محو نہیں ہوتا۔ موجودہ افسانے کے پس منظر میں اگرچہ مفلس نوجوانی اور دولت مند بڑھاپے کا بے جوڑ ملاپ اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ موجود ہے، لیکن یہ افسانہ نگار کی توجہ کا مرکز نہیں مرکز تک پہنچنے کا محض ایک ذریعہ ہے۔ اس کی نظر کے افق پر وہ نازک نازک اور ہری ہری کونپلیں ہیں جو سماجی ناانصافیوں کا طوفان گذر جانے پر اُس زمین میں پھوٹتی ہیں جسے دل کہتے ہیں۔ اب معلوم نہیں کہ سنیکری کے دل کی کونپل جو ایک بار پنڈت جی کی زندگی میں، اور دوسری دفعہ ان کے مرنے کے بعد پہلی رات کے پچھلے پہر میں پھوٹی اس کے عزم کی روح پرور نسیم میں پھولتی پھلتی رہی یا اس صرصر کی نذر ہو گئی جو سماجی دباؤ کے تپتے ہوئے صحرا سے چلتی ہے۔ اور ہزاروں نوشگفتہ کونپلوں اور جھومتی ہوئی کلیوں کو جلاتی ہوئی گذر جاتی ہے۔

یہ بھی — وہ بھی کے خیال انگیز عنوان سے ہمارے دوست مسٹر دھرم پرکاش آنند نے جو نفسیاتی افسانہ پیش کیا ہے، وہ موضوع کے اچھوتے پن اور مطالعے کی گہرائی کے لحاظ سے ایک نہایت قابلِ قدر چیز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنند صاحب خود اُس مدوجزر میں سے گذر چکے ہیں جو ہمارے ہونہار نوجوانوں کے سیلِ حیات میں اس وقت بپا ہوتا ہے جب وہ زندگی کی دہلیز میں کھڑے اپنی تمام قوتیں ایک مقصد پر مرکوز کر چکے ہوتے ہیں اور پانسے کا ایک رُخ آن بھر میں اُن کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ صاحبِ افسانہ نے نہایت دل آویز انداز میں اُس فریبِ آرزو کو چاک چاک کر دیا ہے جس میں ہمارے متوسط طبقے کے نوجوان، ان کے ماں باپ، ان کے بھائی بہن، اُن کی ہونے والی دلہنیں یا دلہن نہ بننے والی منگیتریں مبتلا ہیں۔ اور اس جسمانی اور روحانی کش مکش کا بہت اچھا نقشہ کھینچا ہے جس میں سوسائٹی کا درمیانی طبقہ بری طرح گرفتار ہے۔

نفرت۔ ممتاز مفتی صاحب کے قلم سے ایک دل آویز معاشرتی سکیچ ہے، جس میں انہوں نے نہایت خوبصورتی سے عورت کی فطرت کا ایک ایسا پہلو بے نقاب کیا ہے۔ جس کی بظاہر کوئی توجیہہ نہیں کی جا سکتی ہمارے بڑے بڑے مفکروں نے نسوانی فطرت کے اسرار سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ بہت سے بلند پایہ ناول نگاروں نے حوّا کی بیٹی کو اس کے اصلی رنگ میں دیکھنے اور دکھانے میں اپنی زندگیاں تمام کر دیں۔ لیکن یہ دلکش بھید کسی طرح کھلنے میں نہیں آتا۔ افسانۂ زیرِ نظر میں نازلی عورت کی انفعالیت کی پوری پوری نمائندگی کرتی ہے، وہ ثابت کرتی ہے کہ عورت اپنی فطرت میں ایک ایسا جوہر لے کر پیدا ہوئی ہے جس کی جلا کے لئے ریشم کی نہیں بلکہ پتھر کی ضرورت ہے، وہ صرف ایسے میلانات سے متاثر ہوتی ہے جو اس پر چھا جائیں اُسے سمیٹ لیں۔ اُسے اپنے آپ میں جذب کر لیں۔ یہی لئے جب نازلی کو کالج کے دو نوجوان گھورتے ہیں تو وہ کچھ پروا نہیں کرتی۔ ان کا گھورنا اُسے ان کی اپنی بے چارگی اور بے بسی کا اظہار معلوم ہوتا ہے لیکن جب حمید، وہ اکھڑ لیکن مستقل مزاج خالص مردِ پردے کی نسبت اپنے گہرے اعتقاد کے باعث اُس کے سامنے نہیں آنا چاہتا تو وہ خود برقعہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ زرد رنگ کا ریشمی دوپٹہ اُسے بہت پسند ہے اس کا نرم مزاج شوہر اس کی ہر پسند کی تائید کرنے کا عادی ہے۔ اس لئے اُس کی رائے میں اب کوئی خاص زور نہیں رہا۔ مگر حمید کو زرد رنگ سے نفرت ہے۔ نازلی کو حمید کی بھدی انگلیوں جنگلی صورت، اور کرخت آواز سے سخت نفرت ہے لیکن حمید کی نفرت کے احترام میں وہ زرد دوپٹے کو چولھے میں جھونک دیتی ہے! اے نسوانی فطرت! تو کب بے نقاب ہو گی؟

چھوکری کی لُوٹ۔ راجندر سنگھ بیدی ہمارے افسانہ نگاروں میں شاید سب سے کم عمر ہیں، اور اُن کی افسانہ نگاری کی عمر بھی چنداں زیادہ نہیں، لیکن اُن کے آرٹ میں رفتہ رفتہ وہ بات آتی جاتی ہے جو غور و فکر سے پیدا ہونے والی پختگی کی علامت ہے۔ "چھوکری کی لوٹ" دیہاتی زندگی کے ایک سیدھے سادھے پہلو کی ایک نہایت رنگین اور پیاری تصویر ہے۔ ننھے پرسادی کے جذبات کی کشمکش، تایا ٹھنڈی رام کے صحن کی رونق، بڑی لڑکیوں کی آسیں اور پیاسیں، چھوٹی لڑکیوں کی پہیلیاں اور کہانیاں، اور پھر رتنی کی لُوٹ، وہ لوٹ جو ازل سے مچ رہی ہے اور ابد تک مچی رہے گی۔ اور جس کے باعث جو ہزاروں ملو کھنیا سر پر خاک ڈالتے رہیں گے، اور لاکھوں کالے پیلے ننھے عالمِ وجود میں آتے رہیں گے، یہ دلکش اور دلدوز مناظر اس پاکیزہ افسانے کی جان ہیں۔

ہمارا ہمیشہ سے یہ خیال رہا ہے کہ راجندر سنگھ بیدی دیہات کی فضا کو نہایت خوش اسلوبی سے اپنے افسانوں میں منتقل کرتے ہیں، اور اب بھی ہم انہیں یہی مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی اس خاص روش کو ہاتھ سے نہ دیں۔ وہ اس پر چل کر اپنے فن کی بہت سی کامرانیوں سے ہم آغوش ہو سکتے ہیں۔

بستر پر۔ از محمد صادق صاحب قریشی، ایم اے۔ ایک نئی طرز کا نہایت دلکش مکالمہ ہے جس میں ظاہری باتیں عام انداز میں اور دل کی باتیں زیرِ لب کہی گئی ہیں۔ قریشی صاحب نے ماں بیٹوں کی ایک خاص گفتگو اور اس کے زیرِ سطح اثرات کو جس خوبی سے پیش کیا ہے، وہ کچھ انہی کا حصہ ہے اور ہمیں امید ہے کہ اسے بے حد پسند کیا جائے گا قصہ وہی ہے، شباب کی وارفتگیاں، اور پیری کی جفا کاریاں۔ مگر انداز کی سادگی اور فن کاری نے اس میں ایک خاص لطف پیدا کر دیا ہے۔

طبعزاد افسانوں کا بیان ختم ہوا۔ اس دفعہ صرف دو ترجمہ شدہ افسانے شریکِ اشاعت ہیں۔ مگر دونوں مغربی ادب کے دو بہترین افسانوں سے ماخوذ ہیں۔ پہلا

تماکو، جو شاہد احمد صاحب دہلوی مدیر ساقی کے اعجازِ تحریر کا مرہون ہے۔ شاہد صاحب مدیر ادبی دنیا کے خاص کرم فرماؤں میں سے ہیں، انہوں نے اپنی کم فرصتی کے باوجود ہماری درخواست پر ادبی دنیا کی سالانہ محفل میں شرکت فرمائی اور ایک خاصے طویل افسانے کا نہایت نفیس ترجمہ ہمیں عنایت فرمایا۔ افسانۂ زیرِ نظر جنگل کی زندگی کا ایک دل آویز مرقع ہے۔ ہاتھیوں کے غول کا سردار اپنی ذہانت سے وہ کام لیتا ہے جو ایسے حالات میں انسانوں کا ایک اولوالعزم سردار لے سکتا ہے، اور اس پر جذبات کا اسی قدر غلبہ ہے جس قدر ایک حسّاس اور صاحبِ دل انسان پر ہو سکتا ہے۔ جرمن جہاز گراف سپی کے کپتان اور "تماکو" نے آنے والی شکست کا ایک ہی انداز میں استقبال کیا، اور پھر شکاری اور شکار کی زندگی اور موت میں ہم آہنگی اور ہم سفری ایک ایسا منظر ہے جس کے دیکھنے کی تاب بہت کم دل لا سکتے ہیں۔ افسانہ نویسی کے جدید ترین مغربی رجحان نے ہمیں جانوروں میں بھی، صحیح طور پر، انسانی کرداروں کی طرح دلچسپی لینا سکھایا ہے۔ اُردو میں یہ روش ابھی مقبول نہیں ہوئی، لیکن "تماکو" کے پائے کے چند اور افسانے اردو میں ڈھل گئے تو وہ دن دور نہیں جب ہمارے افسانہ نگار بھی اس طرف متوجہ ہو جائیں گے۔

دیہاتی لڑکی۔ موپساں کا ایک شاہکار ہے جسے حسبِ معمول جناب طاؔہر قریشی نے اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اب تک طاؔہر صاحب نے موپساں کی جتنی کہانیاں ترجمہ کی تھیں، وہ ڈر ڈر کر کی تھیں، یعنی صرف وہ افسانے لئے تھے جنہیں عرفِ عام میں بالکل بے ضرر کہا جا سکتا ہے۔ اس دفعہ انہوں نے کچھ جراَت دکھائی ہے اور ایک ایسا افسانہ منتخب کیا ہے۔ جو اپنی پُرزور بے باکی کی وجہ سے ایک خاص امتیاز رکھتا ہے۔ افسانے کی دلکشی کو طاؔہر صاحب کے فن کارانہ ترجمے نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ افسانے کی فضا میں موپساں کا مخصوص رنگ خوب نمایاں ہے اور حسینۂ فطرت کا یہ پجاری اپنی اس تخلیق میں بھی مناظرِ قدرت کے ٹپٹلنے سے خوب کام لیتا ہے۔

سالنامہ اب آپ کے سامنے ہے۔ ہماری محنت ٹھکانے لگی اور آپ کی دلچسپی شروع ہوئی۔ خدا کرے یہ آپ کی توقعات سے بڑھ کر ثابت ہو۔ ہم ہرگز یہ کہنا نہیں چاہتے کہ ہم اپنی خواہش کے مطابق کامیاب نہیں ہوئے، جو کچھ بُرا بھلا ہے آپ اسے قبول کیجئے۔ غلط، بالکل غلط، سالنامے کی تدوین و تالیف میں ہم نے اپنی پوری کوشش صرف کی ہے، اور ہمیں اُمید کیا، یقین ہے کہ یہ رائگاں نہیں جائے گی۔

صلاحُ الدّین احمد

(۲)

اظہار اور ترجمانی کے لحاظ سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری سے دو قسم کے انسانوں کو تعلق ہے۔ ایک شعر کہنے والوں کو اور دوسرے شعر سے لطف اندوز ہونے والوں کو۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شعر سے حظ اٹھایا جاسکتا ہے، اُس کا مطالعہ ممکن نہیں۔ اس کی تائید نہیں کی جاسکتی کیونکہ یہ ایک محدود خیال ہے اور شعر سے صحیح طور پر حظ اٹھانے کے لئے اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ لیکن آج جب کہ مغرب میں ایک ایسی جنگ جاری ہے جس کے اثرات مشرق میں بھی تباہی اور بربادی کو انسانیت سے قریب تر لا رہے ہیں، شعراء کے نغموں کے حسن و خوبی کو اُجاگر کرنے کی کوشش پر کہیں آپ اس تاریخی واقعے کو یاد نہ کرنے لگیں، جب روما کا شہر نذرِ آتش ہو رہا تھا اور وہاں کا حکمراں، نیرو، سازِ زندگی کا کمال دکھانے میں محو تھا۔ اور آپ کو یہ واقعہ یاد بھی آجائے تو میں انگریزی انشاپرداز آلڈس ہکسلے کی پیروی میں کہوں گا کہ اگر لوگ نغموں میں صحیح اور مناسب طور پر دلچسپی لینا شروع کر دیں، اگر لوگ کبھی کبھار زندگی کی خشک روی سے ہٹ کر "دنیا کے غیر مسلّم قانون سازوں" کے کہے کی طرف بھی توجہ کر لیا کریں تو مغرب کی موجودہ جنگ کی نوبت نہ آسکے، روما کا شہر صحیح و سالم رہے!

اُردو شاعری نے گذشتہ پندرہ سالوں میں ہیئت اور موضوع کے لحاظ سے اُمید افزا ترقی کی ہے، لیکن اُردو شعراء ابھی تک عموماً چند معین مرکزوں پر ہی ساکت و جامد ہیں۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ اس کی وجہ ہمارے شاعروں کی شہرت پرستی ہے، تاہم جھجک اُٹھنے پر اُن کے دلوں میں عروسِ شعر کے حسن کی تکمیل کے لئے وہ پہلی جستجو، وہ پہلی سرگرمی اور وہ پہلا اخلاص باقی نہیں رہتا — میں یہ کہوں گا کہ اُن میں سے جو افراد مغرب سے اچھی باتوں کو اپنے کام میں لانے کے لائق ہیں اُن کی نشوونما سراسر مغربی اثرات کے ماتحت ہوئی ہے اور وہ ناتجربہ کار ہیں۔ اپنے جوشِ تجدید میں وہ حد سے آگے نکل جاتے ہیں، اور روحِ مشرق اور اپنی انفرادیت سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اور جو شاعر تجربہ کار اور پختہ مشق ہیں، انہیں اضافی ادب و شعر کا مطالعہ میسر نہیں۔ اس کمی کے باوجود میرے خیال میں اس وقت اُردو زبان ایسے شاعر اور ایسی نظمیں پیش کر رہی ہے جنہیں دنیا کے ترقی یافتہ ادب میں شمار کیا جاسکتا ہے (اس پہلو سے بھی اُردو زبان کو ہندوستان کی دوسری زبانوں پر برتری حاصل ہے۔)

کافی عرصے سے ہر علم و فن میں ہماری رہنمائی مغرب ہی کر رہا ہے لیکن اس استفادے کی حدبندی بھی ضروری ہے۔ ہمیں وہاں سے بہت جانچ پڑتال کے بعد صرف اچھی اور مفید باتوں کو ہی لینا ہے اور اس کے ساتھ ہی اپنی مشرقی انفرادیت کو بھی برقرار رکھنا ہے۔

جن شعراء کا کلام سالنامے کی زینت ہے، اُن کے عیوب و محاسن کو جتانے کا نہ یہ موقعہ ہے اور نہ مجھ میں اتنی ہمت، اس لئے بعض اہم چیزوں پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتا ہوں، تاکہ میرے یہ الفاظ "ادبی دنیا" کے انتخابِ شعر کی کسی حد تک وضاحت کر سکیں۔ لیکن سب سے پہلے نظم نگار شعراء میں حضرات اثر صہبائی، عظیم قریشی وشوامتر عادل، تلوک چند محروم، تاجور سامری، احمد ندیم قاسمی، ن۔ م راشد، مرزا عباس بیگ محشر، اختر انصاری، نذیر مرغوب، سعید احمد اعجاز، گوپال متل، ابوالاثر حفیظ جالندھری، باقی صدیقی، عبدالحمید عدم ضمیر جعفری، فیض احمد، مسعود شاہد، تابش صدیقی، سید علی منظور، احسان دانش، ساقی اور اصغر حسین خاں نظیر — اور غزلگو شعراء میں حضرات ماہر القادری، امین حزیں، عابد لاہوری، فراق گورکھپوری عبدالمجید حیرت، ظفر تاباں، روش صدیقی، اسد ملتانی، کشفی ملتانی، مراتب علی تائب، ہری چند اختر، فانی بدایونی، اور ساغر نظامی کی عنایات کا اعتراف ضروری ہے

اگرچہ اُردو میں آزاد نظم کی ابتداء شرر مرحوم نے ۱۹۰۲ء میں کی، اور اس کے بعد ۱۹۲۵ء تک اس سلسلے میں خاموشی ہی طاری رہی لیکن راشد کی ہمت اور ذہانت نے آزاد نظم کی ترقی کے لئے پہلا نمایاں کام کیا۔ راشد کی بحریں اپنے فارسی رجحانات کی وجہ سے مخصوص اور محدود ہوتی ہیں۔ لیکن الفاظ کا انتخاب اور باقاعدہ آغاز کے بعد نظم کا انجام اس قدر مکمل ہوتا ہے کہ بحروں کے تنوع کی کمی بالکل دب کر رہ جاتی ہے

وہ بے کراں رات کے سناٹے ہیں"۔ اس نظم کے الفاظ اُردو زبان کے ہیں لیکن خیال، تشبیہات، استعارے اور ان سب سے عمدہ برائی سراسر مغربی بلکہ فرانسیسی رنگ لئے ہوئے ہے۔ نظم کا افسانہ اُس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ ہم آخری مصرعے پر نہ پہنچ لیں۔ "آغازِ زمستان کا پرندہ"، "سینے کے کہستان" — "ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ" — اِن ٹکڑوں سے مغربیت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اِس نظم کا تخئیلی انداز اور اس کی بعض دوسری خوبیاں اِس قدر بلند ہیں کہ میں اسے فرانسیسی شعراء میلارمے اور باڈلیئر کے کلام کے مقابلے میں پورے اعتماد کے ساتھ زبانِ اُردو کی طرف سے پیش کر سکتا ہوں۔ اس کے دو مقام تو سراسر الہامی ہیں۔ ایک وہ جگہ جب "لذّت کی گرانباری سے ذہن کسی ویرانے کی دلدل بن جاتا ہے اور اُس کے قریب کہیں نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح اپنے پر تولتی ہے چیختی ہے"، اور دوسری وہ جگہ جہاں شاعر کی "آرزوئیں (اپنی عہدِ شبابانہ کے) سینے کے کہستانوں میں ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں"۔ یہ دونوں ٹکڑے دو ایسی تانیں ہیں جنہوں نے نظم کو ایک لافانی نغمے کی صورت دے دی ہے۔ راشد کی شاعری کچھ عرصہ ہنگامی معاملات کے بارے دبی رہی ہے لیکن اب "ادبی دنیا" کے ذریعے سے اس کا کامیاب احیاء ہُوا چاہتا ہے۔

راشد کے بعد بہت سے شعراء نے آزاد نظم کی طرف رجوع کیا۔ اور اِس کی قبولیت کا ایک ثبوت یہ بھی ہو سکتا ہے کہ سعید احمد اعجاز ایسا رباعی گو بھی کچھ عرصے سے گاہے گاہے اِس دیار نو کی سیر کر رہا ہے۔ "ملاقات" ایک ہلکی پھلکی جذباتی چیز ہے لیکن اِس میں جو ہنگامہ خیز تصورات شاعر نے یکجا کر دیئے ہیں اُن سے اِس جذباتی نغمے کی گونج بہت گہری ہو گئی ہے۔

یادش بخیر! عظیم قریشی کی دونوں نظمیں اِس بات کی دلیل ہیں کہ نظم معرّا لکھنے لکھانے والوں کو نثر کی شاعری سے نجات دے سکتی ہے۔ لیکن وہ "تحریک گناہ" میں جو تیکھا اور لاابالی انداز کا طنز ہے۔ وہ "رادھا کے گیتوں" کے گداز کو دیکھتے ہوئے غیر متوقع حیثیت رکھتا ہے۔ "میری محبوبہ" ایک اُبلتا ہوا پر جوش گیت ہے۔ "وہ اِک نُور ہے! وہ اِک نُور ہے!" — اور "لٹانے دے مجھے اپنی جوانی کی بہار" — دونوں جگہ ایک ہی بے نیازی سے لبریز لہجہ ہے۔

"ادبی دنیا" کے ساقی نے اگرچہ اپنی نظم "لکھنؤ کے سبزہ زار" میں ایک گئی گذری سی بہار کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس میں وہاں کی موجودہ دلکشی کا بھی اُتنا ہی مکمل اظہار ہے۔ اس نظم میں اس کے قوافی کی کثرت اِس کی آزادانہ نوعیّت کو بہت حد تک چھپائے ہوئے ہے۔

میراجی کی نظم "کیفِ حیات" کا موضوع جنسی ہے۔ اور اُس کی بحر میں جن "حرکات" کو ساکن کیا گیا ہے اُن کے متعلق ابھی خاموشی ہی مناسب ہے۔

نئے موضوعات اور تجدید کے لئے پرانی شعری صورتوں کو ترک کرنا لازمی نہیں۔ ہمارے بہت سے شاعر اگرچہ ہیئت کے لحاظ سے ردیف و قوافی کے پابند ہیں لیکن "روحانی" لحاظ سے اُن کا لب و لہجہ اُتنا ہی نیا ہے جتنا آزاد نظم والوں کا۔ سیّد علی منظور، عبدالحمید عدم۔ احمد ندیم قاسمی، فیض احمد فیض، احسان دانش اور اصغر حسین خاں نظیر کا کلام ملاحظہ کیجئے۔

ایک شاعر کے لئے چڑیا گھر سا مقام بھی تحریکِ شعری کے لحاظ سے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ "پنجرے کے شیر" میں شاعر نے خوب خوب پٹے کھائے ہیں۔ "وہ بنایا تھا خدا نے جنگلوں کا حکمراں اس کو" — تماشا ہے یہ لوہے کے قفس میں آج بیٹھا ہے" — "اب اس خونخوار چوپائے سے بچے بھی نہیں ڈرتے" — "مگر اب بھی کبھی کنجِ قفس میں جب بپھرتا ہے" اور آخر میں گریز — "نہیں یہ بات حیرت کی، نہیں یہ ماجرا غم کا، یہ گردوں دشمنِ جاں ہے جواں مردانِ عالم کا"۔ بیان کا یہ پیچ و تاب "پنجرے کے شیر" کے دل کے پیچ و تاب سے ایک چھپی ہوئی مماثلت رکھتا ہے!

"سفرپارے" میں بحر کا انتخاب بہت خوب ہے۔ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن — گویا ریل گاڑی دوڑی چلی جا رہی ہے۔ اور پھر حقیقت پرستانہ مشاہدہ جو احسان کی خصوصیت ہے — "بچھ رہے تھے چپ سادھے سلیپر راہ میں"، "پٹڑیوں کا ارغنوں تھا، گھومتے پہیوں کی گت"، "کوئلے کے ننھے ننھے ذرّہ ہائے نیم جاں"، "ٹہوکتا جاتا تھا انجن پھیلتی جاتی تھی بو"۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد مجھے یوں محسوس ہُوا گویا میں ریل کی پٹڑی سے ذرا دُور کھڑا ہوں اور ایک گاڑی چند لمحوں میں سامنے سے گذر گئی!

"دل لگی" میں عبدالحمید عدم نے جس کیفیت کو قلمبند کیا ہے، ممکن ہے بعض لوگوں کے لئے اِس کی شعریت کو ذہنی گرفت میں لانا ذرا مشکل ہو۔ اس نظم سے مجھے بے اختیار ہائینے کی طنزیہ نظمیں یاد آگئیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہائینے حقیقت کو تخیّل سے جا ملاتا تھا اور ہمارے شاعر نے تخیّل کو حقیقت کا جامہ پہنا دیا ہے۔ اِس نظم سے لطف اندوز ہونے کے لئے پہلے شاعر کی ذہنی کیفیت کو اپنے آپ پر طاری کر لینا ضروری ہے۔

"سپاہی کی واپسی" میں بھی بحر کی خوبی موجود ہے۔ شاعر نے ایک رکن کے اضافے سے مصرعوں میں چلتے ہوئے سپاہی کی رفتار کو پیش کر دیا

ہے، گویا وہ اپنے جی میں "چپ راست" کہتا چلا جا رہا ہے۔ اور پھر آس پاس کے مناظر سے اثر گیری کے ساتھ ہی اس شعر میں سپاہیانہ ذہنیت کی سادگی اور جوش کا مؤثر اظہار ہے ؎

"میں واپس آ رہا ہوں آج —— پانسال رہ کے ہانگ کانگ میں"

"یہ جی میں ہے کہ طے کروں میں پانچ پانچ میل اک چھلانگ میں"

"تسلی" کا شاعر ایک مفکر ہے۔ اُس کی نظر میں اب وقت گذر چکا کہ عشاق اپنی محبوبہ سے بے معنی باتیں کرکے تضیعِ اوقات کریں۔ اب انہیں ہر جگہ اپنے اُس آہنیں ارادے کا اظہار کرنا چاہیئے جو اُن کے ذہنوں میں پُرانے نظام کے خلاف پختہ ہو چکا ہے۔ لیکن اُس کی تسلی میں ایک تھکن ہے۔ حقیقتاً وہ یہ تسلی اپنے ہی دل کو دے رہا ہے اور شاید اُس کے دل میں ایک اندیشہ بھی چھپا بیٹھا ہے کہ کہیں روشن مستقبل کا خیال محض طفلِ تسلی تو نہیں!

لیکن ایسے دلوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے کو، اُنہیں اپنی قوتوں پر بھروسہ رکھنے کی تلقین کرنے کو اور لوگ بھی موجود ہیں جو بتا رہے ہیں کہ "امتیازِ ہند و فرنگ" اب ایک بھولی بسری بات بنے کو ہے۔ اور ہم نے اپنے دلوں میں تو جان بھی لیا ہے کہ مشرق و مغرب کی تفاوت ایک سطحی بلکہ بے معنی اندازِ نظر ہے۔ سید علی منظور کی نظم ایک ایسا لہجہ لئے ہوئے ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اپنے ہم وطنوں کو للکار رہا ہے کہ آؤ زبردستی کا جوا گلے سے اُتار پھینکیں اور زبردستوں کے مدِ مقابل ہو کر، میدان میں خم ٹھونک کر کھڑے ہو جائیں۔ اِس نظم کے شاعر میں خود اعتمادی کی فراوانی ("اُبھر رہا ہوں، اُبھرنا مرا یقینی ہے") اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ اُس کی للکار کا پُر جوش جواب دیتے ہوئے اُس کے پیچھے پیچھے ہو لیا جائے۔

یہ وہ شاعر تھے جو وقت کے مطابق چل رہے ہیں، یا چلنے کی کوشش میں ہیں یہ لوگ ایک جہاد کے شعوری یا غیر شعوری ممبر ہیں، خواہ اُس جہاد کا مقصد ادبی یا فنی ہو یا سیاسی اور اقتصادی۔ لیکن شاعرانہ ذہانت ایک معجونِ مرکب ہے، ایک طرفہ تماشہ اگر اس کا رجحان خارجی ہو جائے تو کسی ہنگامے کے بغیر اس پر مختلف تحریکوں کا فسوں ہو جائے گا۔ اور اگر داخلی ہو جائے تو شورِ محشر بھی اسے اپنے مرکز سے نہیں ہٹا سکتا ہے۔

بسنت سہائے کے دل پر بیتے ہوئے دنوں کا ایک ایسا بارِ گراں حادی ہے کہ وہ "بوجھل دنوں" کے نغمے میں کھو گیا ہے۔ اُسے موجودہ تلخی کے دور میں بھی صرف ماضی ہی کے خوشگوار لمحوں کا احساس ہے۔ "میٹھی باتوں والے دن، پیاری راتوں والے دن، بیت گئے ہاں بیت گئے، ختم ہوئے، ہاں ختم ہوئے" —— وہ اپنی ساری نظم میں گریہ ہی کئے جاتا ہے۔

وشوامتر عادل کو "انتظار" ہے "ڈھلی ہوئی رات، اونگھتی چاندنی، ٹہنیوں پر اوس کی ہلکی نمی رینگ رہی ہے۔" اور وہ خاموش اپنی نظم کے منظرِ فطرت کا ایک جُزو بنا بیٹھا ہے۔ اس نظم میں چاندنی رات کے تأثر ہی سے انتظار کی کیفیت کے نقوش نمایاں کئے گئے ہیں۔ یہیں سے بات نکلتی ہے۔ کہ بعض دفعہ ایک نیچرل نظم کس طرح جنسی پہلو اختیار کر جاتی ہے۔

ضمیر جعفری کی پکار اِس پکار سے ملتی جلتی لیکن مختلف بھی ہے۔ یکساں یوں ہے کہ اس میں نیچرلِ حسن کی اپیل جنسی اپیل بن رہی ہے۔ اور مُختلف یوں کہ اس میں پہلی نظم کی نزاکت نہیں، اس میں ایک گہرائی ہے جو شاعر کے احساس کی شدت کا اظہار کرتی ہے۔ پہلی نظم ستار کی ہلکی پھلکی گت ہے اور یہ سارنگی کا گونجتا ہوا گمبھیر تانوں والا نغمہ۔ پہلی نظم میں شاعر اپنی آنکھوں کو "پاکیزہ چراغ" سمجھتا ہے، جن کی روشنی ایک ہی مرکزِ الفت کے لئے وقف ہے۔ دوسری نظم کا شاعر اپنے احساس کو اپنے محبوب پر نثار نہیں کر سکتا۔ وہ مشرقی ہے لیکن مشرق کے مجنونانہ وفا والے خیالات اُسے نہیں پسند آتے۔ وہ اپنے پہلے ایک اکیلے مرکز تک نہ پہنچنے کی صورت میں بکھر کر پھیل جانا چاہتا ہے۔ وہ زندگی کو زندہ رہنے کے لئے وقف کر دینا چاہتا ہے۔

"تحریک" کا شاعر (گوپال متل) بھی ایسے ہی خیالات کا حامی ہے۔ بلکہ وہ اِس سلسلے میں دو قدم آگے بڑھ گیا ہے۔ اُس کا خطاب ساقی سے ہے۔ وہ ساقی جو رندی و سرمستی اور ہر شے سے بے نیازی کا ایک استعارہ ہے، جو ایک بہت بڑے عرصے سے عشرت و فراموشی کی ترغیب دیتا چلا آیا ہے۔

"شرابی" میں باقی صدیقی نے داخلی اور خارجی اندازِ بیان کو باہم دست و گریباں کر دیا ہے۔ یہ مطالعۂ نفسی ہے لیکن شاعر کی ذات اس میں ایک فرد کی بجائے دو افراد بن گئی ہے، ایک وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، ایک وہ جس کے متعلق کچھ کہا جا رہا ہے۔

اور پھر محبت کا نغمہ خواں اختر انصاری ہے۔ "میں نے اک باغ لگایا ہے، ذرا دیکھو تو!" —— اختر انصاری کے قطعات نہیں، ایک پریم کتھا ہے، جس میں کسی سلگتی ہوئی جوانی کا افسانہ اپنی نزاکتِ احساس اور تخیل کو لئے ہوئے چشم براہ ہے کہ دلِ دردمند اس کے حسن و خوبی کی داد دے

اُردو نظم کے راج محل میں ایک ایسی اچھوتی نازنین اُس وقت سے پھولوں کی سیج پر بنی سنوری بیٹھی ہے جب ابھی اس محل کے بنانے والوں نے تعمیر ادب کا کام شروع ہی کیا تھا۔ یہ نازنین اُتر کے دیس سے چل کر یہاں آئی لیکن سفر کے آلام کا اس کے حُسن پر کچھ اثر نہ ہُوا۔ بڑے بوڑھوں سے سُنا ہے کہ حُسن مٹ جاتا ہے: یہ سندر سندر روشن، مایا ہے، سب مایا ہے،، اور ہم بھی یہی دیکھتے آئے ہیں کہ انسان کا حُسن فانی ہے، لیکن تعجب ہے کہ اس پری پیکر دوشیزہ کی دلکشی دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہی کرتی رہی۔ غزل کی حسینہ کے آس پاس قصیدے کا دیو منڈلاتا رہا، مرثیئے کا نوحہ گر اپنے واویلا سے مسرت کے نُور کو مٹانے کی کوشش کرتا رہا اور رباعی کی بجلی اس کے خرمنِ حسن پر چمکتی رہی لیکن دیو یہ چنچل پری شیشے میں نہ اُتر سکی، بین سے اس کی شوخی کم نہ ہوئی اور رباعی کے نشتر اس کو زخمی نہ کر سکے۔ آج بھی نظم کی نتِ نئی صورتوں کے باوجود اس کی آن بان، وقت کے اثرات لیتی ہوئی، اپنے متوالوں کا دل موہ رہی ہے اگرچہ آغاز میں یہ صنف صرف چند نقوش کا ایک مجموعہ تھی لیکن ماہر القادری کے الفاظ میں اُس وقت بھی یہ اندازہ ہو سکتا تھا کہ ——"ان ہی چند لکیروں سے افسانے بن جائیں گے"

سالنامے میں مندرجۂ ذیل غزلگو شعراء کا جھُرمٹ رنگ جما رہا ہے:۔
فراق گورکھپوری، ساغر نظامی، روشن صدیقی، ماہر القادری، قیوم نظر، مراتب علی تائب، عابد لاہوری، عبدالمجید حیرت، ظفر تاباں، مسعود شاہد، کشفی ملتانی، ہری چند اختر، اسد ملتانی، فانی بدایونی، اور ابنِ حزیں

فانی بدایونی کی غزل ایک لافانی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اُن پختہ غزلگو شعراء میں سے ایک ہے جن کے کلام پر غزل کے جدید ترین رجحانات کی بنیاد ہے۔ غزل جذبات کے لئے ایک ہیجان انگیز ذریعۂ شعر ہے لیکن فانی کی غزل کو دیکھتے ہوئے ہم اُسی کے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ "جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی"،

ابنِ حزیں کا اصل رنگ اُن قطعات میں نمایاں ہوتا ہے۔ جن میں تصوّف کے ساتھ عشرت کی ایک نفسی لذت بھی ملی ہوتی ہے۔ چنانچہ اُن کے گذشتہ ماہ کے قطعات میں سے دو اِس وقت بھی میرے ذہن میں گونج رہے ہیں —— "وہ خلد گوش تو ہیں، جنت نگاہ نہیں۔ قصور میرا ہے ان کا کوئی گناہ نہیں وہ لامکاں ہیں، زمان و مکاں مرا مسکن + سحر کے نور کے لائق شبِ سیاہ نہیں۔" اور —— "مری سمجھ میں یہ اب جا کے بات آئی ہے "حجاب" میری نگاہوں کی نارسائی ہے اُٹھے زمان و مکاں کی نہ جب تلک چلمن۔ میرے نصیبوں میں محبوب کی جدائی ہے"، لیکن اُن کی موجودہ غزل بھی ایک گہری کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہے، —— "نے کا نئے نام رکھ دیا کس نے؟ "نئے میں پیغام رکھ دیا کس نے؟"۔ اور —— "پی رہا ہوں کہ پڑ گیا پینا، سامنے جام رکھ دیا کس نے؟" —— ساری کی ساری غزل اپنی معنوی بلندی اور فکر انگیزی کے باوجود اس قدر موسیقی بداماں ہے کہ ایک گیت معلوم ہوتی ہے!

مراتب علی تائب کے نوجوان دل و دماغ میں ایک پیرانہ پختگی ہے "شامِ گلشن سے ہے تا صبحِ کہستان جاری، ایک خاموش فسانہ تری گویائی کا!" اور —— "چرخ بیتاب، زمیں ساکن و انجم لرزاں، کون دیکھے کا تماشا تری زیبائی کا؟" —— خوب! کیا کیفیت ہے!

ساغر نظامی اپنے شباب سے لبریز والہانہ نغمے الاپے جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی غزل پر تغزل کا عنوان ہے جو گیت اور غزل کی درمیانی کیفیت کا مظہر ہے۔ دیکھئے کیا تان ہے "صبر نہیں ہے زندگی، جبر نہیں ہے عاشقی دل پہ نہیں ہے اختیار، اُن پہ ہو اختیار کیوں؟" اور —— "بزمِ سحر کے دوش پر رات گئے وہ آئیں گے، صبح کا انتظار کر، اُن کا ہے انتظار کیوں؟"

فراق گورکھپوری کی غزل ہمیشہ ایک مستقل رنگ رکھتی ہے دیکھئے، کیا بات نکالی ہے "ہیں شعلۂ مہر میں جنبشیں، تو ہیں موجِ مے میں بھی لرزشیں، اِسے ہوش کہئے کہ بے خودی، کوئی تجھ کو بھول سکا بھی ہے؟"

عابد کی غزلوں میں آج بھی وہی پرانی شوخی ہے جو نت نئی ہے، وہی رنگ ہے، وہی نغمہ —— "آپ کا زرتار دامن کاروانِ رنگ ہے۔ لہریا آنچل غبارِ کہکشانِ رنگ ہے"۔ تشبیہہ ملاحظہ کی آپ نے! —— اور دوسری غزل پہلی سے کس قدر اُلجھی ہوئی ہے، "پھر ہوئے روح میں اصنامِ تمنا بیدار، پھر وہی قاعدۂ جلوۂ جاناں دیکھا"— اور اسی لئے شائد احساس بھی ایک دوسرے سے اُلجھ گئے ہیں "کیا تماشا ہے کہ نغموں پر ہے دھوکا نور کا، کیا تماشا ہے کہ نکہت پر گمانِ رنگ ہے!"،

ابنِ حزیں کی طرح روشن صدیقی کا بھی اصل میدان غزل نہیں بلکہ نظم ہے، وہ نظم جس کا بہاؤ اور جس کی روانی کا زور بعض دفعہ غزل سے بھی بازی لے جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی یہ غزل ایک طرح سے نظم ہے یعنی غزل مسلسل اور اسی لئے عنوان بھی "نسیمِ شوق"۔ مطلع سے مقطع تک ہلکی ہلکی ہوا بہتی جا رہی ہے اور ہمارے دل و دماغ کو اس کا احساس ہو رہا ہے۔ لکھا ہے۔ "بغیرِ عشق ہے روودادِ زندگی تاریک، یہ لفظ زینتِ عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔ اور روشن کے تمام کلام کا (اور اِس غزل کا بھی) یہی حال ہے کہ اس کا زینتِ عنوان ایک لفظ ہے۔ عشق!۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عروسِ شعر کے متعلق بھی روشن کا کہا ہی سچا معلوم ہوتا ہے کہ "بہارِ گلکدۂ ناز دلکشا ہے، مگر نسیمِ شوق خراماں نہیں تو کچھ بھی نہیں!

میش احمد

غزل

اس کشمکشِ ہستی میں کوئی راحت نہ ملی جو غم نہ ہوئی
تدبیر کا حاصل کیا کہئے تقدیر کی گردش کم نہ ہوئی

اللہ رے سکونِ قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دئیے
جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

غم راز ہے اُن کی تجلّی کا جو عالم بن کر عام ہوا
دل نام ہے اُن کی تجلّی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

یہ دل کی ویرانی ہی عجب ہے، وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

انسان کی ساری ہستی کا مقصود ہے فانیؔ ایک نظر
یعنی وہ نظر جو دل میں اُتر کر زخم بنی مرہم نہ ہوئی

فانیؔ بدایونی

نظیر اکبر آبادی

اردو تنقید ابھی تک اس دور سے پوری طرح نہیں گذری جس میں ہمارے ایک شاعر کا مغرب کے کسی بڑے شاعر یا ادیب سے موازنہ اس شاعر کی عظمت کی کافی دلیل اور نقاد کے لئے ستائش کا کافی سامان سمجھا جاتا ہے۔ اس قسم کے موازنوں سے پڑھنے والوں کی تو قوم ستانی کو خوراک ملتی ہے اور نقاد کو اپنا تبحر علمی منوانے کا موقع۔ لیکن اکثر یہ موازنے نہ صرف نامکمل بلکہ ناموزوں بھی ہوتے ہیں خواہ نقاد کی کم علمی کی وجہ سے یا دریا کو کوزے میں بند کرنے کی غلط کوشش کے باعث۔ غالب کا مقابلہ اس غالب پرستی کے دور میں کس عظیم شاعر یا فلسفی سے نہیں کیا گیا؟ ہلنے شوپن ہار، نٹشے، شکسپئیر اور بہت سے اور نام ڈاکٹر بجنوری مرحوم نے اپنے معبودِ سخن کی ہمسری سے نوازے ہیں۔ محاسنِ کلامِ غالب یقیناً اردو تنقید کی تاریخ میں ایک سنگِ میل ہے لیکن وہ صفحے جہاں ایسے موازنوں کی بھرمار ہے۔ ہماری رائے میں اس کے سب سے کم تسلی بخش حصّے ہیں۔ ان سے لامحالہ ایک تشنگی باقی رہ جاتی ہے اور ڈاکٹر بجنوری کے علم کی گہرائی اور ذوق کی صحت کے باوجود ان موازنوں سے غالب کے متعلق کچھ توضیح ہونے کی بجائے الجھن بڑھ جاتی ہے۔

نظیر کو ابھی بجنوری کی قابلیت کا وکیل نہیں ملا (ٹکسالی تنقید کے سرگروہ تو اسے ابھی تک شعرا کی محفل میں آنے کی اجازت بھی نہیں دیتے) لیکن موجودہ ردِ عمل کے دور میں اسے بھی ورڈزورتھ، سکاٹ اور شیکسپئیر سے ہمدوشی کا فخر بخشا گیا ہے۔ شیکسپئیر اور نظیر کا مقابلہ زیادہ عام پسند ہے اور جدید اردو شاعری کے مدح سراؤں میں بالخصوص رائج۔ جس محسوس یا غیر محسوس منطق سے اس مناسبت پر پہنچا جاتا ہے۔ وہ بالکل سادہ ہے۔ "نظیر ایک بڑا شاعر تھا، خصوصاً جدید رنگ کا، جس نے غزلوں کی بجائے زیادہ تر نظمیں لکھیں اور ان میں "نیچرل شاعری" کی۔ اس نے کئی جگہ محبوب[5] کو مونث باندھا۔ وہ سرتاپا ہندوستانی شاعر تھا۔ ابھی تک اسے اس کا حق نہیں ملا ظلم! ناانصافی! نظیر زندہ باد!! تنقید میں یہ نظیر زندہ باد کا جذبہ اسی صورت میں ظاہر ہو سکتا ہے کہ اسے دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کے ہم پلہ گردانا جائے، اور اس کام کے لئے شکسپیر سے بہتر کون ہے؟ خاص طور پر جب کہ تنوّع کی خصوصیت دونوں میں شامل ہے۔ چلو فیصلہ ہو گیا!"

لیکن جن لوگوں نے شکسپئیر اور نظیر دونوں کو ذرا غور سے پڑھا ہے۔ وہ فوراً جانچ لیں گے کہ یہ موازنہ کس قدر غلط ہے۔ ان دونوں کی شاعری کے بنیادی اصول ہی کلیتہً متناقص ہیں۔ نظیر تمام تر ایک خارجی بیانیہ شاعر ہے۔ شکسپیئر کی شاعری کا انحصار سیرت اور اس کی پراسرار حرکات پر ہے۔ نظیر کے ہاں واقعات کے بیان اور عام زندگی کی بے شمار چیزوں اور کاموں کے وصف ملیں گے لیکن کہیں انفرادی جذبات کی تفصیل یا انسانی روح اور خیالات کی تحلیل نظر سے نہیں گزرتی۔ میرے ذہن میں اس کی صرف ایک نظم آتی ہے ــ "قصۂ ہنس" ــ جس کی بنیاد انفرادی جذبات پر ہے۔ (وہ بھی ہنس کے، یا ہنس کے ہم صفیروں کے) اور یہاں بھی نظیر کا خارجی اشیا سے شغف نمایاں ہے۔ اس ایک نظم میں قریباً ساٹھ پرندوں کے نام مذکور ہیں۔ ــ یہ نہیں کہ نظیر جذبات سے عاری ہے۔ ایسا ہوتا تو اس کی شاعری پر کوئی مضمون لکھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ میرا مطلب یہ ہے کہ وہ اشیا کے خارجی اور عملی ظاہرات اور معاملات میں دلچسپی لیتا ہے، ان کی باطنی محرّک طاقتوں پر غور نہیں کرتا۔ اس کی کمل محویت کے لئے صرف یہ دیکھنا کافی ہے کہ "دنیا میں بادشہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی، اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی" اور "ابدال قطب و غوث و ولی آدمی ہوئے" اور "مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے"

[5] کیا ہمیں لگتی ہے پیاری جب وہ کہتی ہے نظیر۔ ہے میاں کچھ ان دنوں مہربانی آپ کی۔ (غزل)

یاں میاں" اور "بیٹھیں ہیں آدمی ہی دکانیں سجا سجا" وغیرہ وغیرہ وہ "آدمیت" کی (جو ایک داخلی چیز ہے) تحلیل نہیں کرتا۔ بلکہ اس گوناگوں تماشے کو جس میں زندگی کی روح سے تیاں بے شمار صورتیں بھاگ دوڑ رہی ہیں۔ دیکھنے میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ اسے یہ سوچنا یاد نہیں رہتا کہ کونسی کائناتی طاقت ان کو دوڑا رہی ہے یا یہ ظاہری حرکتیں کن باطنی کیفیتوں کو ظاہر کرتی ہیں شکسپیئر کا مطمع نظر یکسر مختلف ہے۔ وہ بھی کہتا ہے۔

"بادشاہ بھی میرا خیال ہے ہماری طرح محض ایک انسان ہے
نرگس اسے بھی ایسی ہی بھلی معلوم ہوتی ہے جیسی مجھے۔ اس کے تمام
حواس انسانی ہیں اور اگرچہ اس کی خواہشیں زیادہ بلند پرواز ہیں۔
لیکن جب وہ جھکتی ہیں تو ہماری خواہشوں کی طرح ہی جھکتی
ہیں" (ہنری پنجم)

جو چیز شاہ و گدا کو یکساں بناتی ہے وہ ان کے ایک جیسے حواس اور جذبات ہیں اور ملتی جلتی امنگیں، ان کی ہمتوں کی پستی اور شوق کی بلندی" اور یہی انسانیت کا اصلی جوہر ہے اور شاعری کا اصلی مضمون نظیر کے لئے انسان زیادہ تر اس لئے دلچسپ ہے کہ وہ چلتا پھرتا اور دلچسپ حرکات کرتا ہے۔ کمتر اس لئے کہ خیالات اور احساس رکھتا ہے شکسپیئر اور نظیر کا یہ فرق اتنا بنیادی ہے کہ اس کے مقابلے میں ان کی ظاہری مشابہتیں (مثلاً تنوع اور ظرافت) بہت مدھم نظر آتی ہیں۔ اس کے علاوہ دونوں کے فنی طریق کار مختلف ہیں۔ شکسپیئر ایک ڈرامائی شاعر ہے اور ڈراما تصادم (جو شکسپیئر میں اکثر باطنی ہوتا ہے) اور سیرت کے تدریجی ارتقا پر منحصر ہوتا ہے نظیر ایک بیانی بلکہ واقعاتی شاعر ہے اور اگرچہ اسے زندگی کے تغیرات اور سفید و سیاہ کا گہرا احساس ہے لیکن یہ تغیرات اس کے ہاں ناگہانی ہوتے ہیں نہ کہ شکسپیئر کی طرح تدریجی۔

خیر اس بحث کو طول دینے سے کیا حاصل۔ نظیر کو شکسپیئر سے مناسبت دینا نہ شکسپیئر کے ساتھ انصاف ہے نہ نظیر کے ساتھ اور نہ شاعری یا تنقید کے ساتھ۔ لیکن ایک شخص بغیر شیکسپیئر ہونے کے بھی شاعر ہو سکتا ہے اور اچھا شاعر ہو سکتا ہے۔ نظیر ایک شاعر تھا۔ آئیے اب یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کریں کہ کس درجے کا۔

اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ نظیر اردو ادب میں دلچسپ ترین شخصیت ہے۔ یہ صوفی منش، رند مشرب، زندہ دل انسان جو ہولی کی بجائے ہولا کھیلتا ہے لیکن دنیا کو مایا جانتا ہے، جمانا حسن کے ہر کونے سے واقف ہے لیکن نعت رسول اور منقبت علی میں سرنگوں ہے، یہ اپنے اندر زندگی کی ایسی سیمابی تڑپ رکھتا ہے جو آپ پر اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس کی طبیعت کی اُپج اور رسوم و قیود سے آزادی اس درجہ تھی کہ اس نے مروجہ شاعری کے تمام اصول اور مراسم بالائے طاق رکھ کر اپنے لئے ایک بالکل نئی شعری دنیا تیار کر لی جسے ابھی تک روائتی تنقید ہمدردانہ نگاہ سے دیکھنا تو درکنار سمجھنے تک کی کوشش نہیں کر سکی۔ حالی غالباً وہ اکیلا معیاری نقاد ہے جس نے نظیر کی برتری کو جانچا ہے لیکن مقدمہ شعر و شاعری کی تعریف بھی بے لاگ نہیں، بلکہ صاف طور پر رسمی اصولوں کی طرفداری کی غمازی کرتی ہے۔ حالی کو اعتراف ہے کہ نظیر نے غالباً اردو شعرا میں سب سے زیادہ لفظ استعمال کئے ہیں لیکن اسے شکایت ہے کہ اس ذخیرے میں بہت سے لفظ غیر مستند اور ادبی معیار سے گرے ہوئے ہیں۔

لغت کے متعلق ہمارا نظریہ بہت کچھ بدل چکا ہے۔ زبان ایک ایسی چیز نہیں ہے جو ایک دفعہ ڈھل جائے تو پھر بدلی نہ جا سکے۔ یہ زندہ چیز دل کی طرح بڑھتی گھٹتی اور اپنے ماحول سے متاثر ہوتی رہتی ہے۔ اس کا کام شاعر کو شکنجے میں جکڑنا نہیں بلکہ شاعر کے تجربۂ حیات کا علمبردار ہونا ہے۔ اسی لئے لغات کا استناد شاعری کی کسوٹی نہیں بنایا جا سکتا۔ شکسپیئر اور سپنسر نے بہت سے لفظ ایسے استعمال کئے ہیں جو خود ان کے اپنے زمانے میں متروک یا اجنبی یا کم از کم معیوب تھے۔ ان میں سے کئی آج مستند بن چکے ہیں اور کئی ایک ہمیشہ کے لئے طاقِ نسیاں کے رہین ہو گئے۔ یہ زمانے کا ارتقا ہے جو آپ کے یا میرے بس کی چیز نہیں۔ ہر زندہ زبان کی نشو و نما اور قطع و برید ہوتی رہتی ہے۔ جو چیز نہیں بدلتی وہ ایک شاعر کا تجربۂ حیات ہے۔ یہی اس کی شاعری کی بنیاد ہے۔ اسی سے اُس کی لغت پرکھی جاتی ہے اور اسی کے کامیاب اظہار اور علو مقدرت پر اس کی عظمت کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ زبان اور لغت وہی اچھی ہے جو اس تجربے کو پوری صداقت کے ساتھ بیان کر دے۔

نظیر کا تجربۂ حیات عام شاعروں سے بہت مختلف تھا۔ وہ ہمارے رسمیت مآب طبقے سے تعلق نہیں رکھتا تھا بلکہ ان سے گریزاں تھا۔ اس کی زندگی کا بیشتر وقت سماج کے نچلے طبقوں کی پُر شور اور معمور فضا میں گذرا اور اس کی لغت بھی اسی فضا کی پیداوار یا عکس ہے۔ نظیر ایک حقیقت نگار تھا اور ہر حقیقت نگار کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس میدان کو اپنے آرٹ کی جولانگاہ بنائے اس کی تصویر کشی میں بھی وہیں کے مخصوص رنگ بھرے طوائفوں

اور دُکانداروں اور فقیروں کی زندگی کا مصوّر میر حسن یا انیس کی منجھی ہوئی اردوئے معلّٰے نہیں استعمال کر سکتا۔ اس لئے اگرچہ نظیر کے بہت سے الفاظ ہمیں شائستگی یا ادبیّت کے اعلیٰ درجے سے گرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے تجربے کے لئے یہی لغت موزوں ہے اور اس لئے نہ صرف ناقابل اعتراض بلکہ ضروری ہے۔

نظیر نے کیوں اپنا تجربہ طبقۂ عوام کے ساتھ منسلک اور محدود کر لیا؟ اس کا جواب دینے کی کوشش تو ہم کچھ ٹھہر کر کریں گے، یہاں اتنا ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ آرٹسٹ کے لئے میدان عمل کے اس طرح محدود ہو جانے میں فی نفسہٖ کوئی قباحت یا نقص نہیں۔ یہ کہنا محض کم نظری بلکہ غلط نظری ہوگی کہ طبقۂ عوام شاعری کے لئے کچھ بہت معزز یا شاندار موضوع نہیں۔ لغات کی طرح موضوع بھی شاعری کا ایک خارجی پہلو ہے۔ اصل چیز شاعر کے تجربے کی نوعیّت اور اس کے انداز نظر کی وسعت اور صحت ہے۔ ایک کتّے یا ایک بھک منگے پر اسی قدر رفیع القدر اور مؤثر مضمون لکھا جا سکتا ہے جتنا ایک شیر یا ایک شہنشاہ پر۔ موضوع تو ایک کھونٹی سے مشابہ ہے جس پر ہر کپڑا ٹانگا جا سکتا ہے۔

ایک طرح سے نظیر کو اس حدبندی سے فائدہ بھی ہوا۔ چونکہ وہ دنیا اور سماج کے صرف ان حلقوں سے متعلق نظمیں لکھتا تھا جن سے وہ خود پوری طرح واقف تھا۔ اس لئے اس کی شاعری میں ایک واقعیت، ایک حقیقت اثری پائی جاتی ہے جو اس سے پہلے اردو شعرا میں اکثر مفقود بلکہ معدوم تھی۔ فارسی ادب کے اثر نے اردو کو اس قدر اپنا لیا تھا کہ نہ صرف لفظ بلکہ تشبیہیں اور استعارے بھی اکثر فارسی نظم سے لئے جاتے تھے۔ شیریں فرہاد، لیلیٰ مجنوں ہمارے مثالی عشاق تھے اور نل دمن یا ہیر رانجھا کا ذکر غیر ادبی سمجھا جاتا تھا۔ شمشاد اور سرو، قمری و بلبل، غنچہ و بربط ہمارے شعرا کی مستند زبان بن چکے تھے۔ تھوڑے سے مبالغے کے ساتھ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ رفتہ رفتہ اردو نظم ایک بالکل خیالی، حقیقت سے دور فضا میں رہنے لگی تھی۔ جہاں داخلی جذبات اور خیالات کے علاوہ (وہ بھی اکثر فرسودہ اور رسمی ہونے کی وجہ سے بے اثر) مادی دنیا کی کشمکش کی جھلک تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ سمجھدار لوگ اسی لئے شاعری کو خطرناک سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ پڑھنے والے کو اس جہانِ دارو گیر میں رہنے کے ناقابل بنا دیتی اور اسے ایک غیر مردانہ خواب اثر عالم میں لے جاتی تھی۔ نظیر نے اس روش کو ترک کر کے بالکل نئی راہ اختیار کی۔ اور روزانہ زندگی کی دلچسپ اور گونا گوں حقیقتوں سے لوگوں کو آشنا کیا۔ اسے پڑھتے وقت آپ کے پاؤں ہمیشہ زمین پر ہوتے ہیں۔ آپ کو کبھی "خواب کے جزیروں" پر پرواز کا احساس نہیں ہوتا۔ اگر وہ کبھی خوابی فضا کا ذکر کرتا بھی ہے تو جلد ہی آپ کو اس سے بیدار کر کے دنیا کی اصلیت پر لے آتا ہے:

صحن چمن میں واہ دارو رکھی تھی چاندنی چاند بلوریں لینا تھا اور کھلی تھی چاندنی

بوس و کنار و جام مے عیش و طرب سبھی خوشی اس میں کہیں سے یک بیک مرغ سحر نے بانگ دی

صبح ہوئی، گجر بجا، پھول کھلے، ہوا چلی

یار بغل سے اٹھ گیا جی ہی میں جی کی رہ گئی

ایک دو نظمیں جو نظیر نے خاص خواب کے موضوع پر لکھی ہیں ان میں بھی یہی واقعیت نمایاں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواب اسی دنیا کا زیادہ رنگین نقشہ ہے۔ یقیناً یہ حقیقت نگاری نظیر کے کلام کی اہم خصوصیتوں میں سے ہے اس کی خیالی نظمیں بھی (صرف موضوعاً خیالی) زیادہ تر عالم اشیاء کے بیان پر مشتمل ہوتی ہیں۔ وہ خیالات کو اجسام اور واقعات کی اصطلاحوں میں بیان کرتا ہے کیونکہ وہ انہی سے زیادہ مانوس ہے۔ مفلسی کا بیان یوں کرتا ہے۔

جب آدمی کے حال پہ آتی ہے مفلسی کس کس طرح سے اس کو ستاتی ہے مفلسی

اور اس کے بعد پے در پے مفلسی کے مادّی مظاہرات کی مثالیں دیتا چلا جاتا ہے۔ وہ کہیں یہ نہیں بتاتا کہ مفلسی کا کسی ایک انسان پر کیا ذہنی اور روحانی اثر ہوتا ہے۔ اس کا مشاہدہ صرف یہی ہے کہ مختلف مفلسی زدہ لوگوں سے کیا کیا حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔

جو اہلِ فضل عالم و فاضل کہاتے ہیں مفلس ہوئے تو کلمہ تک بھول جاتے ہیں

پوچھے کوئی الف تو اُسے بے بتاتے ہیں ۔۔۔۔

یا جب روٹیوں کے بٹنے کا آکر پڑے شمار مفلس کو دیویں ایک تونگر کو چار چار

گر اور مانگے وہ تو اُسے جھڑکیں بار بار ۔۔۔۔

اسی طرح متعدد مثالیں ہیں جن میں حکیم، عالم، مدرّس، نقاش، خوبرو، عاشق، رنڈی، کلاونت (نے گوری کا وقت ہووے تو گاتا ہے وہ بہاگ) سب پر مفلسی کے مختلف اثرات بیان کئے ہیں۔

یوں ہی "فنا" اور "موت" "صحت" اور "مذمت دنیا" جیسے موضوع بھی جو کسی خیالی شاعر کے ہاتھوں میں حد سے زیادہ منتزع اور مجرد بن جاتے نظیر کے ہاں بالکل مادّی اور تخئیل سے کوری صورت میں بیان ہوئے ہیں۔ فنا کے متعلق جب غالب کہتا ہے:-

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

تو وہ ایک ایسے ذہنی تصور کا ذکر کرتا ہے جس کے بیان کے لئے صرف مادی دنیا کے واقعات اور اشیا کافی نہیں۔ اسی طرح موت کے متعلق چکبست کا خیال

فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا
اجل کیا ہے خمارِ بادۂ ہستی اُتر جانا

اور دنیا کے متعلق پھر غالب کا تصور:-

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

نظیر میں ایسے خیالات کا وجود ڈھونڈنا لا حاصل ہے۔ اُس کے لئے موت چند اسبابِ ظاہری کا ہم سے چھوٹ جانا، صحت چند چیزوں سے لطف اُٹھا سکنا اور دنیا چند محسوس و موجود اشیاء کا مجموعہ ہے۔

اس دنیا کی دھن دولت میں گر شاہ سلیمان جاہ چلے ؛ یا تھیسے میر وزیر اعظم یا راجہ بن کر آہ چلے
منہ دیکھ اجل کے لشکر کا تب لے کر گھر کی راہ چلے ؛ نے ہاتھی گھوڑے سنگ گئے نے تخت چھتر ہمراہ چلے

سب جیتے جی کے جھگڑے ہیں سچ پوچھو تو کیا خاک ہوئے
جب موت سے آکر کام پڑا سب قصّے قضیے پاک ہوئے

"قصّے قضیے" — دنیا نظیر کے لئے انہیں ظاہری اسباب اور واقعات پر مبنی ہے اور بس۔

یہ نظیر کی محدود نگاہی ہے۔ لیکن ان حدود کے اندر اس کی وسعتِ معلومات، قوّتِ مشاہدہ اور دقّتِ نظر کی انتہا نہیں۔ نظیر کی واقفیت کا دائرہ واقعی حیرت انگیز ہے۔ انسانوں کے علاوہ مخلوق کی ہر نوع، چرند اور پرند سے جس کا انسان سے واسطہ پڑتا ہے وہ پوری طرح واقف نظر آتا ہے۔ "ہنس نامہ" میں کوئی ساٹھ پرندوں کے نام درج ہیں (اور یہ نظم کوئی اتنی لمبی بھی نہیں) اور کوئی چالیس "ذکر مرغاں" (سانجھ سویرے مل کر چڑیاں الخ) میں۔ گلہری، ریچھ اور ہرن کے بچّے اس سے اتنے ہی بے تکلّف ہیں جتنے انسان کے بچّے، بلبلوں اور پودنے کی جنگ اس کے لئے بھٹیار لوں کی جنگ سے کم نہیں۔ یہ سچ ہے کہ سماج کے اعلیٰ طبقوں سے وہ ناواقفِ محض ہے لیکن درمیانی اور خاص طور پر نچلے درجے کا تو ہر فعل اور حرکت اُس کی نظر کے سامنے ہے۔ اس درجے کے کئی گروہ ہیں اسے ان سب گروہوں سے ذاتی اور گہری واقفیت ہے۔ "شہر آشوب" میں آگرے کی بدحالی کا بیان ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں یہ کلیہ بیان کر کے کہ ع اب آگرے میں جتنے ہیں سب لوگ ہیں تباہ، وہ ان مختلف لوگوں کے حالات کی تفصیل شروع کرتا ہے۔ صرّاف، بنئے، جوہری، سیٹھ ساہو کار، دکاندار، سوداگر، بیوپاری، بزاز، پنساری، دلّال، بازاری، پسنہاری، دستکار، پیشہ ور، لوہار، سنار، تارکش، بساطی، نانبائی، بھڑ بھونجے، دُھنیئے، کاغذی، قزاق، کتوال، چوکیدار، ملاح، کمان گر، صحّاف، شبیہہ ساز، مصور، نقّاش، حجّام، محبوب، مقبروں کے خادم، برہمن، مدرس پیرزادے، فقیر، بھکاری، سپاہی، رسالدار، مختلف قسم کی رنڈیاں ——— اس بھیڑ کے سامنے میر اور سودا کے شہر آشوبوں کی فہرست کردار بالکل ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

اگر ہم نظیر کے عنوانوں کی فہرست بنائیں تو شاید ہی نچلے طبقے کی خارجی زندگی کا کوئی پہلو نکلے گا جس پر اس نے بالکل قلم نہیں اٹھائی۔

تہوار:- ہولی (۶ نظمیں) دیوالی (۲) عید، شب برات، عرس حضرت چشتی، راکھی، بلدیو جی کا میلہ۔

موسم:- برسات (۴)۔ بہار۔ زمستان۔ اوگمش۔ اندھیری۔ چاندنی۔

زندگی:- طفلی (۲)، بڑھاپا۔ جوانی۔

عام روزانہ ضرورت کی اشیا:- پیسہ (۲)۔ کوڑی۔

روٹی۔ آٹا دال (۲)، چپاتی، نان، تل کے لڈّو، چوہوں کا اچار، ککڑی، تربوز، نارنگی۔ موتی۔ کورا برتن۔ کنکوا پتنگ۔

جانور وغیرہ:- ذکرِ مرغاں، ہرن کا بچہ، گلہری، ریچھ کا بچہ، اژدہے کا بچہ، جنگِ بلبلاں، جنگِ پودنہ،

عمارات:- اکبر آباد۔ تاج گنج۔

رسوم و عادات:- خوشامد۔ تلاش زر۔ دید بازی۔ کبوتر بازی۔ فقر۔

حالاتِ زمانہ:- مکائدِ دنیا۔ شہر آشوب۔ فراقِ مفلسی۔ مذمتِ دنیا۔ بیانِ فنا۔ موت۔ دولت۔ بے ثباتیٔ عالم۔ بد و نیک

مذہبی:- حمدِ الٰہی۔ نعت۔ منقبتِ علی (۲) معجزۂ عباس۔ حضرت تسلیم چشتی اور کرشن جیتی۔

اتنے مختلف النوع موضوع (ان میں آپ جنس اور چوپٹی بازی بھی شامل کر سکتے ہیں جن پر اور کسی اردو شاعر کا کلام موجود نہیں اور جن میں سے کم از کم دوسری نظم فنّی طور پر بہت دلچسپ ہے) نظیر کی ہمہ دانی کا سکّہ ہم پر

بٹھلانے کے لئے کافی ہیں۔ لیکن نظیرؔ میں صرف موضوع ہی اتنے ہمہ گیر نہیں۔ ان کے متعلق اس کی واقفیت بہت وسیع اور ذاتی ہے۔

اشیا کے خارجی پہلو سے شغف اور حقیقت نگاری نے نظیرؔ کی شاعری میں لا تنا اور بھی چند ظاہری خواص پیدا کر دیئے ہیں مثلاً مقامی رنگ۔ نظیر خالص ہندوستانی شاعر ہے نہ صرف اس کی تمام شاعری کی فضا ہندوستانی ہے بلکہ اس نے ہندوستان کے رسم و رواج سے متعلق بہت سی مستقل نظمیں لکھیں۔ کرشن جی والی نظمیں جو اس کی کلیات کا ایک معتد بہ حصہ ہیں وہی شخص لکھ سکتا تھا جو نہ صرف اپنے ملک کے رسوم سے پورا واقف ہو بلکہ ان میں گہری دلچسپی رکھتا ہو۔ "جنم کنھیا جی" جو فن کے لحاظ سے اس سلسلے کی بہترین نظموں سے ہے اور اس زمانے کی ایک اہم تقریب کا ہو بہو مرقع ہے۔

سب ناری آئیں گوپی کی اور پاس پڑوسن آبیٹھیں کچھ ڈھول مجیرے لاتی تھیں کچھ گیت جگا کر گاتی تھیں
کچھ ہر دم منہ اس بالک کا بلہاری ہو کر دیکھ رہیں کچھ تھال بنجیری کے رکھیں کچھ سوٹھ سنٹھورا کرتی تھیں

کچھ کہتی تھیں ہم بیٹھے ہیں نیگ آج کے دن کا لینے کو
کچھ کہتیں ہم تو بیٹھے ہیں آنند بدھاوا دینے کو

. . . .

کوئی کہتی بالک خوب ہوا اے بہنا تیری نیک رتی یہ بالک ان کو ملتے ہیں جو دنیا میں ہیں بڑھ بھاگی
اس کنبہ کی بھی شان بڑھی اور بھاگ بڑھے اس گھر کے بھی یہ باتیں سب کی سن سن کر یہ بات جسودھا کہتی تھی

اے بیر یہ بالک جو ایسا اب مرے گھر میں جنما ہے!
کچھ اور کہوں میں کیا تم سے بھگوان کی مو پر کرپا ہے!

جسودھا کے جواب کی لجاہٹ لیکن اس کے ہلکے پردے کے نیچے اپنی خوش نصیبی پر غرور ــــ نظیر کا مشاہدہ داد کے قابل ہے۔ موسموں اور تہواروں کے بیان میں بھی نظیر کی گہری ہندی ذہنیت نمایاں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ واقعات کا یہ دلدادہ اپنے ماحول سے پرے جا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ انہیں کا پروردہ تھا اور انہیں کا پرستار۔ وہ خود اپنے متعلق مؤثر الفاظ میں کہتا ہے۔

عاشق کہو، اسیر کہو، آگرے کا ہے ملا کہو، دبیر کہو آگرے کا ہے
مفلس کہو، فقیر کہو آگرے کا ہے شاعر کہو نظیر کہو آگرے کا ہے

اس واسطے یہ اس نے لکھے پانچ چار بند (شہر آشوب)

یہاں تک تو نظیرؔ کی شاعری کی خارجی خصوصیات کا ذکر تھا جو لازماً قدرے غیر دلچسپ ہوتا ہے۔ اب ہم اس کے کلام کے الہامی یعنی باطنی پہلو پر نظر ڈالیں گے۔ وہ کونسی طاقت ہے جو نظیر کو شعر کہنے پر اکساتی بلکہ مجبور کرتی ہے؟ نظیر کی شاعری کے داخلی اصول کیا ہیں؟ وہ کون سے ذہنی یا قلبی اثرات ہیں جو پڑھنے والا اس کی نظموں سے اخذ کرتا ہے؟ اور نظیرؔ کی شخصیت کے متعلق ان سے ہمیں کیا واقفیت ملتی ہے؟

نظیرؔ کی شاعری کا مرکزی نقطہ اس کی ظرافت ہے اردو شاعری کی اُفتاد کچھ ایسے زمانے اور فضا میں پڑی کہ مایوسی اور قنوطیت کا ایک گہرا بادل اس پر چھایا رہا۔ صرف کبھی کبھی کسی شاعر کی زوردار اور جدت پسند طبیعت نے اس افسردہ کن اثر کو مغلوب کر کے ظرافت کی روشن فضا میں قدم رکھا ــــ سوداؔ، اکبرؔ، نظیرؔ اردو کے ظریف شاعروں کی فہرست ان پر ختم ہو جاتی ہے لیکن ان تینوں میں بھی ظرافت کے ساتھ ملا ہوا سوز اور درد کا ایک گہرا اثر ہے اگرچہ ہر ایک کی ظرافت اور سوز کی نوعیت مختلف ہے۔

نظیر جو بہت کھرے اور سادہ (میرا مطلب غیر پیچیدہ سے ہے) جذبات رکھتا تھا۔ اور جس میں قوتِ عمل بے حد تھی (یہاں تک کہ وہ کئی بار اس فالتو قوت کا کھلم کھلا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ع
اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے) اپنی ظرافت میں سادہ اور زوردار ہے اور لطافت و نزاکت سے عاری۔ اس کی ہنسی کھلا قہقہہ اور اس کا تمسخر بے روک و ریا ہے۔ کئی ظریفانہ نظمیں تو ایک سانس میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان میں فرمائشی ہنسی اُمنڈتی چلی آتی ہے "تربوز" کی ہنسی اسی قسم کی ہنسی ہے:۔

پیارے سے جب ہے وہ تربوز کبھی منگواتا
چھلکا اُس کا مجھے ٹوپی کی طرح دے ہے پنہا
اور یہ کہتا ہے کہ پھینکا تو چکھا دُوں گا مزا
کیا کہوں یارو میں اس شوخ کے ڈر کا مارا

دو دو دن رکھے ہوئے پھرتا ہوں سر پہ تربوز

یہ واقعہ [illegible] ہے، سیرتی نہیں اور نہ لفظی۔ اس کا تمام تر انحصار اس [illegible] نظیر جیسا گرانقدر شاعر جب دو دو دن ڈر کے مارے تربوز پہنے [illegible] نظر آتا ہے تو بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے۔ اسی طرح تشبیہ [illegible] ظرافت ــــ یار کی گئی ہیں۔

اس طرح سر کے شہیدوں [illegible] تھا انبار ہو جیسے بازار میں تربوز کے اُوپر تربوز

لیکن "تربوز" ان نظموں میں سے ہے جو صریحاً محض تفنن طبع کے لئے (غالباً فرمائشی) لکھی گئی ہیں۔ اس لئے اُس کے بالکل خصوصی رنگ کو نہیں ظاہر کرتی۔ اس کی ظرافت کا اصلی رنگ زیادہ گہرا اور کم سادہ ہے۔ تاہم عام طور پر سودا کی طرح نظیر کی ہنسی بھی اکھڑ اور بے باک ہوتی ہے۔ لیکن سودا کی ہنسی میں اکثر طعن اور ہجو کا عنصر ہوتا ہے۔ نظیر کی صلح کل طبیعت اس زہریلے خمیر سے خالی ہے۔ اس کی ہنسی ہمیشہ بے لاگ ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی چیز یا انسان پر محض اس کا خاکہ اڑانے یا اسے رسوا کرنے اور دل کی حاسدانہ بھڑاس نکالنے کے لئے نہیں ہنستا۔ بلکہ اس کے لئے ہنسی کسی چیز سے لطف اٹھانے کا نظری ذریعہ اظہار ہے۔ نظیر ہر چیز سے حظ حاصل کرسکتا تھا۔ اور یہ اس کی شاعری کی سب سے بڑی اہمیت اور روح پرور صفت ہے [illegible] مال، گگڑی، کو یا برتن، اور ریچھ کا بچہ اس کے لئے سب یکساں [illegible] دلچسپ ہیں۔ یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں کہ اس کے چند خوبصورت ترین شعر ککڑی کے متعلق ہیں ——

کیا پیاری پیاری میٹھی اور پتلی پتلیاں ہیں گنے کی پوریاں ہیں ریشم کی لکلیاں ہیں
فرہاد کی نگاہیں۔ شیریں کی ہنسلیاں ہیں مجنوں کی سرد آہیں لیلیٰ کی انگلیاں ہیں

کیا خوب نرم و نازک اس آگرے کی ککڑی
اور اس میں خاص کافر اسکندرے کی ککڑی

یہی اس کی صوفی منشی کا راز ہے۔ وہ بنی نوع انسان کے ہر فرد کو روشن پہلو سے دیکھتا ہے، ان کی بدنصیبی میں ان سے ہمدردی کرتا ہے اور ان کی خوشی میں ان کا شریک حال ہوتا ہے۔ معاشرتی تفریق جو مختلف گروہوں میں ہے وہ اس کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس کے لئے یہ [illegible] کافی ہے کہ سب تغیرات زمانہ کے شکار اور موت کے [illegible] ہیں۔

گر اپنا ہوا منصب و جاگیر کا نقشہ اور ایک کو مر مر کے ملا بھیک کا ٹکڑا
کیا فرق ہوا دونوں میں جب مرنا ہی ٹھیرا اس نے کوئی دن بیٹھ کے آرام سے کھایا

وہ مانگتا در در پھرا خیرات تو پھر کیا

مذہب کی تمیز بھی نظیر کے لئے بے معنی ہے۔ "کرشن کی بانسری" والی نظم اس کی منقبتی نظموں سے غالباً سب سے زیادہ احساس سے لکھی ہوئی ہے، جب مر کر سب برابر ہو جائیں گے تو زندگی کے اختلافات کیسے؟

حقیقت یہ ہے کہ جہاں نظیر میں ہر چیز سے حظ حاصل کرنے کی صلاحیت ہے وہاں اُس میں دنیا اور اس کے آرام و آسائش کی بے ثباتی اور حالات کے ناگہانی تغیرات کا بھی شدید احساس ہے ع ایک پلک میں ناگہاں سب وہ مزے شرار تھے۔ یہ احساس وصل کی نظموں میں بہت نمایاں ہے۔ اکثر شبِ وصل میں انتہائے لطف میں کوئی بلا نازل ہو جاتی ہے۔ مرغ سحر چلا اٹھتا ہے، یا رقیب آ نکلتا ہے، یا —— آنکھ کھل جاتی ہے! دنیا پر غور کرو تو یہ کبھی ایک حال پر نہیں رہتی۔ دو دن خوشی کے ہیں تو دو دن غم کے۔ عشرتیں کلفتوں میں بدل جائیں گی، اور (شاید) کلفتیں عشرتوں میں، بہتر یہی ہے کہ انسان ہر حال میں خوش رہے۔ ع۔ ہیں مرد وہی جو کہ ہر اک حال میں خوش ہیں۔

جو عشرتیں آ کر ملیں تو بھی وہ کر جانا میاں جو درد دکھ آ کر پڑیں تو بھی وہ سہہ جانا میاں
یا سلطنتیں یا دکھ میں غرض یاں سے گذر جانا میاں یا چار دن کی زندگی آخر کو مر جانا میاں

گر یوں ہوا تو کیا ہوا اور وُوں ہوا تو کیا ہوا

نظیر کی بے شمار نظمیں اس ذہنی رجحان کو ظاہر کرتی ہیں، اور یہی اس کی سب سے زیادہ عام پسند نظمیں ہیں ع کلجگ نہیں کرجگ ہے یہ، یاں دن کو دے اور رات لے۔ اور

تن سوکھا کبڑی پیٹھ ہوئی گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

اور

سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

یہ نظمیں عام اور خاص کی زبان پر ہیں اور باوجود اس قدر مقبول ہونے کے بہت حد تک اپنا اثر قائم رکھے ہوئے ہیں۔ اس دوامی اثر سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نظیر کے دل اور دماغ کے ایک گہرے پہلو کی مظہر ہیں، زیادہ سے زیادہ گہرائی جو نظیر کے کلام میں ملتی ہے انہی نظموں میں ہے۔

اس احساس نے نظیر کی ظرافت کو ایک خاص رنگ دے دیا ہے۔ اس کی اصلی ظرافت میں تفنن اور ترحم، درد اور ہنسی گھلے ملے ہوتے ہیں، ظرافت تاسف سے دور نہیں ہوتی اور تاسف ظرافت کے ہر وقت پا بہ رکاب۔ "شہر آشوب" جس کا نام ہی بتاتا ہے کہ یہ اندوہ کی نظم ہے، جا بجا ظرافت کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔

کپڑا نہ گٹھری بیچ نہ تھیلی میں زر رہا
خطرہ نہ چور کا نہ اُچکّے کا ڈر رہا

بیٹھے ہیں یوں دکانوں میں اپنی دکاں دار

جیسے کہ چور بیٹھے ہوں قیدی قطار بند!

اور وہ سوداگر جو دھوتی پہنے ہوئے ہے لیکن بدحواسی میں پیشاب کرنے کے لئے بار بار آزار بند کھولنے کی کوشش کر رہا ہے (کئی جگہ تو نظیر کی نظموں میں یہ اندازہ لگانا کہ وہ ہنس رہا ہے یا رو رہا ہے مشکل ہو جاتا ہے کیونکہ وہ دونوں چیزیں بیک وقت کر رہا ہوتا ہے)

جب تن کے اوپر مرگ نے آ ڈال دی کملی اک دم میں ہوا ہو گئے سب نظری و عملی

تھے یاد جو اسباب و علامات تو پھر کیا!

یہاں نظیر "نظری و عملی" کی موت پر افسوس کر رہا ہے یا ان کے ہنر میں لطف لے رہا ہے اور انہیں سراہ رہا ہے۔ مصرعوں کا نفسِ مضمون تو یقیناً موت ہے لیکن ان کا اور پوری نظم کا لہجہ صاف بتاتا ہے کہ نظری و عملی کا ہنر نظیر کے لئے کچھ کم دلچسپی نہیں رکھتا (بالخصوص "ہوا ہو گئے" اور "اسباب و علامات" کے لہجے پر غور کرو) اور شاید ان کے فنا ہونے کا افسوس بھی اسی لطف کی وجہ سے ہے۔ یہاں مزاح اور غم ایک جان ہو گئے ہیں۔

کسی آرٹسٹ کے لئے یہ دہرا احساس، یعنی زندگی کے تاریک اور روشن دونوں پہلوؤں سے اثر لے سکنے کی طاقت ایک خداداد نعمت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس سے اس کے تبصرۂ حیات سے یک جہتی کا عیب دور ہو جاتا ہے، خواہ اس کا دائرۂ عمل محدود ہو۔ لیکن ان دو متضاد چیزوں میں فنی طور پر مکمل ربط اور یک رنگی پیدا کرنا بہت مشکل کام ہے اور اعلیٰ درجہ کے صاحبِ فن ہی اس میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ نظیر اول درجے کا فن کار نہیں تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ باوجود اتنی عظیم الشان خوبیوں کے اس کی شاعری سے ہمیں اکثر مکمل تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ کئی دفعہ وہ ہنسی اور تاسف میں توازن نہیں قائم کر سکتا۔ جب وہ "بیانِ مکائدِ اہلِ دنیا" میں بار بار کہتا ہے

ہشیار یار جانی یہ دشت ہے ٹھگوں کا

یاں ٹک نگاہ چوکی اور مال دوستوں کا

تو شاعر کی ظرافت اور موضوع کی سنجیدگی میں ایک ناگوار بے آہنگی محسوس ہوتی ہے۔ بالخصوص "دوستوں" کا استعاری لفظ جس میں طنز کا پہلو غالب ہے (اور طنز نظیر کی عام ذہنی روش کے مخالف ہے) نظم کو ایک ناموزوں غیر سنجیدگی کا لہجہ دے دیتا ہے۔ علاوہ اس کے، نظیر کی بہت سی نظمیں ضرورت سے زیادہ ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہیں اور اس کے شعروں میں اکثر بھرتی کے لفظ ہوتے ہیں، جنہیں کچھ محنت سے دور کیا جا سکتا تھا۔ کئی نظمیں تو مختلف بندوں کا بے ترتیب مجموعہ معلوم ہوتی ہیں جن میں سوائے موضوع کی یگانگت کے کوئی فنی تعلق نہیں ہوتا۔ کئی دفعہ وہ پے در پے واقعات اور مثالیں قلمبند کرتا جاتا ہے اور یہ نہیں دیکھتا کہ ان کا مجموعی اثر کیا ہو گا۔ کیا اتنی مثالیں خود ہی اپنا مقصد فوت تو نہیں کر دیں گی! اور بجائے نظم کا اثر گہرا اور تیز کرنے کے اسے بے اثر اور شاید بیزار کن تو نہ بنا دیں گی۔ آرٹسٹ کا جہاں یہ کام ہے کہ وہ جانے کہ اسے کیا کہنا ہے اسے یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کیا نہیں کہنا۔ بلکہ فن کے کمال کی نشانی یہی ہے کہ جو چیز نظم کے مجموعی اثر کے لئے ممد نہیں ہو سکتی اسے نہایت سختی کے ساتھ حذف کر دیا جائے اور نظم کی آخری شکل ایسی ہو کہ اس میں سے کوئی شعر یا لفظ ہلایا نہ جا سکے نظیر میں فن کا یہ احساس بالکل مفقود ہے۔ اس کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے کئی کئی بند نکال دیئے جاتے تو بجائے انہیں نقصان پہنچنے کے وہ کہیں زیادہ پر اثر اور خوبصورت بن جاتیں۔ اس کی مثالیں دینا لاحاصل ہے۔ ہر پڑھنے والا جا بجا اس افراط و تفریط کو محسوس کرتا ہے۔ کہیں کہیں بے جا طوالت اعادہ کی قبیح صورت اختیار کر لیتی ہے چاندنی رات (صحن چمن میں واہ وا زور کھلی تھی چاندنی) موسم برسات (رات لگی تھی واہ وا کیا ہی بہار کی جھڑی) اور عالم بہار (شب کو چمن میں واہ وا کیا ہی بہار تھی مچی) تینوں ایک سی نظمیں ہیں۔ ایک ہی قسم کا موضوع، ایک ہی طرح کے بند، ایک ہی ترتیب، ایک سا آغاز، ایک سا انجام، یہی نہیں، ان میں سے ہر ایک نظم کے مختلف بند صرف ایک دو بندوں کی تفصیل نظر آتے ہیں جن میں محض الفاظ یا مثال کا فرق ہے خیال ایک ہی ہے۔

اس فنی کمزوری کی وجہ کچھ ہو ـــــ اور غالباً بہت حد تک فرمائشوں کی بھرمار اور بدیہہ گوئی کی ضرورت اس کے اہم اسباب تھے۔ طبیعت کی فطری بے پروائی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات جس طرح اس کے ذہن میں آتے ہیں وہ بیان کرتا چلا جاتا ہے، اور جو لفظ سب سے پہلے سوجھتے ہیں انہیں برتتا جاتا ہے۔ اس سے اس کی شاعری میں بے حد بے تکلفی اور بے ساختگی پیدا ہو گئی ہے۔ جو اکثر فرحت بخش ہوتی ہے لیکن اس سے ایک ناقابلِ تلافی نقصان بھی

ہوا۔ اس فنّی نقص کی وجہ سے نظیر اپنے تجربۂ حیات کو پوری طرح یا کم از کم پوری خوبی سے بیان نہیں کر سکا۔ اس کی کسی نظم سے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہاں نظیر کی روح، قلب اور دماغ ایک ساتھ پورے جوش سے کام کر رہے ہیں، اور اس میں نظیر کی زندگی کے تجربے کا نچوڑ ہے۔

اور یہی بہت حد تک نظیر سے ہماری بے اطمینانی کا سبب ہے۔ اس کا زیادہ افسوس اس لئے ہوتا ہے کہ صنّاعی کے دوسرے درجے میں نظیر کا رتبہ بہت بلند تھا۔ لفظوں پر جو شاعر کا ذریعۂ اظہار ہیں اسے بے حد قدرت تھی۔ وہ نہ صرف عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندی کے بے شمار مروّج الفاظ جانتا ہے بلکہ ضرورت کے وقت (بعض دفعہ محض سہولت کے لئے جو قابلِ اعتراض ہے) لفظوں کی ساخت اور صورت میں تبدیلی کرنے کی جرأت رکھتا ہے اُس کا لفظوں کا استعمال ہر جگہ گرفت سے بالا نہیں۔ کئی جگہ وہ ایسے محاورے استعمال کر جاتا ہے جن کا رنگ (کم از کم ہمارے نزدیک) نظم کے مضمون کی سنجیدگی کے منافی ہوتا ہے کہیں کہیں اس کی اپنی ساختہ لفظی شکلیں یا ترکیبیں (جو اکثر بہت دلچسپ اور انوکھی ہوتی ہیں) صحیح ذوق کو ناگوار گذرتی ہیں لیکن بحیثیت مجموعی زبان پر اس کی زبردست قدرت تسلیم کرنی پڑتی ہے۔ ہر وقت لفظوں کی فوج اس کے آگے دست بستہ حاضر رہتی ہے اور وہ جسے چاہتا ہے انتخاب کر لیتا ہے اور اگرچہ فطری بے پروائی کی وجہ سے وہ ہمیشہ اس انتخاب میں سختی سے کام نہیں لیتا تاہم عموماً لفظ اسے دھوکا نہیں دیتے۔ شعروں کی موسیقی بھی نظیر میں بہت ہے اور کم از کم ایک خاص طرز کا تو وہ مالک ہے لیکن اس موسیقی میں گداز کم ہے اور آہنگ زیادہ ــــ مینڈ نہیں بلکہ گت۔ اس لحاظ سے بھی نظیر کی پُر گوئی اس کے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ وہ خاموش رہنا نہیں جانتا اور موسیقی میں سکوت ایک بے حد پُر زور ذریعۂ اثر ہے ــــ

میری اس تنقید کا یہ مطلب نہیں کہ نظیر کی کوئی نظم بھی فنی لحاظ سے مکمل نہیں۔ نظیر جیسے شاعر کے لئے یہ کہنا اپنی کم نظری کی دلیل ہے تاہم ان نظموں کی تعداد بہت کم ہے۔ "قصۂ ہنس" (دنیا کی جو الفت کا ہوا مجھ کو سہارا) ہر لحاظ سے ایک مکمل اور کامیاب نظم ہے، جس میں اثر بھی ہے اور فن بھی۔ "جنم کنھیا جی" ایک کامیاب بیانیہ نظم ہے۔ اور وہ حیرت انگیز شاہکار ــــ "سراپا"

وہ چنچل چال جوانی کی، اونچی ایڑی، نیچے پنجے
کفشوں کی کھٹک دامن کی جھٹک ٹھوکر کی لگاوٹ ویسی ہی!"

ہر بند مرصّع، ہر لفظ جڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ مشاہدے کی نُدرت اور مطالعے کی شگفتگی اور ان سے بڑھ کر پیکرِ انسانی کے حسن میں گہرا لطف: یہ سب سرود اور نغمہ کی ایک ایسی فضا میں محصور ہیں کہ دماغ حیرت میں رہ جاتا ہے۔ یہاں نظیر کا فن اوجِ کمال پر ہے لیکن اس نظم کی ارادی صنّاعی نظیر کے باقی کلام سے اس قدر مختلف معلوم ہوتی ہے کہ ہم اسے ایک عجوبہ ماننے پر مائل ہو جاتے ہیں اور اس سے نظیر کے کلام پر رائے قائم نہیں کرنا چاہتے۔ اگرچہ مشاہدے اور الفاظ کی خصوصیّت اس میں جا بجا نظیر کے اصلی رنگ میں ہے۔

ایسی نمایاں کامیابیوں کے باوجود نظیر کی صنّاعی کی عام سطح پست ہے اور قدیم طرز کے نقّادوں کی طرح اگر ہمارے نزدیک بھی شاعری چند بندھے ہوئے اصولوں کی پابندی سے عبارت ہوتی تو ہم نظیر کو خاطر میں نہ لانے میں حق بجانب ہوتے۔ لیکن خوش قسمتی سے شاعری وسیع تر چیز ہے اور نظیر میں ایک ایسی صفت موجود ہے جو اس کی کئی ایک فنی کمزوریوں کی تلافی کر دیتی ہے۔ یہ اس کی بے پناہ قوتِ حیات ہے۔ اس کی سیمابی طبیعت نے حقیقت نگاری سے مل کر اس کے کلام میں زندگی کی ایک دوامی روح بھر دی ہے۔ اس کی کم سے کم دلچسپ نظم بھی زندگی کی حرکت سے خالی نہیں ہوتی اور اس لئے وہ کبھی اجیرن یا بالکل بیزار کن نہیں ہوتا۔ انگریزی ناولسٹ ڈکنز کی طرح نظیر بھی جو ربط اور یک رنگی فن کے ذریعے پیدا نہیں کر سکا وہ اس کی زندہ دلی اور ان تھک زندگی کی تڑپ پیدا کر رہی ہے۔

آخر میں ہم نظیر کے جنسی رجحان کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ یہ موضوع ویسے تو ایک مستقل مضمون کا طالب ہے لیکن یہاں ایک دو باتیں خاص طور پر ذکر کے قابل ہیں۔ نظیر جیسا صوفی منش جس نے دنیا کی بے ثباتی اور بزرگانِ دین کی نعت و منقبت میں اتنی نظمیں لکھیں، جگہ جگہ کمال بے باکی سے شاہدانِ بازاری کا ذکر کرتا ہے۔ وہ اُن کی زندگی سے نہ صرف پوری طرح واقف معلوم ہوتا ہے بلکہ اس میں بہت دلچسپی لیتا ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں مختلف طبقوں کے حالات بیان کرنے کا موقع ہوتا ہے وہ اس محبوب طبقے پر نسبتاً ضرورت سے زیادہ جگہ صرف کرتا ہے۔ "انسانی صحبت" کا اول تو اس میں کوئی ذکر ہی نہیں اور جہاں

کہیں ہے بھی تو وہ اس کے لئے بازاری لطف انگیزی سے زیادہ نہیں[1]۔ اس نے محبت پر کوئی نظم نہیں لکھی لیکن جل ترنگ اور ریتیلی بازی پر لکھی ہیں۔ کیا نظیر کا دل محبت کے جذبے سے خالی تھا؟ (دنیا کا کوئی بڑا شاعر اس جذبے سے بیگانہ محض نظر نہیں آتا) اس کے علاوہ نظیر کئی جگہ اپنی "مردانگی" کا علی الاعلان اظہار کرنا چاہتا ہے۔ وہ یہ کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے کہ عام لوگوں کی تو لسنت ہوتی ہے لیکن "یاروں کا ہے لسنتا" ع اب بھی ہمارے آگے یارو جوان کیا ہے۔ یا ع اوروں نے کھیلی ہولی یاروں نے کھیلا ہولا (نظیر کا ہولا شاعر سے باغی ہیجڑوں کے ایک گروہ پر زبردستی رنگ پھینکنے اور انہیں اپنا زور بازو دکھانے پر مشتمل ہے۔) ان نظموں کا نظیر کی شخصیت سے کیا رشتہ ہے؟ کیا یہ محض فرمائشی ہیں یا نظیر کے ذہن و قلب کے کسی اصلی پہلو کو ظاہر کرتی ہیں؟ ان کے ساتھ نظیر کی ازدحام پسندی کو لیجیے۔ نظیر تنہائی سے گھبراتا تھا اور اس کی نظموں کا بہت بڑا حصہ ازدحامی تقریبوں۔ تہواروں، میلوں وغیرہ سے متعلق ہے۔ جہاں کہیں وہ ہجوم میں لوگوں کے برتاؤ کا ذکر کرتا ہے اس کا مشاہدہ بے حد دلچسپ اور صائب ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کو اس کے مذہبی رجحان کے ساتھ یک جا کرنے سے شاید کوئی کرن ایسی نظر آجائے جس کی روشنی میں نظیر کی شاعری کی تخلیقی تحریک کے متعلق زیادہ صحیح واقفیت مل سکے۔

کیا ان باتوں سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ نظیر کے نفس کا جنسی پہلو تخریب آلود یا غیر مطمئن تھا اور اس کی تسکین کے لئے وہ اپنے کلام میں اس پہلو کی افراط و تفریط سے نہ بچ سکا لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی طبیعت میں سنجیدگی کی آمیزش تھی اور وہ مثالی عنصر بھی جو ہر حقیقی شاعر کے تخیل کا جزو ہوتا ہے اس میں مفقود نہ تھا۔ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شخص میں نوعی بے نظمی کی وجہ سے ہمت کی کمی پیدا ہو جائے اور اس کے ساتھ ہی وہ سنجیدہ مزاج بھی ہو تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ انسان تنہائی پسند اور زندگی سے بیزار ہونے لگتا ہے، اور اکثر ایک موہوم قسم کی پاکیزہ محبت کی تمنا اپنے میں پیدا کر لیتا ہے یا ہر شے کی ناپائیداری کے خیالات اس کے ذہن میں بار پا جاتے ہیں لیکن اگر طبیعت میں جولانی ہو اور قوت حیات بہت زیادہ ہو تو آدمی تنہائی سے گھبرا کر ہجوم اور عملی زندگی میں اپنے کو گم کر دینا چاہتا ہے، تاکہ انفعال کا جذبہ اور اپنی کمزوری کا خیال اسے پریشان نہ کرے۔ کیٹس کے ساتھ وہ بھی جان لیتا ہے کہ اس دنیا میں سوچنا غم اور یاس سے اپنے آپ کو معمور کرنا ہے اور اس لئے وہ سوچنے سے اجتناب کرتا ہے۔ نظیر کی طبیعت قوت عمل سے پُر تھی ــ "راگ سے جیسے باجا"۔ ذوق حیات کا چشمہ اس میں ہمیشہ کھولتا رہتا تھا۔ اس لئے اس نے دوسرا راستہ اختیار کیا اور تنہائی کی بجائے ہجوم اور سکون کی بجائے حرکت میں پناہ لی۔ اس کے دل اور دماغ پر ایک زبردست خانہ بدوشانہ اثر متمکن ہو گیا تھا جو اسے ہمیشہ حرکت پر مجبور کرتا رہتا تھا۔ نظیر کی تمام ذہنی زندگی حرکت ہے۔ اگرچہ اس میں کوئی باقاعدہ روانی نظر نہیں آتی، یہ ایک نقطے سے دوسرے نقطے تک ارتقائی کیفیت کو ظاہر نہیں کرتی، لیکن آپ اسے مختلف نقطوں کے گرد کود پھاند کہہ سکتے ہیں۔ زندگی کا یہ ناچ جس میں ترتیب اور حسن کاری کم ہے اور دل یا ضمیر کی آوازوں کو کم کر دینے کی کوشش زیادہ ــ نظیر کا عام ذہنی انداز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نظیر ڈرتا رہتا تھا کہ اگر ایک لمحے کے لئے بھی وہ ساکن یا ساکت ہو گیا تو فکر کے مسموم بادل اس پر چھا جائیں گے۔ یہ نظیر کے فن کی ایک پابندی ہے لیکن اس کے تجربے کا لازمی جزو۔ اس دائمی حرکت کی ضرورت نے نظیر کی ذہنی جولانگاہ کو سماج کے ایک خاص حصے کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ "رسمیت" میں جمود ہے۔ اور اعلیٰ طبقے کے لوگ اکثر "رسمیت" کے کشتہ ہوتے ہیں۔ تفکیر میں الم ہے اس لئے دماغی زندگی والوں میں بھی گذر مشکل ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظیر نے اپنا تعلق عوام سے استوار کر لیا اور یہی میرے نزدیک اس کی "عمومیت" کی وجہ ہے۔

لیکن اگرچہ نظیر نے اپنی اندرونی صداؤں کو اس طرح سے خاموش کرنے کی کوشش کی تاہم وہ پوری طرح اپنے آپ سے نجات حاصل نہ کر سکا۔ اس کی طبیعت کی سنجیدگی اور (شاید غیر محسوس) مثالیت اس کے دنیا کے متعلق نظریے میں رونما ہو گئی۔ اسے زندگی کی بے ثباتی کا اس شدومد سے یقین ہو گیا کہ یہ اس کے لئے انسان کے ہر فعل اور ہر حرکت کا پس منظر بن گیا۔ اس کی اپنی محبت کی خواہش نے (جو اکثر اس مثالیت کا جزو ہوتی ہے) مذہبی جوش[2] کی صورت اختیار کر لی اور بجائے "محبت" پر نظمیں لکھنے کے کرشن کی بانسری اور حضرت علی اور سلیم چشتی کی منقبت کے راگ

[1] صرف "جدائی"۔ "خدا کسی کو نہ دکھلائے غم جدائی کا"۔ اور "فراق"۔ "خاک ایسی زندگی پر تم کہیں اور ہم کہیں"۔ یہ نظمیں بھی ایسی ہیں جن میں یہ بازاریت موجود نہیں [2] یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ نظیر کا مذہبی جوش کسی خاص عصبیت پر مبنی نہیں وہ کرشن اور علی دونوں سے عقیدت رکھتا ہے، کرشن سے شاید زیادہ۔ اس کا مذہب جذبہ پرستش کا ایک رنگ ہے۔

الاپنے لگا۔

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی اَدھر دھری　　کیا کیا پریم پریت بھری اُس میں دھن بھری
لَے اس میں رادھے رادھے کی ہر دم بھری بکھری　　لہرائی دھن جو اس کی ادھر اور ادھر ذری

سب سننے والے کہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنہیا نے بانسری

جس آن کانھ جی کو وہ بنسی بجاؤنی　　جس کان میں وہ آؤنی واں سُدھ بُھلاؤنی
ہر من کی ہو کے موہنی اور چِت لبھاؤنی　　نکلی جہاں دُھن اُس کی وہ میٹھی سہاؤنی

سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کشن کنہیا نے بانسری

اب وقت ہے کہ ہم نظیر کا بحیثیت مجموعی ایک مختصر سا اندازہ کر لیں۔ اس کی جگہ اردو ادب میں محفوظ ہو چکی ہے اور اگرچہ قدامت پسند نقاد ابھی اُسے شعرا کی صفِ اول (بلکہ کسی صف میں بھی) جگہ دینے کے لئے رضامند نظر نہیں آتے لیکن ان کا وقت بہت کچھ نکل گیا ہے اور باقی نکلا جا رہا ہے۔ نظیر کو شکسپیر یا ورڈز ورتھ سے جا ملانا[1] بے معنی ہے۔ اس میں جذبات کی گہرائی اور شدت بہت کم ہے، اور تفکیر سرے سے مفقود۔ اس کی محبت بازاری ہے۔ اس کی نظر عرش کی بلندیوں اور تحت الثریٰ کی پستیوں سے بہت ادھر تک بھی نہیں پہنچ سکتی۔ اوتھیلو اور قلوپطرا کے ہیجانی ولولوں سے اُسے واقف سمجھنا پانی میں آگ کو ڈھونڈھنا ہے۔ وہ چیزوں کی صرف ظاہری ہیئت اور حرکات کو دیکھنے کا عادی تھا، لیکن اپنے دائرے میں اس کا مشاہدہ بہت جامع ہے۔ وہ زندگی کے قہقہے اور گریے دونوں سے آشنا ہے اور دونوں کا وجود زندگی میں لازم و ملزوم سمجھتا ہے۔ وہ حقیر سے حقیر چیز سے بھی لطف اٹھا سکتا ہے اور اس لطف کو دنیا کی بے ثباتی اور فنا کے پس منظر کے آگے رکھ کر اپنی ایک شاعرانہ دنیا پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ صنّاعی کے لحاظ سے وہ مکمل نہیں لیکن لفظوں پر بہت قدرت رکھتا ہے۔ اس کی شخصیت اس قدر دلچسپ اور دلکش ہے کہ بے اختیار آپ کو کھینچ لیتی ہے۔ ہندوستانی فضا میں ڈوبا ہوا یہ ہندوستانی شاعر اردو نظم میں ایک بالکل نئے باب کا موجد ہے اور اگرچہ اس کا فوری اثر کچھ نہ ہوا لیکن جوں جوں وقت گذرتا جائے گا لوگ اس کی طبیعت کی اُپج، مشاہدے کی شگفتگی اور تصور کی جدّت کو محسوس کرتے چلے جائیں گے۔ نظیر ایک غیر معمولی انسان تھا اور اس کی پُر لطف آواز میں ایک خاص انداز ہے جو اسے دوسرے شعرا سے ممتاز کر دیتا ہے

ع خدا مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

ظہیر الدین احمد

[1] انگریزی ادب میں نظیر کی شاعری کی مثال [illegible]

بوجھل دِن

میٹھی باتوں والے دِن　　پیاری راتوں والے دِن
بیت گئے ہاں بیت گئے　　پہلے بھولے بھالے دِن
ختم ہوئے ہاں ختم ہوئے　　خوشیاں لانے والے دِن
خوشیاں دل کو آئیں نہ راس　　بیتے ایسے ایسے دِن
اب ہیں ساتھی اب ہیں پاس　　جانے کیسے کیسے دِن
دُھندلے دِن دُکھ والے دِن　　دکھ سے کالے کالے دِن
رِپتا کے متوالے دِن　　تیکھے زہری بھالے دِن
اگنی کے انگارے دِن　　سوکھے سوکھے سارے دِن
سکھ سپنوں سے سُونے دِن　　کیوں بھیجے ہیں پربھو نے دِن؟

بیرن برہا جیسے دِن
جانے کیسے کیسے دِن

بسنت سہائے

بشارت!

نہ فلسفی ہوں نہ شاعر، نہ صوفی و واعظ، ۔۔۔ مجھے تلاشِ حقیقت ہے حق پرست ہوں میں
نہ خانقہ سے تعلق، نہ میکدے سے غرض ۔۔۔ ہوں پھر بھی بیخود و رقصاں کہ حال مست ہوں میں
مری نظر میں ہیں یکساں کنشت و دیر و حرم ۔۔۔ کہ بے نیازِ تمیزِ بلند و پست ہوں میں
حریفِ باطل و طاعت گزارِ یزداں ہوں ۔۔۔ دراز دست ہوں ہمدم! نہ زیر دست ہوں میں
قدم قدم پہ ہے فتح و ظفر کا نقّارہ ۔۔۔ کہ راہِ حق پہ ہوں بیگانۂ شکست ہوں میں
لرز رہے ہیں مری ہاؤ ہو سے قیصر و جم ۔۔۔ عجیب میرا جنوں ہی عجیب مست ہوں میں
غضب ہے میکدۂ ذوق و شوق کی مستی ۔۔۔ مدام زمزمہ برلب سبو بدست ہوں میں
مری نوا سے ملے گا تجھے سراغِ وجود ۔۔۔ کہ ایک زمزمۂ مطربِ الست ہوں میں
دل و جگر کے لہو سے ہے میری مے کی کشید ۔۔۔ خمار سے جو نہیں آشنا وہ مست ہوں میں

اگر ہو شام و سحر ذکرِ حق سے کام تجھے
یقیں ہے مل کے رہے گا مرا مقام تجھے

آثر صہبائی

دو نظمیں

تحریکِ گناہ

پاک بازی، اصلِ ایماں ؟
ایک رنگیں جھوٹ ہے !
پارسا سیرت کا خبطِ دل نشیں
نفس کا دھوکا ہے دوست !
ہاں - لُٹانے دے مجھے اپنی جوانی کی بہار !
اور تو سچّی محبّت کے ترانے گائے جا !

میری محبُوبہ

مِرے عشق کا سب سے رنگیں گداز اُس کی آنکھوں میں ہے !
مری روح کی سب سے شیریں شکن اُس کے ہونٹوں میں ہے !
وہ اک حُور ہے
جس سے شرمائیں پھولوں کے نازک سے دِل !
فرشتوں کی مانند معصوم ہے اُس کا جسمِ حسیں !
وہ اک نُور ہے
جس سے کرتا ہے یہ سارا غم گیں جہاں
اکتسابِ طرب !

عظیم قریشی

شادی

جیسے ہی لال پیلی جھنڈیوں کی قطاریں اور رنگین کھمبے نظر آنے لگے میں نے تانگہ رکوا کر اترنے کی تیاری کی۔

"ابھی تو بہت دور ہے سرکار!" تانگے والا گھوڑے کو چابک سے سہلا کر بولا۔

"رہنے دو، بس۔ لو۔ کتنے دام ہوئے تمہارے؟" میں نے چونی دیتے ہوئے کہا۔

"گیٹ تک چلوں؟" وہ چونی داب کر بولا۔

"نہیں۔"

میں اتر پڑی۔ گدھے کو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ راجہ کالی چرن کے یہاں تانگے میں آنا کس قدر رویسا ہے۔ ذرا غور کیجئے تو پتہ چلے کہ اگر مانگے کی سب موٹریں عین موقعے پر غائب ہو جائیں اور کرائے کی ٹیکسی ڈھونڈے نہ ملے تو کیسی مصیبت ہو جاتی ہے۔

بھرے ہال کے سامنے ٹانگیں تھرتھرانے لگیں۔ خیر سے مسٹر دوبے اپنے مخصوص قہقہے کو دباتے ہوئے استقبال کو ہل گئے۔

"آپ آگئیں؟ میں کار لے کر جانے ہی والا تھا۔"

میں اپنی جلدی پر پچھتائی، تانگے کے جھٹکوں کو کوستی، آگے بڑھی۔ ہال جگ مگ کر رہا تھا۔ فرش پر بیر پھیلے جاتے تھے۔ آنکھوں کے سامنے ننھے ننھے تارے تھرکنے لگے۔ دور کہیں چھپا چھپا یا ارغنون دھیمے اور میٹھے میٹھے سروں میں بج رہا تھا۔ میری ناتجربہ کار آنکھوں کے لئے یہ الف لیلہ کے کسی پرستانی سین سے کم نہ تھا۔ مسٹر دوبے نہ جانے کیا بڑبڑائے جا رہے تھے، میں تو نئی نئی تراش کے جمپروں کو تکتی، ساڑیوں کے رم جھماتے جھول دیکھتی، بہی چلی جا رہی تھی۔ اور دوبے کے کھنکے دار بے لوچ قہقہے ذرا جگا دیتے تھے۔

کسی نے مجھے پیچھے سے کھینچا اور میں سیلیا کو دیکھتے ہی گھوم پڑی۔ اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے نہ جانے کون صاحب جلدی سے اچک کر کرسی خالی کر گئے اور میں بغیر شکریہ ادا کئے بیٹھ گئی۔ دوبے کے قدم آگے نکل گئے۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں راہ میں ہی ٹپک گئی، ذرا کے ذرا ان کا ہاتھ سر کھجانے کے لئے اٹھا مگر پھر وہ مہمانوں کے ریلے کو سنبھالنے کے لئے بڑھ گئے۔

سیلیا نے بعد میں قاعدہ بتانے کا وعدہ کر کے مجھے بٹے ہوئے پتوں کی گڈی پکڑا کر کھیل شروع کر دیا۔ نہ جانے ہم کیا کھیل بڑی تندہی سے کھیلنے لگے۔ بس قہقہے زیادہ لگانے پڑتے تھے اور ہاتھ کم بنتے تھے۔ وہی صاحب جو کرسی دے کر پاس والے کی کرسی کے بازو پر بیٹھ گئے تھے از راہ کرم مجھے بتانے لگے۔

"ہیں۔ ہیں، یہ کیا چل رہی ہیں، کٹ نہیں جائے گا؟" وہ میرے ہاتھ سے پتہ لے کر بولے۔

میں قطعی نہ سمجھی کہ کیا کٹ جائے گا۔ اور ان کی اس گستاخی پر غور کرنے لگی جو انہوں نے پتا چھین کر کی تھی۔

"آپ یہ چلئے۔" وہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر بتانے لگے۔

"بھئی بتانے کی نہیں ہے نورا!"

لیکن بتانے کے خلاف جہاد کرنے والے میرے لئے زبردست معمہ حل کر گئے یعنی یہ کرسی دینے والے صاحب نورا تھے۔ کون نورا! یہ مجھے اسی وقت معلوم ہوا ٹینس کے بہترین کھلاڑی، آئی۔ سی۔ ایس کے کامیاب رکن، سوسائٹی کی جان، دوستوں کے ٹھیکے دار۔ اور نہ جانے کیا الم غلم۔

اور وہ برابر میرے پتے چلنے لگے۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ اگلا پتا پکڑتے میں نے خود ہی جلدی سے ڈال دیا اور وہ صرف میری انگلی نوچ کر رہ گئے۔ سب زور سے ہنسے اور انہوں نے بھی معافی مانگی، بڑی معصومیت سے۔

اِس کے بعد ہم لوگ اُس سے بھی اوندھا اور دیوانہ سا کھیل چند گولیوں اور ایک چوکھٹے کی مدد سے کھیلنے لگے۔ مسٹر دوبے مہمانوں کو شاید بانک چکے تھے چونکہ وہ بھی اپنے مخصوص قہقہوں سے کھیل کو اور بھی بگلائے دے رہے تھے۔

اس پر میں نے بعد میں غور کیا کہ سارے ہال میں سوائے نور کے سب ہی سیاہ ڈنر سوٹ میں جکڑے ہوئے تھے۔ مجھے یہ معلوم کرکے ذرا بھی تعجب نہ ہوا کہ نور سیدھے ٹینس کورٹ سے پکڑ کر لائے گئے ہیں۔ اور سفید پتلون اور سبز قمیص کی معافی کے لئے اُن کا ریکٹ اور مفلر وغیرہ سامنے ہی میز پر رکھا ہوا تھا۔ بار بار مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر رہا تھا کہ آخر آج ڈنر پر سب کے لئے سبز قمیص اور سفید پتلون پہننا لازمی کیوں نہ رکھا گیا میں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اگر اب کے شاید نینی تال جانا ہوا یا مسوری گئی تو سفید پتلون اور سبز قمیص شام کو پہننے میں کیا صرف ہوگا۔

ڈنر اس قدر زیادہ دلچسپ رہا کہ جلد ہی مجھے وہ پریشانی جو چاندی کے بوجھل چمچوں کو قابو میں لانے میں اُٹھانا پڑ رہی تھی غائب ہوگئی۔ مسٹر دوبے جو بالکل قریب ہی بیٹھے تھے بار بار گذرے ہوئے کھیل کے بھدے پن کا ذکر کرکے قہقہے چھوڑ رہے تھے۔ نور کا بھی ذکر آیا۔ وہ ایک بھورے بالوں والی ہلکی پھلکی چھوکری سے کچھ اس انہماک سے باتیں کر رہے تھے کہ چاندی کے چمچے مجھے پھر بے ڈول، بڑے اور بوجھل معلوم ہونے لگے۔ مسٹر دوبے نے کئی کئی بار لوگوں کو چمچے اور چھری کے جھٹکے سے متعارف کرایا۔

"یہ مسٹر سنگھ ہیں۔ ایم۔ ای ڈی اور وہ" آلو کی نوک سے اشارہ کرکے کہنے لگے "مسٹر ۔۔۔۔ آں ۔ وہ مختار" مسٹر مختار بُت کی طرح خاموش، ذرا پختہ سن کے دراز قد انسان تھے۔ جب ہم لوگ ناش کھیل رہے تھے اس وقت بھی وہ دور میز سے ٹیک لگائے نہ جانے کیا سوچ سوچ کر دھواں اُڑا رہے تھے۔ اُن کا لکڑی کے کاروبار کا کچھ جھگڑا تھا۔ کئی دفعہ میں نے انہیں اپنے گروہ کی طرف بلکہ خود اپنی طرف دیکھتے دیکھا لیکن پتہ نہیں کیوں وہ ویسے ہی غیر دلچسپ رہے۔

"بڑا شریف آدمی ہے بچارا آٹھ چار جگہ بیوپار چلتا ہے اس کا" مگر میں مرعوب نہ ہوئی۔ اور ڈنر کے بعد عجیب کھیل شروع ہوئے۔ ہم دو دو ہو کر کھڑے ہوگئے۔ یہاں تک کہ راجہ صاحب، جب میرے ساتھی بنائے گئے تو وہ بھی مسکراتے ہوئے دائرے میں آگئے۔ ہم لوگ کرسیوں پر بیٹھ گئے اور ہمارے ساتھی پیچھے کھڑے ہوگئے۔ مسٹر دوبے اپنی خالی کرسی کی پشت پکڑے اپنے مخصوص قہقہے لگا رہے تھے۔

"اچھا سنئے" سیبیل نے تالی بجا کر تھیئٹر کے مینجر کی طرح سب کو متوجہ کرکے کہا۔

تھوڑی دیر کے لئے کھیل بالکل اودھم میں تبدیل ہوگیا۔ نور اپنی کرسی والی بھورے بالوں والی دبلی حسینہ سے کچھ جھک کر کہہ رہے تھے۔ اور اُس نے ہنس کر آہستہ سے تھپڑ اٹھایا ۔۔۔۔۔ انور سیدھے کھڑے ہوگئے۔ اس عرصے میں میں نے کھیل کے قواعد بھی نہ سنے۔ مگر دیکھا کہ خالی کرسی والا آنکھ کے اشارے سے دوسری کرسیوں پر بیٹھی ہوئی مورتیوں کو بلاتا ہے اگر اُس کے پیچھے والا ذرا ہوشیار نہ ہوا اور عین وقت میں اُسی پکڑ نہ لے تو وہ خالی کرسی پر نظر آتی ہے اور خوب غل پڑتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نور کی بھورے بالوں والی لڑکی دوبے کے سامنے کرسی پر آڑی بیٹھی اُن کے سریلے قہقہے سن رہی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی۔

"بھئی سب کو خالی کرسی والے کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے" نور نے کہا اور اپنی سیاہ پلکوں کو جھپکایا۔ نور نے آہستہ سے بائیں آنکھ کے کونے کو دبایا اور اس سے قبل کہ سیبل اُٹھے اُس کے زبردست ساتھی نے اُسے جکڑ لیا۔ سب پھر خاموش بیٹھ گئے۔ نور نے پھر اشارہ کیا لیکن شاید مجھے میں نے نیچے پڑے ہوئے قالین کے نقش و نگار کو گھورنا شروع کیا۔

نور بولے "مسٹر دوبے۔ یہ کھیل کے قانون کے خلاف ہے کہ خالی کرسی پر کوئی ۔۔۔۔۔" راجہ صاحب تو جیسے سو رہے تھے۔ وہ شاید بالکل ہی کھیل کو سمجھنے کی کوشش نہ کر رہے تھے اور جب میں اُٹھ کر نور کی کرسی پر بیٹھی تو وہ ویسے ہی قریب والی کرسی پر بیٹھی ہوئی لیڈی ڈاکٹر سے اپنی بہو کی بیماری پر پُر زور مباحثہ کر رہے تھے۔ میں کھیل کے خلاف لیکن شریک ہی رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں کھیل میں جان پڑ گئی۔ مسٹر مختار کی کرسی خالی ہوئی اور تالیوں اور قہقہوں نے کان پھاڑ دیئے۔ اُن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

"مختار صاحب۔ بری خالی ہوئی ۔ یہ تو ۔۔۔۔ ہی ہی۔ ہی" دوبے ہنسے۔

سب جیسے مختار صاحب کو چھیڑنے پر تلے ہوئے تھے کوئی اپنا ساتھی دینے کو تیار نہ تھا

"ناصاحب"، ایک موٹے سے انجنیر صاحب اپنی کرسی کو خالی ہونے سے روکتے ہوئے بولے۔ "مختار اس کی دوستی نہیں۔"
اور جیسے ہی میں اٹھنے لگی نور نے جھپٹ کر پکڑ لیا۔
"اُوہو آپ سمجھیں میں سو رہا ہوں ـــ خوب۔" میں خاموش بیٹھ گئی۔ بھورے بالوں والی سے باتیں کرنے کی کچھ تلافی ہو گئی!
"معاف کیجئے گا۔ گستاخی۔ مگر ابھی آپ نہیں جا سکتیں ـــ جب میری باری تھی تب تو آپ جیسے دیکھ ہی نہیں رہی تھیں ...." نور پھر مجھے روک کر بولے۔
میں اور نور تھوڑی ہی دیر میں باتیں کرنے لگے۔ اُس نے بتایا کہ نیلی یعنی اُسی بھورے بالوں والی لڑکی نے بتایا کہ میں بھی ٹینس کھیلتی ہوں۔ میں نے اُن کی ٹینس کی دعوت بالکل بے خبری میں قبول کر لی۔
چونکہ میں بڑے غور سے یہ سوچ رہی تھی کہ وہ شاید نیلی سے میرے ہی متعلق پوچھتے رہے ہوں گے۔
نیلی سے ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ کس قدر روشن دماغ ہے اُس نے مجھے ودّبے کے یہاں ٹینس کھیلتے دیکھا تھا۔ مجھے فخر تھا کہ مجھے وہ یاد رکھ سکی۔

~~~

رات بھر میں دعوتوں، سبز قمیصوں اور ٹینس کے الجھے سلجھے خواب دیکھا کی۔
شام کو نور خود کار لے کر آ گئے۔ میں ڈیڑھ گھنٹے سے تیار بیٹھی تھی۔ میں شاید زندگی میں بہترین کھیل کھیلی۔ کم از کم نور کا تو یہی خیال تھا۔
نور نے باقاعدہ ایک ٹینس کلب قائم کر دیا۔ سیلیا اور دو چار بنے فکرے ممبر بنے، بڑی تگڑی فیس رکھی گئی۔ مگر ادا کرنے کی نوبت ہی نہ آئی۔ چند ہی روز میں سارے ممبروں کو روگ لگنے شروع ہو گئے۔ سیلیا کو سخت زکام ہو گیا۔ ایک دوسرے صاحب کو ضروری کاموں کی بھرمار رہنے لگی مگر ہم دونوں جی چھوڑ کر کھیلتے، روز کھیلتے۔ مہینوں کھیلتے رہے۔
نور کس قدر دلچسپ انسان ثابت ہوئے! ہم گھنٹوں بکواس کرتے اور ذرا بھی نہ اُکتاتا۔ انہوں نے کئی خوبصورت اور کارآمد کتابیں دیں۔ اُن کے تحفوں سے جی گھبرا گیا۔ میری کئی تصویریں ان کے پاس بڑی کی ہوئی رکھی تھیں۔ لیکن بچوں کی طرح چھپائی ہوئی اور جب میں نے دیکھ لیں تو باتیں بنانے لگے۔

مسٹر ودّبے کس قدر شوقین طبیعت تھے۔ انہیں اپنی شادی کا دن منانے کا جنون تھا اور اوپر سے ہوا بیٹا، زبردست دعوت دے ڈالی اور سیلیا کو پہلے ہی سے لینے کے لئے بھیج دیا۔ میں نے شام کو نور کے ساتھ ٹینس کا پختہ وعدہ کیا تھا۔ آج وہ آٹھ دن بعد دورے سے جب چڑھتے ہوئے لوٹے اور یہ معلوم ہوا کہ میں ودّبے کے یہاں ہوں تو تنتناتے آئے۔ "آپ اپنے وعدے تو خوب یاد رکھتی ہیں!" وہ کڑوا منہ بنا کر بولے۔
"ارے سیلیا ادھر ـــ یہ رہی تمہاری سہیلی۔" ودّبے میرا کندھا ہلا کر چلائے اور بات کاٹ دی اور سیلیا مجھے وہی بے وقوفوں والا چھکے کا کھیل کھلانے لے گئی۔ مجھے موقعہ بھی نہ ملا کہ نور صاحب کا مزاج تو پوچھوں۔
"تم نیلی سے تو ملی ہو؟" میں نے چھکے میں گولی گھما کر کہا۔
"کون نیلی ہیزر؟ ہاں ششش بے وقوف ہے وہ۔" سیلیا گولی تاکتی ہوئی بولی۔
"کیوں؟ کیا کی اس نے بے وقوفی؟" میں نے پوچھا۔
"ارے! جیسے تمہیں کچھ معلوم نہیں ـــ یہ نور صاحب..." وہ ہکلا گئی کیونکہ نور جیبوں میں ہاتھ ڈالے سر پر سوار تھے اور تیکھی چتون سے گھور رہے تھے۔ ہم چپ ہو کر کھیلنے لگے۔
"اگر آپ گھر جانا چاہیں تو کار حاضر ہے" نور نے اُسی روٹھے انداز سے کہا۔
"ضرور بشرطیکہ آپ پہنچا آئیں۔" میں نے ہنسی روک کر کہا۔ اُن کی روٹھی ہوئی شکل اور بھی دلچسپ ہو جاتی تھی۔ ہم خاموش روانہ ہو گئے۔ نور اسی طرح منہ پھلائے بیٹھے رہے۔
"بہت غصہ ہے آج آپ کو؟" میں نے اُن کو بغیر دیکھے کہا، یوں ہی چھیڑنے کو۔
"کیا کہہ رہی تھی سیلیا؟" وہ سختی سے بولے۔ ؟
"کچھ نہیں آپ آ گئے ـــ اور ـ وہ ـــ" نور نے ایک لمبی سانس لی۔
انہوں نے مجھے خود ہی بتا دیا کہ انہیں اس ذکر سے کیسی نفرت تھی۔ نیلی سے انہوں نے کبھی کوئی غرض نہ رکھنی چاہی مگر وہ نہ جانے کیوں پیچھے لگی ہوئی تھی اور یہ..... یہ اس قسم کی باتیں ہی اُن کی شان میں بڑی کونت دیتی ہیں۔
~~~

"مگر اس میں بچوں کی طرح چڑنے کی کیا بات ہے! آپ لڑکی تو ہیں نہیں جس کے لئے کسی دوسرے کا پسند کرنا بھی موٹی سی گالی ہو"

"ہوں" انہوں نے طنز سے ہونٹ سکیڑ کر کہا۔ "اچھا چھوڑو گی بھی اب اس قصے کو!" وہ ایک دم اُکتا کر بولے۔

"کل شام کو کہاں تشریف لے جانے کا ارادہ ہے! اگر تکلیف نہ ہو تو ——— خیر وہ بیچ تو پورا کرنا ہی ہے"۔

"وہی جس میں آپ ہار رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہونہہ! ہار رہا تھا!"

"اور کیا! گویا آپ بھول گئے؟ آپ اتوار کو ہار ہی تو رہے تھے"۔

"کونسی اتوار" وہ شرارت سے مسکرائے۔

"وہی جس دن مسٹر مختار کے یہاں گئے تھے"۔

"ہو گی با با، چھوڑو بھی" مسٹر مختار کے ذکر سے نور کے تن بدن میں آگ لگ جاتی تھی۔ انہوں نے کسی دور دراز کے رشتہ دار سے کچھ شادی وغیرہ کے سلسلے میں مجھے بھی شریک کیا تھا۔

"اچھا آدمی ہے بے چارا"

"بہت!" طعن سے بولے۔

"کافی شاندار پارٹی تھی" میں نے پھر کہا۔

"بہت!" وہ دانت بھینچ کر ہنسے۔

"بہت اچھا ٹیسٹ ہے مکان کے بارے میں"۔

"بہوت!!" نور نے جیسے مجھے کاٹنے کے لئے منہ پھاڑ کر کہا۔

تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد نور نے سرمایہ داروں کو الٹی سیدھی سنانی شروع کیں۔ اگر اُن کے پاس روپیہ ہوتا تو وہ کبھی گورنمنٹ کی غلامی نہ کرتے اور گھر بیٹھ کر قوم کی کچھ خدمت کرتے۔ میں نے کچھ تجارت کے لئے کہا تو تمسخر اڑانے کے لئے بہت ہنسی کو روکا اور جھک کر شیشے میں سے دور سیاہی کو گھورنے لگے۔

میں نے نور کو لبھانے کے لئے کبھی بھڑکیلے کپڑوں وغیرہ کو اہمیت نہ دی تھی مجھے جب سے معلوم ہوا تھا کہ وہ سفید اور سادہ کپڑوں پر جان چھڑکتے ہیں میں نے ریشمی کپڑوں کو پہننا بالکل ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے ہاتھ میں صرف سیاہ چوڑیوں کا ایک لچھا تھا۔ باتوں کے درمیان کبھی کبھی میں ایک چوڑی دانستہ توڑ کر اس کے ٹکڑے کر کے پھینکتی جاتی۔

"اُنہوں۔ کیوں توڑتی ہو ———؟" انہوں نے تازہ چوڑی توڑنے پر مجھ سے ٹکڑے چھین کر کہا۔

میں نے باتوں کے جوش میں پھر چوڑی توڑی۔

"پھر ——— !میں کہتا ہوں اب کے توڑی چوڑی تو سب ایک دم توڑ ڈالوں گا۔" یہ کہہ کر انہوں نے زور سے میرا ہاتھ دبا دیا۔ چٹ چٹ بہت سی چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔

"ارے .... بھئی مجھے کیا معلوم تھا میں نے تو یونہی ذرا پکڑا تھا"۔ انہوں نے ہاتھ پکڑ کر کہا اور پھر چھوڑ دیا۔

"ذرا ایک کام تو کرو ———" انہوں نے تھوڑی دیر بعد کہا۔ "ذرا ——— بھئی سگرٹ تو نکال کر جلا دو۔ ادھر ہے ادھر ———" وہ تھوڑی سے داہنی جیب بتا کر کہنے لگے۔

جھک کر سگرٹ کیس تک پہنچنے میں مجھے بالکل آڑا ہونا پڑا۔ میرا چہرہ جھک کر ان کے اتنے پاس آ گیا کہ گرم گرم سانس بالکل کان کے پاس محسوس ہوئی .... وہ اور جھکے مگر رک گئے۔

"نکال بھی چکو" جھنجلا کر بولے وہ بے طرح اپنا ہونٹ چبانے لگے ٹینس کھیلنے میں گیند مس کر کے اُن کی یہی حالت ہوتی تھی۔

میں نے سگرٹ دی، جسے انہوں نے آہستہ سے دانتوں میں پکڑ لیا۔ ان کی قربت، کپڑوں کی مخصوص خوشبو، سگرٹ کی بھینی بھینی مہک، خاموشی میں مل جل کر مجھے نیند سی لانے لگی۔ موٹر آہستہ آہستہ تھرکتی سرسراتی تیر رہی تھی ——— رفتار اتنی بتدریج کم ہو گئی کہ مجھے کار کے رکنے کا پتہ بھی نہ چلا۔ انہوں نے جھک کر میری طرف کی کھڑکی کھولی تو ان کا سر بالکل میری ناک کے پاس آ گیا اور ایک دفعہ تو میں ان کے بازوؤں کے حلقے میں آ گئی ان کا ہاتھ ایک لمحے کو رک گیا .... مگر ساتھ ساتھ کھڑکی کھل گئی اور میں باہر تھی ... وہ پھر ہونٹ چبا رہے تھے۔

جب بستر پر لیٹی تو جسم ٹوٹ رہا تھا۔ ایک عجیب مسرت بھری تھکن دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی .... راجہ صاحب کے پوتے کی سالگرہ سے لے کر آج تک کے واقعات سینما کی تصویروں کی طرح بار بار ناچ رہے تھے۔ اُس دن انہوں نے ادب سے کرسی خالی کر کے مجھے جگہ دی تھی .... اور ابھی تھے ہزار دل۔ اس دن مختار کہاں تھے؟ ..... بے وقوفوں کی طرح دھواں اڑا رہے تھے! اور فرنیچر کا تخمینہ لگا رہے تھے! مجھے نیلی کا بھی خیال آیا! غریب لڑکی! مجھے اس پر

بہت رحم آیا۔ بے رخی تو دیکھو ملتے تک نہیں اُس سے اِنیلی کو مجھ
سے تو ملنے کا کوئی حق نہیں۔ میں نے تو نہیں کہا کہ تم اُس سے نہ ملو۔
ان کی عادت ہی عجیب ہے۔ کتنے مہینے ہو گئے ہیں نے انہیں کسی
لڑکی سے ملتے جلتے نہ دیکھا۔

مجھے پھریری آ گئی جب میں نے سوچا کہ کیسا لگتا ہوگا جب جسے
چاہو وہ کسی دوسرے سے محبت کرنے لگے میں نے ارادہ کر لیا کہ نیلی سے
انہیں ملنے پر مجبور کیا کروں گی۔ اُس کے کچھ تو زخم بھر جائیں گے! اور سچ کہتی
ہوں اس میں غرور کا شائبہ بھی نہ تھا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اس دفعہ دہلی سے ضرور انگوٹھی لے آئے ہوں
گے یقیناً اُس میں سبز نگ ہوگا جس کے چاروں طرف ہیرے جھلملا
رہے ہوں گے۔ اندھیرے میں مجھے اپنی بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے پاس
کی انگلی تو نظر نہ آئی لیکن ہیروں کا حلقہ جس کے بیچ میں سبز نگ دمک
رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے چکّر کھانے لگا۔ کچھ عجب نیم خوابی کی سی کیفیت
تھی۔ دھندلی دھندلی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھیرے لگا رہی تھیں۔
ان کا سراپا بھی مجھے بالکل قریب تکیہ کے پاس جھکا ہوا محسوس ہو رہا تھا
اور ایک دم سے جیسے میں ایک خوبصورت آراستہ گھر میں انتظام
خانہ داری میں منہمک نوکروں کو احکامات دیتی نظر آنے لگی۔ اسی چہل
پہل اور پر نور فضا میں ایک ننھا سا بچہ جس کے بال بالکل نور کی طرح
گھومے ہوئے اور گھنے تھے اور ویسے ہی بھرے ہوئے خوش رنگ ہونٹ
مجھے اپنے بہت قریب محسوس ہوا..... اور میں سوچنے لگی کہ یہ کھلونا
بڑا ہو کر سبز قمیص اور سفید پتلون پہن کر کتنی اچھی ٹینس کھیلے گا!

شام کو ذرا دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی نور نہ آئے۔ میں نے
چاہا کچھ دیر اخبار ہی دیکھ لوں یا سویٹر ہی بنوں مگر رو ہانسی ہو گئی اور جی
نہ لگا کہ اتنے میں نور کی موٹر کا ہارن آہستہ سے بجا۔ بس سے جیسے کسی نے
سر سے پیر تک بجلی لگا دی..... وہی سبز قمیص اور سفید پتلون پہنے،
گلے میں مفلر جھولتا بڑی شان سے ریکٹ ہلاتے جناب داخل ہوئے۔
اور آتے ہی بے ڈھنگوں کی طرح کرسی پر لیٹ گئے۔

"اجازت ہے؟" وہ لیٹے لیٹے جوتا کھولنے کا ارادہ کر کے کہنے لگے۔

"نہیں" میں نے رعب سے کہا۔

"ارے۔ بھئی یہ کیوں؟" وہ تعجب سے بھنویں چڑھا کر بولے۔

"یوں کہ ـــ" میں نے نیچے بیٹھ کر ان کے جوتے کھولے۔

وہ آہستہ سے اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ جیسے کسی نے ان کے کہیں چوٹ
مار دی۔ غور سے کچھ دیر مجھے دیکھتے رہے ـــ پھر میری مسکراہٹ
اور کھسیانہ پن پر خود بھی ہنس پڑے۔ اُن کی آنکھوں سے سچی الفت ٹپک
رہی تھی۔ وہ انگڑائی لے کر پوری کرسی پر پھیل گئے۔

"ارے ـــ میرا سوٹ کیس ـــ" انہوں نے چونک
کر کہا۔

"کیسا سوٹ کیس؟" میں نے پوچھا، لیکن فوراً ہی مجھے دروازے
کے پاس نظر آ گیا۔ میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کیا ہوگا اس میں؟ میرے
تخیل کی پھرتیلی آنکھوں نے اس میں رکھی ہوئی زرّیں ساڑیوں کی تہوں
میں آنکھ مچولی سی کھیلنا شروع کی.... لیکن بغیر ابا جان اور گھر
والوں کی رائے کے میں ـــ خیر چیزیں لینے میں تو انکار نہ تھا....
مگر میری مادّی آنکھوں نے سوٹ کیس کھلنے کے بعد اس میں ایک
خوبصورت مردانہ نائٹ سوٹ اور دو ایک الٹی سیدھی چیزیں دیکھ کر
پھٹ جانا مناسب سمجھا۔ اور کیا کرتیں۔؟

"کیا آپ کہیں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

وہ ذرا حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ پھر ہنس دئیے، میں بھی
ہنس دی۔

بولے "ہاں۔ ایک بے وقوف کے یہاں" اور پھر ہنسے۔

"تم بچہ ہی ہو!"

انہوں نے کپڑے ہٹا کر ایک قیمتی گھڑی نکال کر میری کلائی پر
باندھ دی۔

"آپ آخر ـــ" میں نے ذرا حجت کی۔

"تم میری ہو!" انہوں نے خود مختاری سے کہا۔ ان کی یہ ادا مجھے
بہت پسند تھی۔ "بولو؟"

"مگر ابا جان کو لکھئے" میں نے اُن کا بازو تھام کر کہا

"ارے!" جیسے وہ اُچھل پڑے۔

"بغیر ان کی مرضی کے شادی کیسے ہو سکتی ہے؟" میں نے گھڑی سے
کھیلتے ہوئے کہا۔

وہ جیسے سوچ میں پڑ گئے۔ مجھے بہت دل میں ہنسی آئی عقل مند
کہیں کے! اس میں اس قدر فکر کی آخر کیا بات تھی؟ چاہے ابا جان نہیں

دل سے پسند کریں۔

"آپ لکھئے وہ مان جائیں گے۔" میں نے فوراً "نہ" لگا کر پھر زور دے کر کہا۔ "وہ انکار نہیں کر سکتے۔"

"انکار!" وہ بالکل ہی چونک گئے۔

"مگر ان کی مرضی بغیر شادی ———"

"شادی؟" اُن کے گھٹے گلے سے نکلا اور ہنسی چکرائی۔ "شادی کا کون بے وقوف ذکر کر رہا ہے؟"

"پھر؟ ——— پھر ———" میرے پیر کانپ رہے تھے۔

"پھر ——— پھر ———" وہ ہنسے۔ "زندگی! ——— زندگی! ——— ہم جاہل تو ......"

"اور ...... اور ......" میری زبان تالو سے چپٹنے لگی۔

"شادی!" وہ ہنسے۔ "یہ بے وقوفی تو میں کر بھی چکا ......"

میں مجسّم سوال بن کر رہ گئی۔ وہ خود ہی بولے۔

"ڈیڑھ مہینہ ہوا ...... مجبوراً ...... بیّتی سے۔" وہ اداسی سے ہنسے۔

....

اور پھر پرانا محل گرتا ہے بڑھیا اپنے برتن بھانڈے اُٹھا لے۔

اڑا اڑا اڑا وہم آ ......

میرے تخیّل کا بے بنیاد گھروندا ڈھے پڑا۔ ایک دم بھک سے ساری بجلیاں بجھ گئیں۔ اور اس گردو اندھیرے میں مجھے ایک ننھے سے بچّے کی خاموش چیخیں سنائی دیں جس کے بال اور ہونٹ تاریکی کی وجہ سے صاف نظر نہ آتے تھے۔

~~~~~~~~

اب ان سیاہ بدصورت بچوں کی گوڑی ہیں ——— مجھے اکثر وہی ننھا سا گھنے، گھومے ہوئے بالوں اور بھرے ہوئے خوشرنگ ہونٹوں والا بچّہ اپنے سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے ...... مگر مختار صاحب کو یہ کیا معلوم؟

عصمت چغتائی

انتظار

ڈھل رہی ہے رات، تھک کر اونگھتی ہے چاندنی

ٹہنیوں پر رینگتی ہے اوس کی ہلکی نمی،

سیب کے سہمے ہوئے دھندلے شگوفوں کے تلے

پھیکے پھیکے سائے اس اُلجھن کو سلجھانے لگے:

دل کی ہر دھڑکن ہے کیا صرف ایک خوابِ دلنشیں؟

اس نے آنے کو کہا تھا، کس لئے آئی نہیں؟

سو چلا ہے سرد ہونٹوں پر وفا کا نرم گیت

پا رہا ہے دل سرابی آرزوؤں سے فراغ

ہچکیاں لینے لگی ہیں دل کی بے دم خواہشیں

اور دھندلانے کو ہیں آنکھوں کے پاکیزہ چراغ

آشیانوں میں ہیں سوئے طائرانِ نغمہ زا،

پیڑ کے پتّے بھی اب تو تھک تھکا کر سو گئے!

چاند کی آنکھیں بھی گہری نیند سے بوجھل ہوئیں

نرم شاخیں جُھک گئی ہیں چاندنی کے بوجھ سے

اُس نے آنے کو کہا تھا، گرچہ وہ آئی نہیں

روح کو بہلا رہا ہے اب بھی خوابِ دلنشیں!

وشوامتر عادل ایم اے
~~~~~~~~

غزل

ہم تو ڈبو کر کشتی کو، خود ہی پار لگائیں گے
طوفاں سے گر بچ نکلی، ساحل سے ٹکرائیں گے

کہہ تو دیا، الفت میں ہم جان کے دھوکا کھائیں گے
حضرت ناصح! خیر تو ہے آپ مجھے سمجھائیں گے؟

یہ تو سب سچ ہے مجھ پر آپ کرم فرمائیں گے
لیکن اتنا دھیان رہے، لوگ بہت بہکائیں گے

عشق کی نظروں سے چھپنا، کھیل نہیں آسان نہیں
مجھ کو جلووں میں پائیں گے آپ جہاں بھی جائیں گے

چھوڑیئے اس کی حالت پر دل کو، دل دیوانہ ہے
آپ کہاں تک ایسے کی غمخواری فرمائیں گے؟

ناکامی بیکار نہیں، رسوائی کام آئے گی
ان ہی چند لکیروں سے افسانے بن جائیں گے

ان کے آتے ہی میں نے دل کا قصہ چھیڑ دیا
الفت کے آداب مجھے آتے آتے آئیں گے

تیرے میخانے کی قسم، بے مانگے مل جاتا ہے
تیرے ہوتے اے ساقی! ہاتھ کہاں پھیلائیں گے؟

اب میں اس منزل میں ہوں جس میں دعا کرنا ہے گناہ
کچھ نہ زباں سے نکلے گا، ہاتھ اگر اٹھ جائیں گے

تو برباد، جہاں ناخوش، وہ بھی کچھ بیزار سے ہیں
ہم جو اے دل! کہتے تھے نالے راس نہ آئیں گے!

اس نے آنے والوں کا بڑھ کر استقبال کیا
شمع کو یہ معلوم نہ تھا، پروانے جل جائیں گے

میرے سیہ خانے میں کوئی، دلچسپی کی چیز نہیں
آپ کو فرصت ہی کب ہے، آپ یہاں کیوں آئیں گے!

اک دن میری آنکھوں میں ماہر آنسو بھر آئے
غربت گھبرا کر بولی، آپ وطن کب جائیں گے؟

ماہر القادری

حالی، حیاتِ جاوید کی روشنی میں

مولانا حالی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں (دنیائے شعر میں انقلاب پیدا کر کے حالی نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی اور ہمارے سامنے "دلنواز مستقبل" کی ایک دھندلی سی تصویر چھوڑی۔ دُنیائے شعر میں ہی نہیں بلکہ دُنیائے ادب میں حالی کا نام ہمیشہ عزت و عقیدتمندی سے لیا جاتے گا (حالی اردو شاعری میں جس حیثیت کے مالک ہیں تقریباً وہی بلکہ اس سے کچھ زیادہ درجہ ان کا اردو نثر میں ہے۔ حالی کی ذات ایک شاعر، ایک نقاد، ایک سوانح نگار، ایک واعظ اور ایک رفارمر کا مجموعہ تھی۔)

(سرسید کے "نورتن" میں حالی ایک زبردست شخصیت کے مالک ہیں۔ اور اُن کا اپنا طرزِ تحریر علیحدہ ہے۔ وہ سوانح نگار کی حیثیت سے ایک مہتم بالشان ہستی ہیں۔ مولانا کی عبارت نہایت صاف، سادہ اور زوردار ہوتی ہے۔ مگر اس میں آزاد کی سی رنگینی اور مولانا نذیر احمد کی سی نازک اور لطیف ظرافت نہیں ہوتی (عسکری نے تاریخ ادب میں لکھا ہے کہ "حالی گو صاحبِ طرز نہیں مگر بہترین نثاروں میں سے ہیں" یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں (حالی کے طرز میں اس میں شک نہیں کہ سرسید کے طرزِ تحریر کی جھلک بڑی حد تک پائی جاتی ہے۔ مگر اُن کا طرز پھر بھی سرسید سے جُدا ہے) اور عسکری کی یہ رائے ہمیں ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ آج بھی "حالی اسکول" کا نام دنیائے ادب میں مشہور ہے۔ اور یہ فخر صرف مولانا حالی اور مولانا شبلی کے طرز کو حاصل ہے کہ ان کے مقلد ملک میں بہت سے ہیں (حالی اسلوبِ بیان سے زیادہ نفسِ مطلب کا خیال رکھتے ہیں۔ صنائع بدائع کی نہ ان کے یہاں کثرت ہے اور نہ وہ بیجا طور پر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ محض لفاظی اور عبارت آرائی بھی وہ کبھی نہیں کرتے اور عبارت کی ظاہری آرائش سے وہ قطعاً پرہیز کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی عبارت بہت صاف سلجھی ہوئی اور شستہ ہوتی ہے۔ ان میں اگرچہ بلند پروازی نہیں۔ مگر زورِ بیان اور فصاحت سے ان کی نثر مالا مال ہوتی ہے۔ جدید نثر اردو نے ان کو اپنا بڑا حامی اور مددگار پایا۔ اور انہوں نے مرزا غالب اور سرسید کے طرزِ تحریر کو زندہ رکھا) ان کی تصانیف آیندہ نسلوں کے لئے بہترین نمونہ سمجھی جاتی ہیں)۔ مولانا حالی ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے قدیم مدارس میں تعلیم حاصل کر کے وہ کارہائے نمایاں انجام دیئے جن کا ثانی ہنوز تعلیم جدید پیدا نہیں کر سکی۔

(حالی کے پیشِ نظر آزاد کا تشبیہات اور استعارات سے مرصع طرز، اور نذیر احمد کی زبان تھی جس میں فارسی اور عربی تراکیب کی شیرینی کے ساتھ ساتھ دلّی کے ٹھیٹھ محاورات اور ٹکسالی الفاظ کی نمکینی بھی تھی حالی نے دونوں کی ترکیب باہمی سے ایک نئی زبان پیدا کرنی چاہی۔ جو دونوں طرز کے حامیوں میں مقبول اور پسندیدہ ہو۔ لیکن مولانا حالی نے ظاہری خصوصیات کی تقلید کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زبان ایک حد تک پھیکی ہو کر رہ گئی) بعض اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ صفحے کے صفحے پڑھ جایئے نہ جذبات میں کوئی حرکت نہ قلب پر کوئی اثر)۔ مولانا کی زبان سادہ اور یکساں ہوتی ہے۔ اور بعض بعض جگہ بالکل بے نمک اور سپاٹ معلوم ہوتی ہے) وہ اس میدان کے مانند ہے جس میں نہ پہاڑیاں ہوں نہ چشمے نہ درخت ہوں نہ چرند و پرند، نہ گرمی ہو نہ سردی نہ اُتار چڑھاؤ ہو اور نہ گہری گہری گھاٹیاں۔ یا زیادہ صحیح طور پر یہ سمجھنا چاہئے کہ حالی کا طرزِ تحریر ایک نہرِ رواں کی طرح ہے جو ہمیشہ ایک ہی رفتار پر ایک ہی راستہ پر بہتی چلی جاتی ہے جس میں کبھی مدّوجزر پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں اس کے دھارے میں کبھی کبھی شفاف پانی کے ساتھ ہی گدلا پانی بھی آجاتا ہے۔ لیکن اس کی رفتار میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آتا۔

انہوں نے اردو زبان میں سلاست اور روانی ضرور پیدا کی۔

مگر اُن کے طرزِ تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بعض اوقات خالص اُردو میں اپنے خیالات کا اظہار نہیں کرتے تھے اور اکثر الفاظ دُوسری زبانوں کے استعمال کر جاتے تھے۔ انہیں زمانہ کے اثر اور ماحول کے انجذابی تاثرات نے انگریزی الفاظ کے استعمال پر مجبور کر دیا۔ اور وہ ایسے انگریزی الفاظ استعمال کرنے لگے جن کے بجائے اردو میں دوسرے الفاظ آسانی سے مل سکتے ہیں۔ مثلاً۔ ورکس بمعنی تصانیف۔ امیجنیشن بمعنی تخیّل۔ میٹیریل بمعنی مواد وغیرہ، اور یہ مولانا حالی کے طرز کا سب سے بڑا نقص ہے۔ وہ فنِ تنقید کے بادشاہ ہیں۔ مقدمۂ شعر و شاعری اردو لٹریچر میں تنقید کی پہلی اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ تنقید میں ان کی عبارت کا طرز سادہ اور مؤثر ہے۔ مبالغہ سے پاک ہے اور واقفیت سے وہ کبھی تجاوز نہیں کرتے۔ محمد یحییٰ کی رائے ہے کہ حالی کا طرز ہمیشہ مقبول رہے گا۔ (سادگی کے ساتھ ساتھ ان کی زبان میں لوچ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ حالی نے ہماری نثر کو غیر معمولی طور پر فراخ کر دیا۔ ان کی تحریریں پاک صاف سنجیدہ اور متین ہیں۔ وہ مضمون کے اعتبار سے پیرایۂ بیان اختیار کرتے ہیں۔ اور نہایت فصیح اور بلیغ انداز میں اپنے خیالات کو پیش کرتے ہیں۔ وہ واقعات کی تفصیل اور نزاکت سے گھبراتے نہیں بلکہ ان پر قابو حاصل کر کے نہایت خوش اسلوبی سے انہیں ضبطِ تحریر میں لاتے ہیں۔ ان کے یہاں خوبصورت الفاظ اور فقروں کی بازیگری نہیں ہے۔ ان کے خیالات کے سمجھنے میں قاری کو کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ حالی کا پڑھنے والا ان جلوؤں کو بے نقاب دیکھ سکتا ہے جنہیں خود حالی اپنی غیر معمولی بصارت اور چشمِ تخیّل سے دیکھتے ہیں۔ وہ الفاظ کو اپنے خیالات کا تابع کر دیتے ہیں۔ اور اس سلاست اور سادگی میں انشاء اور بیان کی خوبیاں زائل نہیں ہونے پاتیں۔ بلکہ زورِ بیان اور فصاحت کا امتزاج ایک عجیب دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ اور حالی تمسخر اور رکیک باتوں کو کبھی دخل نہیں دیتے۔ حالی کی زبان علمی اور ادبی خیالات کے اظہار کے لئے نہایت موزوں اور مناسب ہے ان کا استدلال قابلِ تعریف ہے۔ وہ تمثیل کے ذریعہ دلائل پیش کرتے ہیں۔

حالی کے جملوں کی ساخت و پرداخت بے رخنہ اور پختہ ہوتی ہے۔ وہ لفظ کو استعمال کرنے سے پہلے اس کی نشست کو مقرر کر لیتے ہیں۔ اور مغربی ادب کو انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ سے بہتر سمجھتے ہیں۔ مولوی (عبدالحق حالی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "اس کی نثر میں جو پختگی، متانت اور حقیقت نگاری ہے۔ وہ کسی دوسرے ادیب میں نہیں پائی جاتی۔۔۔۔ حالی نے اردو لٹریچر میں نئی جان ڈالی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے۔ کہ ادب کی رُوح صداقت اور خلوص ہے۔ محض لفظوں کے داؤں پیچ اور ترکیبوں کے ہیر پھیر سے اثر پیدا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ادیب یا شاعر کی سیرت ہے جو الفاظ میں معانی کا رنگ بھرتی ہے۔" حالی وہ پہلے شخص ہیں جو مغرب کے ان تمام اسرارِ انشاپردازی اور سخنوری پر حاوی ہو گئے۔ جن کے رازہائے سربستہ مغربی زبانوں پر کافی دسترس حاصل کئے بغیر کبھی بے نقاب نہیں ہو سکتے۔ انہوں نے سرسید کے طرزِ انشاء کی خوبیوں کو اور بھی زیادہ چمکایا۔ اور ان کے طرز کی برائیوں کو بالکل اختیار نہ کیا۔)

(حالی کا اسلوب سرسید کے طرزِ تحریر کی ایک جامع، پختہ اور ترقی یافتہ شکل ہے۔ ان کے یہاں فارسی وعربی کے دقیق الفاظ بہت کم ہیں۔ وہ سوقیانہ اور مبتذل الفاظ استعمال نہیں کرتے تشبیہوں، استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کم کام لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ کہیں خود کو جید عالم نہیں ظاہر کرتے) مگر بعض جگہ ادبیت ٹپک ہی پڑتی ہے (وہ شبلی کی طرح طعن و تشنیع کے تیر نہیں چلاتے اور اسی وجہ سے عام مذاق کے مطابق وہ بہت زیادہ مقبول نہیں ہوئے۔ ان میں شوخی اور ظرافت بھی نہیں ان کی متانت بعض بعض موقع پر گراں گزرتی ہے۔ ان کی عبارت میں شاعری اور عبارت آرائی بھی نہیں۔ حالی نے انگریزی طرز کی تقلید سرسید سے بہت زیادہ کی اور اس طریقہ سے کی جو اردو میں کبھی بھی مقبول نہیں ہو سکتا) مثلاً انہوں نے حیاتِ سعدی میں حضرت سعدی علیہ الرحمۃ جیسے قابلِ عزت بزرگ کو لفظ "اِس اور اُس" سے خطاب کیا ہے۔ اصلاً یہ الفاظ ایک سوانح نگار اپنے بچپن کے دوست اور ہمجولی کے لئے بھی نہیں لکھ سکتا۔ کیونکہ سوانحعمری ایک پبلک چیز ہو جاتی ہے۔ اس میں حفظِ مراتب کا خیال رکھنا ضروری ہے۔ یادگارِ غالب اور حیاتِ جاوید میں وہ کبھی بھی حد سے آگے نہیں بڑھے۔ اور دیگر مذہبی تصانیف میں بھی حفظِ مراتب کا خیال برابر رکھتے رہے۔ اور یہی چیز انہیں مولوی نذیر احمد کی طرح حفظِ مراتب کا خیال نہ رکھنے کے جرم میں ماخوذ نہیں ہونے دیتی۔ ان کی تحریر میں اگرچہ سادگی اور یکسانیت پائی جاتی ہے پھر بھی بعض جگہ غیر ارادی طور پر دلکشیاں نمایاں ہو ہی جاتی ہیں جو ان کے اعلےٰ انشاپرداز ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔ ان کا مضمون

"زبان گویا" ایک ادبی شہ پارہ ہے۔ اور اس میں ان کے اعلیٰ انشا پرداز ہونے کا ثبوت ہر جگہ موجود ہے۔ وہ اس خیال کے زبردست حامی تھے۔ کہ اردو کو ہندوستان کی عام زبان بنانا ضروری ہے۔ اور اس لئے وہ ہر جگہ انگریزی اور ہندی الفاظ استعمال کرتے رہتے تھے" سرسید کے بعد اگر کوئی ان کے رنگ میں قلم اٹھا سکتا ہے تو وہ بوڑھے حالی ہیں" غالباً ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ حالی نے سرسید کے طرز انشاء کو ترک کر کے ان کی طرز کی خوبیوں کو اور زیادہ چمکا دیا۔ اور اسی لئے (مہدی کا یہ بیان بالکل صحیح اور برمحل ہے" وہ سخت سے سخت مسائل کو باتوں باتوں میں طے کر دیتے تھے۔ اور یہ سرسید کے اسلوب کا بولتا ہوا عنصر ہے۔ اور اصلاً ادب کا سب سے بڑا وصف بھی یہی ہے۔ کہ سخت سے سخت مسائل باتوں باتوں میں طے کر دیئے جائیں۔ یہ سلاست و نفاست قدرت کلام کی آخری حد ہے جو سرسید اور ان کے بعد حالی کے حصے میں آئی"۔ حالی کے خیالات اور مقالات میں کسی طرح کی جھول جھال یا تذبذب فی الرائے نہیں ہے۔ خالص یک رنگی ہے۔ مہدی افادی لکھتے ہیں " حالی صرف سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں" ہم ان سے اتفاق مطلق نہیں کرتے۔ ان کو بجائے اس کے یہ کہنا چاہئے تھا کہ حالی سوانح نگاری کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔ حالی کا مقدمہ شعر و شاعری ان کے فن تنقید پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کے مقالات اور تقریریں ان کے دیگر فنون پر قدرت کی پُرزور دلالت کرتے ہیں۔ ان کے خطوط ان کی نادر الکلامی کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ وہ صرف سوانح نگاری کے ساتھ چل سکتے ہیں" ان کے کمالات سے اغماض اور ان کے ساتھ ایک قسم کی زیادتی ہے (ہاں حیات جاوید ان کے کارناموں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالی سوانح نگار ہونے کے علاوہ اردو ادب میں صاحب طرز کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔ اگر سرسید پیغمبر نثر اردو ہیں تو حالی نثر اردو کے خلیفہ اوّل ہیں۔ حالی صحیح معنی میں غالب کی اولاد معنوی ہیں۔ اور انہیں سلطنت ادب میں غالب کا ولیعہد کہنا بالکل بجا ہے۔ حالی کا طرز بیان شبلی کی طرح علمی و مذہبی مقالات، تاریخ و تنقید غرض ہر موضوع نثر میں کام دے سکتا ہے عالی ادب کو خواص کے ہاتھوں سے نکال کر عوام تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ حالی کا طرز بھی شبلی کے طرز تحریر کی طرح زندہ طرز ہے۔ اور اردو ادب میں فی زمانہ صرف حالی اور شبلی کے طرز ہی مقبول اور عام طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔ آج کل جب کہ اردو ہندی اور ہندوستانی کی بحث چھڑی ہوئی ہے ہم خود سمجھ سکتے ہیں۔ کہ ان دونوں اسکولوں میں سے کس کا طرز زیادہ مقبول ہوگا۔ حالی کے طرز کے پیروؤں میں مولوی وحید الدین سلیم اور ہمارے مشہور و معروف ادبی لیڈر مولوی عبدالحق خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اور اسی لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ حالی قطعاً غیر فانی ہیں۔

حالی کی اختراع فائقہ حیات جاوید ہے۔ اور اس کی وجہ سے وہ خود زندہ جاوید ہوئے۔ حیات جاوید ایک بہت مفصل جامع اور ضخیم کتاب ہے۔ اس میں سرسید مرحوم کی طویل اور مختلف الاحوال اور کثیر الاشغال اور فیض رساں زندگی کے حالات اس قدر تفصیل کے ساتھ درج ہیں کہ اس کو زبان اردو میں وہی مرتبہ حاصل ہو گیا ہے جو باس ویل کی مشہور کتاب "ڈاکٹر جانسن کی لائف کو انگریزی میں حاصل ہے۔ اس میں سرسید بحیثیت ایک لیڈر اور مدبّر اور رفارمر اور اہل قلم کے دکھائے گئے ہیں سرسید کے ساتھ ان کے اکثر شرکائے کار کے حالات بھی ضمناً اس میں درج کئے گئے۔ حالی نے علاوہ اس کے دو سوانح عمریاں اور بھی لکھی ہیں۔ ایک حیات سعدی اور دوسری یادگار غالب۔ پہلی کتاب کو پڑھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ فن سوانح نگاری ابھی ابتدائی حالت میں ہے۔ اس کے علاوہ پوری کتاب پڑھنے کے بعد قاری کو یہ معلوم ہونے لگتا ہے کہ شیخ کی عظمت کا اثر حالی کے دل پر زیادہ گہرا نہیں ہے۔ دوسری کتاب میں انہوں نے پہلے حصے میں غالب کے حالات زندگی لکھے ہیں۔ اور دوسرے میں ان کی شاعری سے بحث کی ہے۔ ظاہر ہے کہ غالب کی زندگی سیاسی اور سوشل اعتبار سے قوم و ملک کے لئے اتنی اہم نہ تھی جتنی سرسید کی۔ سرسید نے قوم کو جس وقت قعر مذلّت سے نکالا ہے شاید اس سے زیادہ سخت وقت ہندوستان کے مسلمانوں پر کبھی نہ آئیگا ان کا ہفت صد سالہ عروج اور ان کی دیرینہ شان و شوکت اور سطوت بالکل مٹی میں مل چکی تھی۔ اور ہندوستان میں اسلام کا ستارہ ٹمٹما رہا تھا۔ سرسید اچھی طرح جانتے تھے کہ "ہم کو اب دنیا میں محکوم بن کر رہنا ہے۔ اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سُود ثابت ہوں گی" سرسید کی لائف آج کل مسلمانوں کے لئے قابل تقلید ہے۔ سرسید جو راستہ بنا گئے ہیں۔ اس پر چلنے ہی میں ان کی فلاح و بہبودی ہے۔ سرسید کی زندگی سے انسان نہایت ہی قابل قدر نتیجے نکال سکتا ہے۔ ان کی زندگی بتاتی ہے کہ

زمانے کی مخالفت کے باوجود اس سے موافقت کرنا چاہئے اور محکوم قوم ہونے کے باوجود عزت حاصل کی جاسکتی ہے۔ ان کی زندگی خودداری اور سیلف ریسپکٹ کی تلقین کرتی ہے۔ سرسیّد کا خیال تھا کہ قومی تنزل ہی مذہبی تنزل ہے۔ سرسیّد کی زندگی بتاتی ہے کہ دُنیا میں بہت سے تجربے تھوڑی سی تعلیم اور بالکل سچائی سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام دیئے جا سکتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے آدمی کی سوانحعمری لکھنا بڑا ٹیڑھا کام ہے۔ ہندوستان میں لوگ سوچتے ہی رہے کہ سرسیّد کے حالات قلمبند کرکے شائع کر دیئے جائیں۔ مگر اس عرصہ میں کرنل گراہم نے سرسیّد کی وفات سے تیرہ سال قبل ان کی سوانحعمری لکھ شائع کرا دی ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

گر ایک انگریزی اخبار نے اس کتاب پر یہ اعتراض کیا کہ یہ ایک مکمل بایوگرافی ہونے کی دعوے دار نہیں ہوسکتی۔ حالی کا خیال تھا کہ زمانۂ مستقبل سرسیّد کی قدر کرے گا، اور انہوں نے سرسید کی زندگی میں ان کی سوانحعمری لکھنے کا خیال کیا۔ عام طور پر یہ خیال تھا۔ کہ سرسیّد کی زندگی کے حالات لکھنا بہت آسان کام ہے۔ کیونکہ ان کے کارہائے نمایاں مشتہر ہو چکے ہیں۔ گر اصلاً ان کی سوانح عمری اتنی طویل ہوگئی ہے کہ اس کا سمٹنا مشکل نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کے سب واقعات نہایت اہم ہیں۔ اور کسی کو بھی سرسری طور پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ان کی ذات میں اتنی مختلف صفتیں جمع تھیں کہ سب پر روشنی ڈالنا ضروری تھا۔ اور اسی لئے حالی کا بجا خیال ہے کہ ان کی لائف اور بھی زیادہ طویل لکھی جا سکتی ہے۔

حیاتِ جاوید لکھتے وقت حالی کے پیشِ نظر یہ اصول تھے کہ سب حالات مع کمزوریوں اور برائیوں کے قلم بند کر دیئے جائیں اور پھر انہیں کسوٹی پر کس کر ان کی اہمیت دکھائی جاتے مگر چونکہ اُس وقت ہندوستان میں فنِ تنقید بالکل ابتدائی حالت میں تھا اس لئے سوانح نگاری اور فنِ تنقید کا امتزاج یک رنگی کے ساتھ نہ ہوسکا۔ اگرچہ حالی کا ارادہ خود بھی تھا کہ سرسیّد کی زندگی کے حالات پر تفصیل سے نکتہ چینی کی جائے جیسا کہ خود انہوں دیباچہ میں لکھا ہے۔ ”ہم نے جو دو ایک مصنفوں کا حال اب سے پہلے لکھا ہے، اس میں جہاں تک ہم کو معلوم ہوسکیں ان کی اور ان کے کلام کی خوبیاں ظاہر کی ہیں۔ اور ان کے پھوڑوں کو کہیں ٹھیس نہیں لگنے دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

لیکن ایسی بایوگرافی چاندی سونے کے ملمع سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کے سوا وہ انہیں لوگوں کے حال سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے جنہوں نے اس مَوج خیز اور پُر آشوب دریا کی منجدھار میں اپنی ناؤ نہیں ڈالی۔ اور کنارے کنارے ایک گھاٹ سے دُوسرے گھاٹ صحیح سلامت جا اترے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کہیں راستہ نہیں بھولے کیونکہ انہوں نے اگلی بھیڑوں کی لیک سے کہیں اِدھر اُدھر قدم نہیں رکھا۔ لیکن ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس برابر تعصّب اور جہالت کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جڑ کاٹی ہے بڑے بڑے علماء اور مفسّرین کو للتاڑا ہے۔ اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے۔ قوم کے پکے پھوڑوں کو چھیڑا ہے۔ اور ان کو کڑوی دوائیں پلائی ہیں جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ ایسے شخص کی لائف چپ چاپ کیونکر لکھی جاسکتی ہے۔ ضرور ہے کہ اس کا سونا کسوٹی پر کسا جائے اور اس کا کھرا کھوٹا پن سجا کر دیکھا جائے۔ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے اس لئے لازم ہے کہ سب سے پہلے اس کی لائف میں اس کی پیروی کی جائے اور نکتہ چینی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔“

پہلا اصول تو حالی نے پُورا پُورا نبھایا ہے۔ یعنی ہر چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کو بیان کر دیا ہے۔ مگر غالباً دوسرے اصول کو وہ کماحقہٗ نبھا نہ سکے۔ یعنی انہوں نے نکتہ چینی کرکے کھرا کھوٹا الگ نہیں کیا۔ گر پھر بھی حد سے نہیں بڑھے۔ عسکری کا یہ اعتراض کہ اس کتاب (حیاتِ جاوید) میں ہیرو کی تعریف میں مبالغہ کیا گیا ہے بیجا ہے۔ سرسیّد کی جتنی بھی تعریف کی جاتے کم ہے۔ ان کے کارناموں کی ملک و قوم جتنی بھی قدر کرے کم ہے۔ ان کا احسان معمولی تعریف و توصیف سے سبک نہ ہوسکے گا۔ اس میں شبہ نہیں کہ حالی نے کچھ معاملات پر نکتہ چینی کرنے میں سرسیّد کا حق رفاقت ادا کر دیا ہے۔ اور غلطیاں اور خطائیں کس سے سرزد نہیں ہوتیں۔ بے عیب تو ذات خدا کی ہے اکبر مرحوم لکھتے ہیں ؎

لکھو لائف مری ایّامِ جوانی کے سوا
سب بتادوں گا نہیں ”اندوہ دانی“ کے سوا

یہاں تک تو خیر صحیح ہے۔ اور غالباً سرسیّد مرحوم بھی اس سے انکار نہ کرتے۔ مگر سرسیّد کی لاالف اکبر کے اس شعر سے بالکل بالاتر ہے ؎

تھے معزز شخص لیکن ان کی لاالف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

علامہ شبلی نے ایک اعتراض یہ کیا ہے کہ اس کتاب میں تصویر کا صرف ایک رُخ دکھایا گیا ہے۔ اس میں ایک حد تک صداقت ہے اور دلائل سے اسے ثابت بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن وجوہات کیا تھیں یہ سمجھنا بہت آسان ہے۔ ہمیں معلوم ہے حیات جاوید جس وقت لکھی گئی اس وقت فنِ تنقید اور فنِ سوانح نگاری بالکل ابتدائی حالت میں تھا۔ لہٰذا حیات جاوید کو دیکھتے وقت ہمیں وہ اعلےٰ سوانحعمریاں پیشِ نظر نہ رکھنی چاہئیں جو اُن قوموں کے افراد نے لکھی ہیں جن کا لٹریچر عروج کے اعلےٰ مدارج طے کر چکا ہے۔ حالی اور سرسیّد کے شخصی تعلّقات پر نظر کرنا بھی ضروری ہے۔ ہمیں بخوبی معلوم ہے کہ مولانا حالی کو سرسیّد مرحوم سے گہری عقیدت تھی۔ باس ویل نے ڈاکٹر جانسن کی سوانحعمری لکھی اور حالی نے سرسیّد کی۔ دونوں کتابوں کو پڑھ کر دیکھ لو۔ دونوں مصنّفوں نے اپنے ہیرو کے ساتھ گہری عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

مگر حالی نے مقصداً سرسیّد کے ساتھ گہری عقیدتمندی نہیں دکھائی ہے۔ وہ اپنے اصول یعنی نکتہ چینی پر کاربند ہونا چاہتے تھے۔ مگر چونکہ اس زمانہ میں جیسا کہ ہم پیشتر بیان کر چکے ہیں، سرسیّد کو بہت بُرا سمجھا جاتا تھا اور ان کے کاموں کو قوم کے لئے تباہ کن تصوّر کیا جاتا تھا۔ اس لئے وہ اس اصول پر قدرتاً مکمل طور پر کاربند نہ ہو سکے۔ دوسری بات جو ہمارے ذہن کو اپنی طرف کھینچتی ہے، یہ ہے کہ سرسیّد حالی کے ہمعصر تھے۔ ہمعصروں کی سوانحعمری لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ خصوصاً ان ہمعصروں کی جن کے ہر کام پر اتنی لے دے پبلک میں ہو رہی ہو۔ ان تمام باتوں کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ (ساری کتاب شروع سے آخر تک اعتذار اور معذرت کا پہلو لئے ہوتے ہے۔ سرسیّد اپنے عہد میں بہت مطعون کئے جاتے تھے۔ اور آخر آخر میں جا کر بہت مقبول ہو گئے تھے۔ اسی وجہ سے حالی نے جو ہر واقعہ کی اہمیّت اور صحیح نتیجہ جانتے تھے۔ ان کے ہر چھوٹے سے چھوٹے فعل کو قابلِ تعریف سمجھا بات صرف اتنی سی ہے کہ جو کچھ قدر سرسیّد کی اُن کی خدمات کی بنا پر ہم لوگ آج کرتے ہیں۔ حالی اسی وقت ان کاموں کی اہمیّت کو سمجھتے تھے۔ اور جانتے تھے کہ آیندہ نسلیں سرسیّد کی بے حد قدر کرینگی اور اسی لئے انہوں نے قابلِ قدر واقعات بیان کر کے ان کی بے حد تعریف و توصیف کی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حالی اور سرسیّد کے تعلقات نہایت گہرے تھے اور حالی سرسیّد کے "خلوص اور نیّت" کو بخوبی جانتے تھے۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ سرسیّد نے قوم کے مرض کو پہچان لیا ہے۔ اور وہ اس مرض کو دور کرنے کے لئے کڑوی دوائیں پلا رہے ہیں۔ مریض قوم اس دوا کے مزہ سے تو واقف ہے۔ مگر اس کی تاثیر سے ناواقف۔ پس حالی کا تعریف و توصیف کرنا ناحق نہیں تھا۔)

(حالی نے فلسفہ کو کہیں بھی ہاتھ نہیں لگایا اور سیاسیات سے ہمیشہ دامن بچائے رکھا۔ ہاں سوانح نگاری میں وہ ایک زبردست شخصیّت کے مالک ہیں۔ اردو کے ایک فاضل پروفیسر کی رائے ہے کہ انہوں نے واقعیّت سے کہیں بھی تجاوز نہیں کیا ہے۔ تعریف ہے تو حدود کے اندر اور اعتراض ہے تو صحیح۔ نہ استادی کا خیال ہے نہ دوستی و بزرگی کا نہ پبلک کے مذاق کا۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے صاف و بے کم و کاست کہہ دیتے ہیں اور واقعی نقائص کے دکھانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے۔ ہم کو اس وقت اِس سے بحث نہیں کہ یہ قول بالکل سچ ہے یا نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہیں گے اس میں بڑی حد تک صداقت ہے۔

مولانا حالی کو انگریزی کے مشہور مصنّف جان مارلے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ سوانح نگاری کا رواج اردو ادب میں مولانا حالی کی بدولت ہوُا۔ حالی نے اس عظیم الشّان کام کی صرف داغ بیل ہی نہیں ڈالی بلکہ اپنے ہاتھوں سے اسے پروان بھی چڑھایا۔ اور اس میں اس قدر وسعت، جامعیّت اور استحکام پیدا کیا کہ ان کی تصانیف ہمارے لئے قابلِ نمونہ بن گئیں۔ حالی کو ایک خاص امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے معاصرین کی سوانحعمریاں لکھیں۔ جو ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ انہوں نے صرف واقعات کو جمع ہی نہیں کر دیا ہے بلکہ ان کو اہمیّت کی کسوٹی پر کس کر دیکھا ہے۔)

یہ دوسری بات ہے کہ بعض وہ باتیں جنہیں حالی نے اچھا سمجھا ہے چند لوگ اُنہیں کو بُرا سمجھتے تھے۔ مگر یہ تو اپنی اپنی رائے اور خیال

ہے۔ اس میں کون کس کا پابند ہو سکتا ہے۔ ہاں آج البتہ حالی کے ہم خیال بہت سے نکل آئیں گے۔

(حیاتِ جاوید زبان و بیان اور اصولِ فن کے اعتبار سے مکمل نمونہ بن گئی ہے۔ اور انشاء پردازی کے انتہائے کمال کو ظاہر کرتی ہے۔ حیاتِ جاوید کے جملے بہ نسبت یادگارِ غالب اور حیاتِ سعدی کے قدرے طویل ضرور ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ حالی بہت سے واقعات کو ایک ہی جملے میں ادا کرنا چاہتے ہیں اور سرسیّد کی زندگی میں واقعات اس کثرت سے موجود ہیں کہ ان کو آسانی سے قلمبند بھی نہیں کیا جا سکتا۔ خود حالی نے حیاتِ جاوید کے دیباچہ میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس سے بھی طویل سوانح عمری لکھی جا سکتی ہے۔)

مولانا شبلی کے متعلق ایک خاص روایت سننے میں آئی ہے ایک بزرگ بیان کرتے تھے کہ سرسیّد نے شبلی سے یہ خیال ظاہر کیا۔ کہ میری سوانح عمری لکھ دو۔ انہوں نے ٹال مٹول کر دی۔ اور ایک مخصوص جلسے میں یہ بھی کہا کہ میں اپنے قصیدوں وغیرہ میں کافی "بھٹئی" کر چکا ہوں۔ اب میں مطلق "بھٹئی" کرنا نہیں چاہتا۔ اس واقعہ کو اگر ہم سچّا مان لیں تو شبلی کا اعتراض یعنی حیاتِ جاوید کو مختلف موقعوں پر "یک رخی تصویر" "مدلّل مداحی" اور "کتاب المناقب" کہنا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن اگر اس روایت کو غلط تصوّر کر لیا جائے تو اس وقت شبلی کے اعتراضات کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟ "مدلّل مداحی" سمجھنا کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا۔ کیونکہ اس کے صاف معنی یہ ہوئے کہ شبلی حالی کی قوّتِ استدلال کے مدّاح ہیں۔ کسی قومی ہیرو کی مدّاحی اوّل تو یوں بھی کچھ ایسی بُری نہیں اور پھر اگر مدلّل ہو تو کیا کہنا۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حالی نے جو کچھ تعریف کی ہے اسے مثالوں اور دلیلوں سے پبلک کے سامنے ثابت کر کے دکھایا ہے۔ مَیں نہیں سمجھ سکتا کہ اس سے زیادہ ایک سوانح نگار کی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے۔

شبلی کے ان تمام اعتراضات کے جواب مہدی افادی نے دیئے ہیں۔ ناظرین کو خیال رکھنا چاہیئے کہ مہدی مرحوم نے شبلی کی بڑی تعریف کی ہے۔ ایسی حالت میں یہ جوابات اگر حالی کی پوزیشن صاف کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ تو پھر کیا کہنے کی گنجائش ہے۔ مہدی افادی نے لکھا ہے کہ "المامون" "الغزالی" اور "سیرۃ النعمان" میں انسانی کمزوریوں کو کس موقع پر ابھار کر دکھایا گیا ہے ناظرین جانتے ہیں کہ یہ علامہ شبلی کی تصنیف کردہ مشہور سوانح عمریاں ہیں لہٰذا خود مہدی کی رائے حیاتِ جاوید کے بارے میں بڑی قابلِ قدر ہے۔ اس لئے ہم بجنسہٖ ان کے الفاظ لکھتے ہیں، وہ لکھتے ہیں،

"بہرحال یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ حیاتِ جاوید کے لئے حالی کی طرف سے اعتذار کی بالکل ضرورت نہیں۔ ایک شریف انسان نے ایک شریف تر انسان کی ہمدردانہ سرگزشت لکھی اور آشنائے فن ہو کر لکھی۔ اور یہی اونچے سے اونچا معیارِ تحریر ہے۔ جو ایمان بالغیب کی حیثیت سے یورپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے۔"

غالباً ہمارے اس بیان سے ناظرین یہ خیال کرنے لگے ہوں گے۔ کہ شبلی نے کہیں بھی حالی کی تعریف نہیں کی ہے۔ یا شبلی حالی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر ایسا سمجھنا غلطی ہے حالی اور شبلی کے درمیان معاصرانہ چشمک ضرور تھی۔ مگر ان دونوں کی دوستی اور آپس کی محبّت نہ صرف قابلِ تعریف ہے بلکہ قابلِ پیروی ہے۔ مولانا شبلی حالی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ "کہ جب تک مواد تحریر بہ نہ ہو۔ میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے، جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمالِ اجتہاد کی دلیل ہے۔"

(حالی کی حد سے بڑھی ہوئی متانت اور سنجیدگی حیاتِ جاوید میں نقص کی صورت میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس کی مثال اس سے مل سکتی ہے۔ کہ انہوں نے ۱۸۵۷ء کے غدر کے حالات نہایت خاموشی سے بیان کر دیئے۔ حالانکہ سرسیّد مرحوم کی زندگی پر اس اہم واقعہ کا بڑا اثر پڑا۔ مگر حالی نے اس کا ذکر بالکل سرسری طور پر کر دیا ہے۔ دوسرے انشاء پرداز اس موقع پر جذبات کے سمندر میں مدّ و جزر پیدا کر دیتے۔ لیکن انہوں نے شروع سے آخر تک جو پیرایۂ تحریر اختیار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ خود اس واقعہ سے بالکل متاثر نہیں ہوئے۔ مگر دنیا جانتی ہے کہ حالی کے نازک اور دردِ قومی سے لبریز دل پر اس واقعہ نے کتنا اثر کیا ہے۔ مگر حیاتِ جاوید کے پڑھنے والے پر غدر کے واقعہ کا کوئی بھی اثر نہیں ہوتا۔ اسی طرح وہ سرسیّد کی وفات کے حالات لکھتے وقت بھی

اپنے جذبات کی مصوری بالکل نہیں کرتے۔ سرسید سے ان کو بحیثیت قومی لیڈر، محسن، انشاپرداز اور خادم زبان اردو ہونے کے جو محبت ہونی چاہئے تھی وہ تو تھی ہی۔ مگر اس کے علاوہ انہیں اپنے رفیق دیرینہ ہونے کی وجہ سے بھی سرسید سے خاص تعلق تھا۔ اگر کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ ہوتا تو ایسے شخص کی المناک موت پر قلم کے جگر کو شق کر دیتا اور صفحۂ قرطاس کو اشک ہائے گلگوں سے گلزار بنا دیتا۔ آنسوؤں کے دریا بہا دیتا اور تمام عالم کو ایسے سچے اور بے لوث رہنما کے غم میں سوگوار بنا دیتا۔ اور اس طرح کا طرز بیان اس مخصوص موقعہ پر استعمال کرتا کہ پڑھنے والا بغیر آنسو بہائے نہ رہ سکتا۔ مگر ہمارے حالی نے ایک ضدی بچے کی طرح یہاں بھی اپنی ہٹ نہ چھوڑی۔ اور متانت اور سنجیدگی کو بالائے طاق رکھ کر اپنے صادق اور المناک جذبات کی مصوری بھی نہ کی۔ کوئی شخص خواہ کتنی ہی احتیاط کیوں نہ برتے اپنی تحریروں میں اپنی شخصیت کو مستقل طور پر نہیں چھپا سکتا۔ چنانچہ حالی کی متانت و سنجیدگی ان کی تحریروں سے آشکارا ہے۔

"یادگارِ غالب" میں حالی کو اکثر جگہ ایسے موقعے ہاتھ آئے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھ سکتے تھے۔ مگر حالی میں تعلّی نام کو بھی نہ تھی۔ اسی طرح حیات جاوید میں وہ سرسید کی ادبی خدمات کا ذکر کرتے وقت اپنا تذکرہ بخوبی کر سکتے تھے۔ مگر حالی نے اس موقعہ پر اپنے متعلق کوئی رائے نہ ظاہر کی۔ وہ اپنے متعلق صرف ان موقعوں پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ جب وہ اس تعریف و توصیف کی تردید از راہِ انکساری و خاکساری کرتے ہیں جو دوسرے شخص ان کی کرتے۔ مگر یہی موقعہ ہے جب کہ ان کی قابل رشک عظمت جھلک جاتی ہے۔ حد ہے کہ انہوں نے اور لوگوں کی نظمیں تو حیاتِ جاوید میں شامل کر دی ہیں جو سرسید مرحوم کے اشتغال سے متعلق ہیں مگر اپنے قصائد اور نظموں کا ایک مصرعہ بھی کہیں نہیں لکھا ہے۔ اسی طرح وہ یادگار غالب کے آخر میں اپنا وہ مرثیہ شامل کر سکتے تھے جو انہوں نے غالب کی موت پر لکھا اور جو اردو شاعری میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر وہ تو کچھ اپنا اظہار کرنا چاہتے ہی نہ تھے حالانکہ غالب کا مرثیہ ان کی ادبی خدمات میں مدد دیتا ہے۔

حالی "حیاتِ جاوید" سے اپنے ہیرو کو زندۂ جاوید بنانے میں کامیاب ہوئے۔ اور یہ بات ان کے کامیاب سوانح نگار ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ حیات جاوید کو حالی نے دو حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ مگر پہلا حصہ دوسرے حصے سے کم اہم ہے۔ پہلے حصے میں انہوں نے سرسید کے حالاتِ زندگی از پیدائش تا وفات لکھ دیتے ہیں مگر دوسرے حصے میں ان کا جائزہ لیا ہے۔ اور ان کو "اہمیت کی کسوٹی" پر کس کر دیکھا ہے۔" ان کی ایک رائے سرسید کے متعلق یہ تھی کہ "ان کے تمام کارناموں کا محرک مذہب ہے۔" سرسید کے بارے میں ان کی یہ رائے کس قدر سچی ہے!

سرسید کی بہت سی ادبی تصانیف ایسی ہیں جو عرصے تک زندہ رہنے والی نہیں مگر جس طرح باسول نے ڈاکٹر جانسن کی بہت سی تصانیف کو لونی لگنے سے بچایا اسی طرح حیاتِ جاوید سرسید کے کارناموں کو روشن رکھے گی۔

ابومسلم صدّیقی

رباعی

غم ہستی مری تحلیل ہوئی جاتی ہے
آرزو آہ میں تبدیل ہوئی جاتی ہے
جان لب آگئی پھر بھی اس احساس میں ہیں
میری بربادی کی تکمیل ہوئی جاتی ہے

نامی صدیقی

غزل

نے کا نئے نام رکھ دیا کس نے؟ نئے میں پیغام رکھ دیا کس نے؟

مختصر سی حیات میں جانے اس قدر کام رکھ دیا کس نے؟

دل کی بےتابیوں کے عالم کا زندگی نام رکھ دیا کس نے؟

پی رہا ہوں، کہ پڑ گیا پینا سامنے جام رکھ دیا کس نے؟

پر نکلتے ہی آشیانے میں دانہ و دام رکھ دیا کس نے؟

پیرِ فانی! تری نمازوں کا حور انعام رکھ دیا کس نے؟

یہ حقیقت کا آئینہ ہے امیںؔ
اِس کا دل نام رکھ دیا کس نے؟

امین حزیںؔ

یاتری

جھمیلوں سے دنیا کے بیزار ہو کر
صداقت قرینِ وقفِ ایثار ہو کر

خمارِ خودی توڑ کر نفسِ دُوں کا
شرابِ محبت سے سرشار ہو کر

کئے بند چشمانِ باطل نگر کو
حقیقت کے عالم میں بیدار ہو کر

لئے اک جہاں دل میں بےتابیوں کا
سراپا تمنائے دیدار ہو کر

عقیدت کے پھولوں کو دامن میں لے کر
چلا یاتری گھر سے تیار ہو کر

پہنچ جائے منزل پہ خواہش یہی ہے
اُسے اپنے معبود کی لَو لگی ہے

یہی آرزو گدگداتی ہے اس کو
اُڑاتی ہوئی لے کے جاتی ہے اس کو

قریب آتی جاتی ہے جوں جوں وہ منزل
ہوا اور بےخود بناتی ہے اس کو

جو مایوس ہو کر گرے راستے میں
یہ دے کر سہارا اُٹھاتی ہے اس کو

فضا کشورِ دوست کی جاں فزا ہے
یہ مر جائے تو بھی جِلاتی ہے اس کو

لپکتا ہے یہ مثلِ پروانہ اُس پہ
کرن نورِ حق کی بلاتی ہے اس کو

سفر ہے یہی مایۂ شادمانی
اسی کو سمجھ غائتِ زندگانی!

تلوک چند محروم

کونپل

سگیاں کے پنڈت جے رام کی لڑکی سنیکری کے دل میں بچپن ہی سے جس چیز کی زبردست خواہش پیدا ہو گئی تھی وہ سونے کے زیور تھے اور ان میں بھی طلائی کنگنوں پر تو اس کا دم نکلتا تھا۔

سگیاں کی بے چاری غریب دیہاتنیں تو چاندی کی بالیوں، چوڑیوں، کڑوں، کنٹھوں اور چند ایسے ہی دوسرے روپہلی گہنوں کے علاوہ کسی چیز کو جانتی ہی نہ تھیں لیکن جب گاؤں کے ساہوکار لالہ شنکر داس کی لڑکی کا بیاہ جالندھر شہر کے ایک امیر آدمی کے اکلوتے لڑکے سے ہوا، تو گہنوں میں ایک ایسی چیز آئی، جس کی تعریف سبھی نے کی ـــــ اور وہ چیز تھی سونے کے کنگن!

اُن دنوں بازوبندوں کا بھی رواج تھا۔ اور ڈھولک پہ گاتی ہوئی لڑکیاں۔ "جُتی سنا ریاں والی" کی طرز پر ـــــ

وے بندلے وے، وے بندلے وے! سونے دے
بھاویں تیری پگ وِک جائے!

بھی گایا کرتی تھیں لیکن اوسط درجے کے کھاتے پیتے لوگ، جو لڑکے لڑکی کی شادی میں دونوں گہنوں کا بار نہیں اٹھا سکتے تھے کنگن ہی بنوایا کرتے تھے۔

سگیاں کی دیہاتنوں نے تو ایسے زیور دیکھے ہی کب تھے۔ کنگنوں کی جوڑی دیکھ کر اُن کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ قریباً سب ہی نے انہیں ہاتھوں میں لے کر دیکھا۔ سولہ تولے سے کہیں زیادہ بھاری ہوں گے پانچ ساڑھے پانچ سو سے بھی زیادہ جچتے تھے۔ اور سگیاں کی مفلس دیہاتنوں کے لئے تو ایسے قیمتی زیور دیکھنا خواب میں بھی مشکل تھا۔ پھر وہ کیوں نہ انہیں ایک بار ہاتھ میں لے کر دیکھنے کی خوشی محسوس کر لیتیں۔

اُن ہی میں اپنی ماں کے ساتھ لگی کھڑی سنیکری بھی تھی۔ اس وقت اُس کے دل میں زبردست آرزو پیدا ہوئی کہ وہ بھی ایک بار ان بھاری کنگنوں کو اپنے ننھے ہاتھوں میں لے کر دیکھ لے۔ لیکن ماں کے سامنے وہ اپنی اس آرزو کا اظہار نہ کر سکی۔

ماں تو ایک بار گہنوں کو دیکھ کر پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ ابھی بارات آئی تھی اور اسے بہت سے کام کرنے تھے۔ بے چاری غریب برہمنی! وقت پڑے پر وہ نائن ہوتے ہوئے اسے مہری بھی بن جانا پڑتا تھا۔ لیکن سنیکری اس کے ساتھ نہ گئی۔ ماں اور سکھی سہیلیوں کو چھوڑ کر، حیرت میں ڈوبی ہوئی، وہ دیوار کے ساتھ سر لگائے کھڑی رہی۔ اس کی نظر انہی زیورات پر جمی تھی۔ جب کبھی گاؤں کی عورتیں اُن زیوروں کو اُٹھا اُٹھا کر دیکھتیں تو تصور ہی تصور میں سنیکری بھی ایسا ہی کرتی۔ یہاں تک کہ وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کی انگلیاں سچ مچ گہنوں کو چھو رہی ہیں۔

جب دلہن کو اُبٹن لگا کر نہلایا گیا اور اسے گہنے پہنائے گئے تو سنیکری کی نظریں اس کی کلائیوں پر ہی جم گئیں۔

اس وقت اس کی ایک سہیلی بھاگی بھاگی آئی۔ اور ایک چھوٹا سا روڑا دکھاتے ہوئے اُس نے کہا ـــــ "دیکھ میں یہ لائی ہوں آ ڈھولک بجائیں" لیکن سنیکری وہاں سے نہ ٹلی۔

باہر باجے بجنے لگے اور بارات کی آمد کا شور مچ گیا۔ عورتیں اور بچے، سب چھتوں پر جا چڑھے۔ اور فوراً ہی بیاہ کے میٹھے گیت فضا میں گونج اٹھے۔

سنیکری وہاں سے نہیں ہلی بلکہ جب دلہن اکیلی رہ گئی تو وہ جھجکتی، ڈرتی، اس کے پاس جا بیٹھی۔ گھٹنوں پر اپنا سندر مکھڑا رکھے دُلہن چپ چاپ اپنے حنائی انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ نہ جانے اس کا دھیان کدھر تھا؟ شاید وہ ایک ہی دن میں اپنے لڑکی سے دلہن بن جانے کی بات سوچ رہی تھی۔ اپنی کلائیوں پر جمی ہوئی سنیکری کی نظریں، اور اُن نظروں کا اشتیاق دیکھ کر وہ مسکرائی۔ سنیکری کی انگلیاں، اس وقت، غیر ارادی طور پر کنگنوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دلہن نے ہاتھ

ڈھیلا چھوڑ دیا اور سنیکری نے ان کنگنوں کو اور ان کے ساتھ کی چوڑیوں کو جی بھر کر دیکھا۔ اور اس کے دل کی مسرّت آمیز کیفیت اس کے چہرے پہ منعکس ہو گئی۔

دُلہن ہنسی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولی، "تیری شادی میں بھی ایسے ہی کنگن آئیں گے"۔

. . . .

کہتے ہیں دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں کسی نہ کسی پل میں ہر ایک شخص کی زبان پر سرسوتی آبیٹھتی ہے اور اس وقت جو کچھ بھی وہ کہتا ہے، سچ ہو جاتا ہے۔ دلہن کی زبان پر بھی اس وقت شاید سرسوتی آبیٹھی تھی۔ کیونکہ جس وقت سنیکری کی شادی میں سسرال کی طرف سے آئی ہوئی ساچق کے تھالوں پر سے پیلے، ہرے اور نیلے کاغذ اٹھائے گئے تو ایک تھال میں دوسرے سنہری گہنوں کے علاوہ چمکتے ہوئے بھاری کنگنوں کی جوڑی بھی تھی۔ اُنہیں دیکھ کر سنیکری پھولی نہ سمائی تھی۔ اور جب اسے اُبٹن مل کر نہلایا گیا اور اس کی کندن سی کلائیوں میں کنگن ڈالے گئے تو وہ گویا جسم ہی کا ایک حصّہ دکھائی دینے لگے۔ سنیکری کی عمر اس وقت صرف تیرہ برس کی تھی۔

لیکن اس کے بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، جوانی کی سنہری صبح کے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ کنگن اس کی کلائیوں میں ایسے چُست بیٹھے کہ کچھ دیر بعد اُن میں سے ایک کو اپنی جگہ سے کھسکانا پڑا۔ اس کی جگہ خون اکٹھا ہو جانے سے ایک سُرخ سا حلقہ بن گیا تھا۔ بہت دیر تک وہ مسحور سی ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ پھر کلائیوں سے لٹکتے ہوئے کلیروں اور ناک میں پڑی ہوئی بڑی نسکار پوری نتھ کو سنبھالتی ہوئی وہ اُٹھی اور جا کر سہیلیوں کو اپنا ایک ایک گہنا اور اس کی بناوٹ دکھانے لگی۔ اس وقت رہ رہ کر اس کے دل میں یہ آرزو لہریں لیتی کہ کاش وہ دلہن، وہ ان کے ججمان نسکر داس کی لڑکی بھی وہاں ہوتی اور اپنی پیشین گوئی کو پورا ہوتے دیکھتی۔

سنیکری کی مسرّت اور خوشی کو دیکھ کر بڑی بوڑھیاں اپنے پوپلے مُنہ سے ہنستیں اور اس کی خوش بختی کی تعریف کر کر کے اسے دعائیں دیتیں، بھک منگے برہمن کی لڑکی اتنے بڑے گھر جا رہی ہے۔ اتنے دھنی کے گھر! وہ کیوں نا اُسے سبھاگی سمجھیں؟ لیکن گاؤں کی نوجوان لڑکیوں کو اس کی اچھی قسمت پر کچھ ایسا رشک نہ تھا۔ اتنے قیمتی اور خوبصورت زیور اس غریب برہمن کی لڑکی کے جسم پر دیکھ کر اگر کسی کو کچھ جلن بھی ہوتی تو یہ جان کر کہ سنیکری سوت پہ جا رہی ہے اور پچاس سالہ دولہا کی پہلی بیوی بھی موجود ہے۔ ان میں سے اکثر نے مُنہ بنا بنا کر کہہ دیا تھا — "دنیا میں سب کچھ گہنے کپڑے ہی تو نہیں ہوتے"!

. . . .

سنیکری کے شوہر پنڈت مہیشور دیال جالندھر کے مشہور جوتشی تھے۔ انہوں نے جیوتش کا علم کہاں سے سیکھا تھا، اس سلسلے میں تو کئی طرح کی باتیں مشہور رہیں لیکن عام طور پر یہ سنا گیا ہے کہ وہ جالندھر میں "پٹ پھیرا" کرتے تھے۔ یعنی رنگنے اور سکھانے کے بعد ریشم کے جو تار آپس میں اُلجھ جاتے ہیں۔ وہ اُن کی نئے سرے سے گُچھیاں بناتے تھے۔ لیکن جاپانی مال کے آنے سے جہاں دوسرے گھر بلو دھندوں کو نقصان پہنچا، وہاں جالندھر کا یہ ریشم کا کاروبار بھی ختم ہو گیا۔

اس وقت لالہ لوگوں نے تو صرافے اور بزازی میں پناہ لی، لیکن پنڈت جی کے لئے ان کے آباؤ اجداد کے کاروبار کا دروازہ کھُلا تھا۔ کچھ سوئے ہوئے ججمان جاجگائے، کچھ دبے ہوئے اکھیڑے، کچھ مردہ زندہ کئے اور بڑے طمطراق سے پروہتائی شروع کر دی۔ اس پر بھی صبر نہ ہوا تو ایک دن کھوپری گھٹا لمبی چوٹی کو گانٹھ دے، ماتھے پر چندن کے لمبے لمبے ٹیکے لگا، اور گلے میں رام نام کا دوپٹہ ڈال کر آپ نے اپنے جوتشی ہونے کا اعلان کر دیا۔

ویسے تو جوتشی کے روپ میں شاید آپ عمر بھر بھی مشہور نہ ہوتے لیکن قسمت یاور تھی۔ سٹّے کی آپ کو پہلے ہی سے کچھ لت تھی اور جوں جوں جالندھر میں سٹّے کا بازار گرم ہوتا جاتا، آپ کی یہ لت بھی بڑھتی جاتی۔ انہی دنوں میں ایسا ہوا کہ دو تین بار آپ کو دو دو ڈھائی ڈھائی ہزار روپیہ سٹّے میں آگیا۔ بس آپ نے ثابت کر دیا کہ یہ سب ان کے جوتش ہی کا کرشمہ ہے۔ پھر کیا تھا سارا سارا دن آپ کو سٹّہ لگانے والے گھیرے رہتے، پنڈت جی بھی اشاروں میں باتیں کرتے جن کا نمبر آ جاتا، وہ اُن کی تعریف کرتے، نذرانے دیتے۔ جن کا نہ آتا وہ یہ سمجھتے کہ انہوں نے پنڈت جی کا اشارہ سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ دوسرا نمبر پانے کی غرض سے وہ پھر نذرانے دیتے۔ دونوں ہی طرح پنڈت جی کی چاندی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں آپ نے جالندھر میں اپنا ایک بڑا مکان اور دو دُکانیں بنوالیں اور نقد روپیہ بھی کافی جمع کر لیا۔

لیکن اس سب دولت اور عزّت کے باوجود پنڈت جی دکھی تھے وجہ یہ تھی کہ اُن کی اس دولت کو ان کے بعد سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ بیوی تھی، لیکن بچہ کوئی نہ ہُوا تھا۔ ادھر ان کی عمر پچاس کی ہو چکی تھی۔ انہی دنوں میں

جالندھر کی ایک بارات کے ساتھ وہ سنگیاں گئے اور جے رام پروہت سے ان کی ملاقات ہوئی وہاں ان کی سونے جیسی لڑکی کو دیکھ کر ان کے منہ سے رال ٹپک پڑی۔ ہاں ہو جانے پر انتظام کر لینا جوتشی مہیشور دیال کے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔ پنڈت جے رام اور ان کی برہمنی کو، اپنی اس بیل کی طرح بڑھنے والی لڑکی کے ہاتھ پیلے کرنے کا فکر بے طرح کھائے جاتا تھا۔ پھر وہ ایسا اچھا موقع پاکر کیسے چوکتے۔ خصوصاً جب باتوں باتوں میں اپنی سب جائیداد کی فہرست دیتے ہوئے جوتشی جی نے اس سکھ کا بھی ذکر کر دیا تھا۔ جو بڑی بے صبری سے ان کے گھر میں نئی بہو کا انتظار کر رہا تھا۔ شادی میں دونوں طرف کا خرچ بھی جوتشی جی نے اپنے ذمّے لے لیا۔ اور اس طرح لڑکی کو لائق اور دھنی ور کے ہاتھوں سونپ کر پنڈت جے رام اور ان کی برہمنی نے سکھ کا سانس لیا اور جائداد کا جانشین پانے کی اُمید کے پھر زندہ ہو جانے سے جوتشی مہیشور دیال بھی بوڑھے سے نوجوان بن گئے۔

. . . .

سسرال آنے پر گہنے کپڑے سے سنیکری کو اور بھی محبت ہو گئی۔ شادی کے بیش قیمت زیورات کے علاوہ ہاتھوں کے لچھے، بازو کا جوشن سر کا جھومر اور گلے کا رانی ہار پنڈت جی نے اسے بنوا دیا۔ کئی طرح کی ساڑیاں لادیں۔ بڑی عمر کے لوگوں پر جب عشق کا بھوت سوار ہو جاتا ہے تو وہ اپنی پردہ پوشی کے لئے چاپلوسی اور خوشامد سے کام لینا خوب جانتے ہیں لیکن جس طرح بچہ ایک کھلونا پا کر دوسرے کے لئے مچلتا رہتا ہے۔ اسی طرح سنیکری بھی ایک چیز پا کر دوسری کی فرمائش کر دیتی اور پنڈت جی فوراً لادیتے۔ لیکن دونوں کے اندازِ نظر میں بہت فرق تھا۔ بچہ کھلونا پا کر شکریے کے اظہار سے ماں باپ کو خوش کرنے کی بجائے اپنے ہمجولیوں کے دل میں حسد پیدا کرنا، انہیں اپنی دولت سے روشناس کرانا زیادہ اچھا سمجھتا ہے۔ اسی طرح سنیکری بھی جب گہنے کپڑے پہنتی تو پنڈت جی کے پاس بیٹھنے کی بجائے اپنی سہیلیوں کو اپنی شان دکھانے کے لئے بے چین ہو جاتی۔ پنڈت جی اپنے گھٹے ہوئے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے للچائی ہوئی نظروں سے خوبصورتی کے اس مجسمے کو دیکھتے اور کہتے ”تم تو سورگ کی اپسرا ہو۔ اور اسے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے۔ لیکن وہ اپنے میکے جانے کے لئے مچل پڑتی۔

درحقیقت گہنے کپڑے زیب تن کرتے کرتے کچھ عجیب طرح کی کسمساہٹ اس کے جسم میں پیدا ہو جاتی تھی۔ کوئی نامعلوم سی آرزو اس کے دل میں سلگنے لگتی تھی۔ لیکن جوتشی جی سے جیسے اسے کچھ خوف سا آیا کرتا۔ وہ ہمیشہ اُن سے دور بھاگ جانا چاہتی اس لئے ایسے مواقع پر وہ رو رُلا کر میکے چلی جاتی تھی۔ وہاں جب اس کی سہیلیاں، مسرّت اور حسد کے ملے جلے جذبات کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتیں۔ اس کے گہنوں کو ہاتھوں میں لے لے کر ہنسی ہنسی میں پہن پہن کر دیکھتیں تو سنیکری خوشی سے پھولی نہ سماتی اور اس کے دل کو ایک عارضی سا سکون بھی حاصل ہو جاتا۔

اس کی سہیلیاں سوچتیں، کاش ہمیں ان میں سے ایک گہنا بھی میسّر ہو سکتا اور ان کی مائیں، اس برہمن کی چھوکری کو اپنے قیمتی گہنوں کپڑوں میں ملبوس دیکھ کر ایک سرد آہ بھرتیں اور سوچتیں —— کیوں نہ ان کی لڑکیوں کو بھی ایسا اچھا گھر ملا۔ بلا سے شوہر عمر کا پکّا ہوتا۔ لڑکی تو راج کرتی۔

لیکن اس راج کی حقیقت کیا ہے، جلد ہی سنیکری کو اس کا پتہ لگ گیا۔ بات یہ ہوئی کہ اپنے خاوند کے ”راجہ“ ہونے پر بھی سنیکری کو اپنا وہی گاؤں کا جھونپڑا اچھا لگنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ میکے زیادہ دیر تک رہنے لگی۔ یہاں تک کہ ایک بار جب پنڈت جی اسے لینے گئے تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے ایسا کیوں کیا، اس کی ٹھیک وجہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھی۔ لیکن اس ”راج گھر“ میں اس کا دم جیسے گھٹنے لگتا تھا اس وقت پنڈت جی نے اس سے سونے کے بڑے بڑے منکوں کی کنٹھی بنوا دینے کا وعدہ کیا تھا۔ ماں نے سمجھایا تھا ”بیٹی پتی ہی استری کا ساتھی ہے اس کا دیوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا ایشور بھی وہی ہے۔ وہ جس طرح رکھے، جس حال میں رکھے، اسی میں رہنا چاہیئے“ اور باپ نے پہلے جھڑکیاں دی تھیں۔ کوسا تھا، اور پھر وعدہ کیا تھا کہ اسے جلد ہی بلا لیا جائے گا۔ تب کہیں جا کر سنیکری تیار ہوئی تھی۔ لیکن پھر جب اس نے میکے جانے کی ضد کی تو پنڈت جی نے اسے جھڑک دیا —— ”وہاں کس سے آشنائی ہے جو آئے دن اُٹھ بھاگتی ہے“ —— انہوں نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔

سنیکری یہ سن کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔ ہوش و حواس جواب دیتے ہوئے معلوم ہوئے تھے۔ وہ روئی بھی نہ تھی چلّائی بھی نہ تھی۔ بس گم سُم کھڑی رہ گئی تھی۔ رنج و غم سے اس کا گلا بھر آیا تھا۔ اس نے کپڑے اُتار پھینکے تھے۔ گہنے اندر ٹرنک میں بند کر دیئے تھے۔ سہاگ کی نشانی صرف دو دو چوڑیاں ہاتھوں میں پڑی رہنے دی تھیں اور فیصلہ کر لیا تھا کہ اب مر بھی جائے تو میکے نہیں جائے گی۔

وہیں کھڑے کھڑے اس کی آنکھوں میں گاؤں کے کئی سیدھے
سادے نوجوانوں کی تصویریں پھر گئی تھیں جن کو وہ بھائی کہتی تھی۔ دل کو ٹٹول
کر اس نے دیکھا۔ کیا ان میں سے کسی کے ساتھ اس کی آشنائی تھی؟ ہلکی
سی محبت بھی تھی؟ لیکن دل میں اسے کہیں کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس کے
بھولے بھالے دل نے ابھی مرد کو اس روپ میں دیکھنا بھی نہ سیکھا تھا ——
وہ روک نہ سکی، رو پڑی۔

جوتشی جی نے دیکھا۔ نشانہ بہت آگے پڑا ہے۔ وہ نادم ہوئے
گمان سے زیادتی ہو گئی اور انہوں نے اسے منانے کی کوشش کی کھسیانی
سی ہنسی بھی ہنسے، گدگدایا بھی، لیکن سنیکری نہ کھلی۔

دوسرے دن پنڈت جی صراف کی دکان سے سونے کے بڑے
بڑے منکوں والی خوبصورت کنٹھی لے آئے۔ سنیکری نے اسے دیکھا۔
لحظہ بھر کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی لیکن جوتشی جی کی بات
کا دھیان آجانے سے دوسرے ہی لحظے میں وہ مٹ گئی۔ جب پنڈت جی
نے ڈبہ اسے دیا تو اس نے چپ چاپ اسے لے کر رکھ لیا۔ انہوں نے لاکھ
کہا کہ اسے ذرا پہن کر دکھاؤ دیکھیں تو سہی، تمہارے خوبصورت گلے میں
کیسی لگتی ہے۔ لیکن سنیکری چپ بیٹھی رہی۔ ہار کر انہوں نے اسے کوسا
بھی، طعنے بھی دیئے۔ جھلائے بھی، اور پھر اٹھ کر بیٹھک میں چلے گئے اور
نہ جانے کتنی جنم پتریاں کھول کھول کر ڈھیر لگا دیں اور ان میں بیٹھ گئے۔

اس وقت تو سنیکری نے وہ کنٹھی نہیں پہنی۔ لیکن جب پنڈت
جی چلے گئے تو اسے پہن کر دیکھنے کے لئے اس کا من بے چین ہو اٹھا۔ ایک
بار اس نے اسے نکالا بھی لیکن پھر وہیں رکھ دیا۔ اتنے میں ہنڈا لینے والی
برہمنی پرمیشری کا لڑکا تھالی اٹھائے ہوئے آیا ہنس مکھ بے دھڑک، بائیس
تیئیس برس کی عمر اور طبیعت میں کچھ کچھ بھولا پن اور بے پروائی۔

آشنائی! ۔ اچانک سنیکری کے دل میں یہ ایک لفظ گونج اٹھا اور
اس نے اس برہمن لڑکے کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا بھی لیکن پھر
جھٹ ہی اپنی آنکھیں جھکا لیں۔

تھالی کے اوپر سے صافہ ہٹا کر لڑکے نے کٹوریاں نکال کر رکھ
دیں۔

وہیں بیٹھے بیٹھے سنیکری نے پوچھا ۔ "تیری ماں کیوں نہیں
آئی آج؟"

"بیمار ہے جی" لڑکے نے جواب دیا اور پھر سنیکری کے پاس آکر
مسکراتے ہوئے بے پروائی سے بولا ۔ "یہ کنٹھی تو بڑی خوبصورت ہے
کتنے کو آئی ہے؟"

سنیکری نے کہا "معلوم نہیں، پنڈت جی لائے ہیں"۔ اور اس
وقت اس کا جی چاہا کہ کنٹھی کو پہن لے۔

لڑکے نے کہا ۔ "پہنئے تو سہی، ٹھیک آگئی آپ کو؟" اور یہ
کہہ کر وہ یونہی ذرا مسکرا دیا۔

سنیکری نے ذرا آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اس کی
یہ ہنسی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ ساتھ ہی سارے جسم میں ایک جھرجھری سی دوڑ
گئی۔ "میں نے دیکھی تو نہیں" اور پھر کنکھیوں سے نوجوان کی طرف دیکھ کر
سنیکری کنٹھی پہننے لگی۔

کنٹھی کا ہک گردن کی پشت پر تھا۔ نیا ہونے کی وجہ سے اور گردن
میں کنٹھی کے بالکل فٹ آنے کے باعث وہ کوشش کرنے پر بھی اسے نہ
لگا سکی۔ تب اس نوجوان نے ہنستے ہوئے آگے بڑھ کر اسے لگا دیا ایسا کرتے
وقت اس کی انگلیاں سنیکری کی نازک گردن سے چھو گئیں۔ سنیکری کے
تمام جسم میں پھر سنسنی سی دوڑ گئی۔

ٹک لگا کر سنیکری کی طرف کچھ مسحور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے
نوجوان نے کہا "بہت اچھی لگتی ہے آپ کو"۔

اس وقت پنڈت جی ایک لٹکتی ہوئی جنم پتری ہاتھ میں لئے داخل
ہوئے اُن کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ لیکن دوسرے لمحے ہونٹوں پر زبردستی
مسکراہٹ لا کر انہوں نے کہا۔ "واہ کیسی خوبصورت لگتی ہے"۔

سنیکری خوش تھی۔ وہ ہنس دی تھی اور اس کے بعد وہ سارا
دن خوش خوش رہی تھی اور جب وہ برہمن نوجوان ہنڈا لے کر چلا گیا تھا۔ تو
اپنے کمرے میں جا کر، کواڑ بند کر کے، اس نے سب گہنے کپڑے پہنے تھے۔
اور وہ کنٹھی بھی، تب اس نے محسوس کیا تھا جیسے اس جوان کی انگلیاں
اس کی گردن کو چھو رہی ہیں اور اس احساس کے ساتھ ہی اس کی رگ
رگ میں ویسی ہی جھرجھری دوڑ گئی تھی اور ایک نامعلوم سی آگ جو اس کے
دل میں کہیں دبی پڑی تھی پھر سلگ اٹھی تھی۔

رات کے وقت سنیکری کے خوابوں کی دنیا آباد رہی تھی۔ اس
دنیا کا ایک راجہ بھی تھا اور ایک رانی بھی۔ راجہ اور رانی جیسے مدتوں سے
بچھڑے کسی سندر باغ میں آملے تھے۔ رانی نے شکایت بھرے لہجے میں
کہا تھا۔ "تم آتے ہی نہیں میرے راجہ، اور یہ پہاڑ سے دن مجھ سے کاٹے

نہیں کٹنے اور یہ راتیں . . . . . " اور یہ کہتے کہتے رانی کی آنکھیں پرنم ہوگئی تھیں۔تب راجہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا "تم گھبراؤ نہیں رانی۔ اسی باغ میں ملا کریں گے"۔

لیکن دوسرے دن جب روز کی نسبت سنیکری کا دل کچھ ہلکا تھا اور سب گہنے کپڑے نہ سہی، آسمانی رنگ کی ساڑی کے ساتھ اس نے اپنے پیارے کنگن اور کرن پھول، اور چوڑیاں اور موٹے موٹے سنہری منکوں کی وہ خوبصورت کنٹھی پہنی تھی تو اس کے سپنوں کا وہ راجہ نہ آیا تھا۔ پرمیشری برہمنی کی جگہ ہندا لینے کے لئے پنڈت جی نے مایا کو لگا لیا تھا۔

سارا دن سنیکری کا جسم تھکا تھکا رہا تھا۔ اداس سی وہ اپنے کمرے میں لیٹی رہی تھی۔ اور پہلے سے کہیں زیادہ اسے اپنی میکے کی سہیلیوں کی یاد ستانے لگی تھی۔ پنڈت جی نے گلی میں اس کا آنا جانا بند کر دیا تھا۔ میکے جانے کی اسے ممانعت تھی، اور ہنس مکھ پرمیشری کی جگہ پنڈت جی نے سوکھی سڑی مایا کو لگا لیا تھا۔ اور سنیکری بے چین ہو گئی تھی۔

اسی طرح لیٹے لیٹے، کروٹیں بدلتے بدلتے دن ڈھل گیا، کمرے میں جیسے اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ اٹھی۔ صحن میں آئی۔ منڈیر پر ایک کوا کائیں کائیں کر رہا تھا۔ طاق کے اوپر آگے کو بڑھی ہوئی محراب پر ایک کبوتر تنکے پھلائے، گردن جھکائے، اپنی محبوبہ کو منانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ لیکن جب وہ مستانی چال سے چلتا چلتا اس کے پاس جاتا وہ اڑ جاتی۔ ایک طاق سے دوسرے پر، دوسرے سے تیسرے پر، تیسرے سے کھٹولے پر، کھٹولے سے چارپائی کے پائے پر، اور پھر وہاں سے لکڑی کے جنگلے پر وہ جا جا کر بیٹھی لیکن کبوتر نے پیچھا نہ چھوڑا۔ پھر ایک زناٹے سے جو وہ اڑی ہے تو نیلے، وسیع آسمان میں گم ہو گئی۔ کچھ لمحے تک وہیں جنگلے پر کبوتر نے ایک دو چکر لگائے غٹر غوں غٹر غوں، کی اور پھر وہ بھی اوپر آسمان کی طرف اڑ گیا۔

سنیکری نے لمبی سانس بھر کر انگڑائی لی۔ پھر اس نے گھڑے کے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ منہ دھویا اور پھر جیسے کسی نامعلوم ترغیب کے زیر اثر اوپر چھت پر کھلی ہوا میں چلی گئی۔

سامنے، محلے کے پرے سرے پرمیشری برہمنی کا لڑکا اپنے پرانے مکان کی چھت پر کتاب میں دھیان لگائے چپ چاپ پڑھ رہا تھا۔ سنیکری نے بے ساختہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے من میں امنگ اٹھی کہ کچھ گائے، کوئی ڈھولک کا پرانا گیت۔ لیکن وہ چپ ٹکٹکی باندھے ادھر دیکھتی رہی۔ محلے کا نیم ٹھنڈی ہوا کے چھونے سے جیسے سرمست ہو کر جھوم رہا تھا۔ آسمان کی گہرائیوں میں چیلیں، ایک دوسری کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔ سنیکری نے انگڑائی سی لی۔ اس وقت نوجوان نے اس کی طرف دیکھا۔ ساڑی کا پلو اس کے سر سے ڈھلک گیا تھا اور اس کی لوؤں میں کنٹھی کے بڑے بڑے سنہرے منکے غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنوں سے کئی سورج بن کر چمک رہے تھے،

سنیکری کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور نوجوان نے ایک بجلی سی اپنے تمام جسم میں دوڑتی ہوئی محسوس کی،

اس وقت نیچے سیڑھیوں میں پنڈت جی کے چپلوں کی پھٹ پھٹ سنائی دی۔ وہ جلدی سے نیچے چلی گئی اور مسکراتے ہوئے اس نے ان کا خیر مقدم کیا۔ ججمانوں کے گھر سے جو کچھ وہ لائے تھے، اس کے سلسلے میں ایک دو مذاق بھی کئے۔ لیکن نہ جانے پنڈت جی کو اس کے چہرے پر کیا لکھا ہوا نظر آیا۔ کہ سب کچھ اسے دے کر وہ کسی بہانے سے چھت پر چلے گئے۔ اور انہوں نے گھور کر دور سامنے کے مکان کی چھت پر پڑھتے ہوئے نوجوان کو دیکھا۔ اس وقت اس نے بھی سر اٹھایا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پنڈت جی نے اپنی چوٹی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک بار غصے سے ہنکارا بھرا اور پل بھر کے لئے حیران سا رہ کر نوجوان نے پھر آنکھیں کتاب پر جما دیں۔

دوسرے دن سنیکری ابھی بستر سے اٹھی بھی نہیں تھی کہ اس نے دیکھا ـــــ سامنے کے مکان کی طرف شہ نشین کی جگہ معمار پورے ساڑھے پانچ فٹ کا پردہ بنانے میں مصروف ہیں۔

یہ تھی اس راج کی حقیقت اور سنیکری کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ اس راج کے راجہ اور جیل خانے کے جیلر میں کوئی فرق نہیں اور اپنے شوہر کی طرف سے اس کے دل میں جو خوف سا تھا۔ وہ ایک زبردست نفرت میں بدل گیا۔ اور جوں جوں دن گذرتے گئے۔ اس نفرت کی تہہ اور بھی گہری ہوتی گئی اور یہ سبب اس وقت تک جاری رہا۔ جب تک اس نفرت اور خوف کے باوجود وہ ایک لڑکی کی ماں نہ ہو گئی اور اولادِ نرینہ کی خواہش من ہی میں لئے ہوئے اپنی دوسری شادی کے پورے پانچ سال بعد نوزائیدہ لڑکی کی پہلی سالگرہ کے روز پنڈت جی پرلوک نہ سدھار گئے۔

. . . .

اس وقت اس جلاد جیسے بوڑھے شوہر کی موت پر اپنے جذبات کا تجزیہ سنیکری اچھی طرح نہ کر سکی تھی۔ اس کا دل ہلکا بھی تھا اور ایک بڑے

بھاری بوجھ تلے دبا ہوا بھی لگتا تھا۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑنا بھی جانتی تھی۔
اور زور زور سے رونے کو بھی اس کا دل کرتا تھا۔ لیکن وہ زیادہ روتی ہی تھی
اپنا ایک ایک گہنا اُتار کر اس نے ٹرنک میں رکھا۔ سہاگ کی نشانی چوڑیاں
توڑ ڈالیں اور رسم کے مطابق دور نزدیک کے رشتے داروں کے ساتھ
مل کر اس نے چھاتی بھی پیٹی، بال بھی نوچے اور آنکھیں بھی سُجالیں۔

تب ماں نے آکر اسے تسلی دی تھی کہ بیٹی قسمت کا لکھا تو مٹایا نہیں
جاسکتا۔ وہ جس حال میں رکھے اسی میں رہنا چاہئے اور پھر ماں نے گاؤں
کی کئی لڑکیوں کی مثالیں دے کر سمجھایا تھا کہ ان میں بارہ بارہ برس کی عمر میں
بیوہ ہو جانے والی عورتیں بھی ہیں اور اپنے مرحوم شوہروں کی یاد کا سہارا
لے کر ان دیویوں نے اپنی ساری زندگی کاٹ دی ہے اور پھر خدا کا شکر ادا
کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ یہ تو پھر پرماتما نے اچھا کیا کہ جوشی جی دُکانیں
اور مکان تیرے نام چھوڑ گئے ورنہ مجھے تو یہی ڈر تھا کہیں سوت اور اس
کے رشتہ دار ہی تیرے سر پر نہ سوار ہو جائیں۔ اس طرح خدا کا لاکھ لاکھ شکر
ادا کر کے ماں نے سنیکری کو صلاح دی تھی کہ بیٹی اپنے چھوٹے بھائی کو یہاں
بلوالینا۔ وہ یہاں شہر میں رہ کر پڑھ جائے گا۔ تیس روپے تو دُکانوں کا کرایہ
ہی آجاتا ہے۔ یہ اتنا بڑا مکان بھی کیا کرنا ہے آدھا کرائے پر چڑھا دینا اور
من کو دھرم کرم کے کاموں میں لگانا اور پھر اس نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ
جہاں تک زیورات کا تعلق ہے وہ خود اُنہیں جاتے ہوئے ساتھ لے
جائے گی۔ یہاں سو چور چکار کا ڈر رہتا ہے۔ جب لڑکی جوان ہو جائے گی
تو پھر آجائیں گے۔ اور پھر جیسے خلاء میں دیکھتے ہوئے ماں نے کہا تھا "رامو
کی شادی بھی کرنی ہے اور گھر کی حالت تم سے چھپی نہیں۔

اور سنیکری نے جیسے کچھ سنے بغیر ہی یہ سب کچھ منظور کر لیا تھا۔

. . . .

رات کو جب سنیکری اپنے مکان کی کھلی چھت پر سوئی تو اسے نیند
نہیں آئی۔ ساتھ لگی ہوئی بچی دودھ پیتے پیتے چھاتی مُنہ میں لئے ہی سو
گئی تھی۔ سنیکری نے اسے الگ کیا اور کروٹ بدلی۔ اوپر آسمان میں
پورنماشی کا چاند اپنی کرنوں کا تاج پہنے پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔
سنیکری کے دل سے ایک سرد آہ نکل گئی۔ ان دو برسوں میں وہ زندگی کو کتنا
زیادہ سمجھنے لگی تھی۔ دائیں طرف ایک ڈھیلی سی چارپائی پر گٹھری سی بنی
ہوئی اور نیند میں بے سُدھ ماں کی طرف اس کی نظر گئی اور رنج اور نفرت
سے اس کا گلا بھر آیا۔ یہ قسمت کی تحریر ہے یا ماں باپ کا لیکھ؟ قصور،
والدین کی محبت ایک بے معنی اور فضول بات ہے۔ حالات کی آندھی کا
ایک جھونکا تک تو وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ نہیں تو روزانہ اتنے ماں
باپ اپنی لڑکیوں کو یوں بھٹی میں نہ جھونک دیتے۔ اس وقت سنیکری
کو ایک اور بات یاد آئی جو ایک دن اس کے شوہر نے اپنے خاندان
کی برتری کا ثبوت دیتے ہوئے اُسے سنائی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔۔۔
"پچھلے وقتوں میں اعلیٰ خاندانوں میں تو لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا
گھونٹ دیا جاتا تھا۔ بوڑھی دادیاں، پردادیاں، اور جہاں وہ نہ ہوتیں وہاں
ماں ہی لڑکی کے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا گھونٹ دیتی تھی۔ اور جہاں
مائیں اس قابل نہ ہوتیں، وہاں دائیاں بڑی خوبی سے یہ فرض سرانجام دے
دیتی تھیں اور ننھی بچی کی پوٹلی باندھ کر اسے زمین میں گاڑ آتی تھیں"۔ عورت
ہی عورت پر کتنے ظلم ڈھاتی ہے؟ بستر پر پڑے پڑے اُس کا دم
گھٹنے لگا۔ گویا ایک ناقابل برداشت آگ اس کے روئیں روئیں میں دُھو
دُھو کر کے بھڑک اٹھی۔ اس کی ماں نے اُسے جنتے ہی کیوں اس کا بھی گلا نہ
گھونٹ دیا۔

آنکھوں کے بھیگے ہوئے کونوں کو دامن سے پونچھ کر اس نے
کروٹ بدلی۔ محلے کے نیم پر بیٹھا ہوا اُلوؤں کا جوڑا اپنی کرخت آوازیں
چیخ اُٹھا۔ ہوا سائیں سائیں کرنے لگی اور اوپر آسمان میں ایک بڑی سی چمگادڑ
اپنے پروں کا سایہ دیوار پر ڈالتے ہوئے گذر گئی۔

سنیکری کے سامنے اس کے سب گہنے ایک ایک کر کے آئے
جھومر، پھول، کلپ، کانٹے، کنٹھی، مالا، رانی ہار، بند، کنگن چھلّے۔ جوشن
...... کیا وہ ان میں سے ایک کو بھی انگ نہ لگا سکے گی؟ کیا ان سب
کو اب اس کی بھاوجیں پہنیں گی؟ کیا وہ اپنے پیارے گہنوں کے لئے ایک دم
غیر ہو جائے گی؟ اور ایک ناقابل برداشت حسد سے اس کا تن من جل اٹھا اور
اپنے گہنوں کو ایک بار جی بھر کے دیکھ لینے کی خواہش اس کے دل میں پیدا
ہوئی۔ اس نے اس خواہش کو دبانے کی بھی کوشش کی۔ اسے اپنی بیوگی
کا بھی خیال آیا۔ اس نے بیوہ کے دھرم اور سماج کی پابندیوں کی بات بھی
سوچی۔ لیکن اس کی یہ خواہش ہر لحظہ تیز تر ہوتی گئی۔ آخر وہ آہستہ سے اُٹھی
اس نے کنکھیوں سے ماں کی طرف دیکھا جو دن بھر پیٹ پیٹ کر تھکی ہوئی
خراٹے لے رہی تھی۔ وہ دبے پاؤں چلتی ہوئی نیچے اپنے کمرے میں پہنچی۔
اپنے سب قیمتی کپڑے اس نے نکال لئے۔ نیچے سے لال ساڑھی نکلی جو
اس نے شادی کے دن پہنی تھی اور ایک نامعلوم ترغیب کے زیر اثر اس نے

بیٹے، ہوگی کا اشتہار دینے والے کپڑے اتار کر اسے پہننا شروع کر دیا۔ ساڑی پہن کر اس نے بلاؤز پہنا۔ پھر اس نے گہنے نکالے ایک ایک کر کے ان کو پہنا۔ ہاتھوں میں کنگن ڈالتے وقت اسے معلوم ہوا کہ وہ کتنی کمزور ہو گئی ہے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سُرخ حلقہ پھر گیا جو کبھی کنگن کے کلائی پر پھنس جانے سے پیدا ہو جاتا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے گئی۔ اس کے گول گول گالوں میں گڑھے پڑ چلے تھے۔ جبڑوں کی ہڈیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ اور ابھی اس کی عمر صرف اٹھارہ برس کی تھی۔

ایک لمبا سانس بھر کر وہ وہیں ٹرنک پر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں کے سامنے چار برس پہلے کا ایک واقعہ آ گیا۔ جب پرمیشری برہمنی کے ہنس مکھ لڑکے نے اس کی کنپٹی کا ٹہک باندھیا تھا۔ اسی دن کی طرح ایک نا معلوم سی مسرّت کی جھرجھری اس کے تمام جسم میں دوڑ گئی۔ دُور کہیں مسلمانوں کے محلّے میں مرغ نے اذان دی۔ سنیکری چونک کر اُٹھی۔ سب گہنے اُتار کر اس نے ٹرنک میں بند کئے۔ کپڑے تہ لگا کر رکھے اور دبے پاؤں اوپر پہنچی۔ چاند اس وقت دائیں طرف کے اونچے مکان کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔ سنیکری چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا لیٹی۔

. . . .

دوسرے دن جب ماں واپس جانے لگی اور اندر لے جا کر اس نے سنیکری سے گہنے مانگے تو اس نے ٹال دیا۔

اُپندر ناتھ اشک

رات کا پچھلا پہر

زمانہ خواب میں ہے اور جاگتا ہوں میں
نگاہ تاروں سے بیٹھا لڑا رہا ہوں میں
یہ خامشی، یہ اندھیرا، یہ عالمِ خلوت،
مزا سکون حقیقی کا پا رہا ہوں میں
ہوا نے چھیڑا ہے اک گیت سازِ ظلمت پر
وفورِ کیف کے عالم میں کھو گیا ہوں میں
زمانہ سویا ہے، بیدار ہے مِرا احساس
کسی کی یاد کو دل میں بسا رہا ہوں میں
یہ عطر پاش ہوائیں، یہ کیف کا عالم
نہ جانے کون سی دنیا میں آ گیا ہوں میں
ہے پی کہاں کی صداؤں سے اک جہاں معمور
تلاشِ دوست کا ہنگامہ دیکھتا ہوں میں
ہے شب کا پچھلا پہر اور نمودِ صبح قریب
طلوعِ مہر کے آثار دیکھتا ہوں میں
یہ وقت ہے کہ عبادت میں محو ہے دنیا
طواف شعر کی دیوی کا کر رہا ہوں میں

تاجور سامری

شعر

ٹوٹے چمک چمک کے ستارے امید کے
اک خواب تھا کہ تا بہ سحر دیکھتے رہے

آرزو لکھنوی

دو غزلیں

(۱)

آپ کا زرتار دامن کاروانِ رنگ ہے
لہر یا آنچل غبارِ کہکشانِ رنگ ہے

پاؤں پر نقشِ حنا، ماتھے پہ ٹیکا صندلی
یہ زمینِ رنگ ہے، وہ آسمانِ رنگ ہے

نیلو فر نیلم ہے گویا موتیا الماس ہے
آج ہر جنسِ چمن جنسِ دکانِ رنگ ہے

کیا تماشا ہے کہ نغموں پر ہے دھوکا نور کا
کیا تماشا ہے کہ نکہت پر گمانِ رنگ ہے

داستانِ رنگ ہے صحنِ چمن میں کشتِ گل
بلبلوں کا شور شرحِ داستانِ رنگ ہے

اور کیا ہے رنگ و نغمہ کے سوا عابدؔ کے پاس
رازدانِ نغمہ ہے، افسانہ خوانِ رنگ ہے

(۲)

آج پھر اُن کو گلستاں میں خراماں دیکھا
رنگ کو رقص میں نکہت کو پرافشاں دیکھا

گوشۂ باغ میں اک ماہِ منوّر چمکا
اُفقِ ناز سے اک مہرِ درخشاں دیکھا

پھر ہوئے روح میں اصنامِ تمنّا بیدار
پھر وہی قائدۂ جلوۂ جاناں دیکھا

پھر درِ دل پہ جنوں آ کے پکارا ہشیار!
پھر وہی سلسلۂ زلفِ پریشاں دیکھا

جس کی تابش سے کبھی بزمِ وفا روشن تھی
آج اس شمع کو محفل میں فروزاں دیکھا

جانے کیا دیکھ لیا آج کہ باسوز و گداز
ہم نے عابدؔ کو سرِ راہ غزل خواں دیکھا

عابد لاہوری

جرمنی کا یہودی شاعر

ہائنے

انگریزی نقّاد اور شاعر میتھیو آرنلڈ اپنی ایک نظم "ہائنے کی قبر" میں لکھتا ہے:۔

"روحِ عالم نے انسان کی بے ڈھب باتوں کو دیکھا، لاف زنی کو دیکھا،
کارہائے نمایاں کو دیکھا اور ایک نفس لمحے کے لئے اس کے چہرے
پر ایک بناوٹی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
یہی مسکراہٹ ہائنے تھی!"

ایک یہودی مصنّف ہائنے کے متعلق لکھتا ہے کہ وہ ایک المانوی پیرسی تھا، ایک یہودی جرمن، ایک ایسا سیاسی جلاوطن جو ساری عمر اپنے پرانے پیارے جرمن گھر کو ترستا رہا، اُس کا دُکھ درد کو دیکھنے کا انداز نظر مادّی تھا لیکن اُس کا دکھ درد کو جھیلنے میں صبر و استقلال مذہبی، وہ ایک رومانی شاعر تھا جو قدیم اصنافِ شعری میں ایک جدید روح کا اظہار کرتا تھا، وہ ایک غریب، بے چارہ یہودی تھا۔

اور ہائنے کا سوانح نگار ولیم شارپ لکھتا ہے کہ وہ ایک رومانی تھا لیکن رومانیت کا زبردست دشمن بھی تھا۔ وہ اَب سچا شاعر تھا، لیکن ایک پیدائشی صحافت نگار بھی تھا۔ وہ ایک تاریخ دان تھا لیکن اس کا کوئی اصولِ تاریخ نویسی نہ تھا۔ وہ ایک فلسفی تھا لیکن اس کے کوئی نظریئے نہ تھے وہ طرزِ حیات میں آزاد رو تھا لیکن اپنی بیوی سے وفادار رہا اور اپنی ماں کی عزّت کرتا تھا، جرمن شعرا میں سب سے نازک احساسات اُس کے کلام میں ملتے ہیں لیکن سب سے بڑھ کر ترش بیانی بھی اُسی کے ہاں ہے۔

وہ ایک جرمن تھا لیکن اُس کی ہستی جرمنی کے لئے ایک تازیانہ تھی۔ وہ انگلستان کے شعراء کا دلی مدّاح تھا لیکن اسے انگریز قوم اور انگلستان کی ہر بات سے نفرت تھی۔ جذبات پرستی کی وہ ہنسی اڑاتا تھا، لیکن خود بھی ایک جذباتی انسان تھا۔ اُس کی صحت اچھی نہ تھی، لیکن اُن مصائب کو اُس نے زبردست استقلال اور ہمّت سے برداشت کیا جن کا عشر عشیر بھی آج تک کسی اور شاعر کو نہیں دیکھنا پڑا۔

ہائنے کی زندگی میں بھی ایک فرانسیسی نے اس کے متعلق اسی طرح کی متضاد رائے قلمبند کی تھی، ۔۔۔ "یہ کہنا محض بیکار تضاد پرستی ہی نہیں ہے کہ ہائنے میں سختی بھی ہے اور ملائمت بھی، بے رحمی بھی ہے اور نرمی بھی، سادگی بھی ہے اور پُرکاری بھی، تغزّل بھی ہے "درشتیت" بھی، جذبات کا اُبلتا ہوا جوش بھی ہے اور ضبطِ احساس بھی، قدامت بھی ہے اور جدّت بھی"۔

ہمارا تجسس پوچھ سکتا ہے کہ وہ کون سا زمانہ تھا، وہ کون سی سماج تھی، وہ کیسی نسل تھی، وہ کیسا ماحول تھا جس سے ہائنے کا تعلق ہے۔ اور اس مجموعۂ اضداد کی شرح و وضاحت کی طلب میں ہمارا تجسس یقیناً حق بجانب ہوگا۔

ابھی ہائنے چھوٹا سا لڑکا ہی تھا کہ فرینک فورٹ میں جہاں اس کے والدین رہتے تھے کسی یہودی کو کسی باغ یا تفریحی مقام پر آنے جانے کی اجازت نہ تھی، اتوار کے دن کوئی یہودی چار بجے کے بعد اپنے گھر سے باہر آجا نہ سکتا تھا، اور سال بھر میں صرف چوبیس یہودیوں کو شادی کرنے کی اجازت ملتی تھی۔ ہائنے کے دل کی اندھی نفرت اور آتشں احساسات نے اسی ماحول میں پرورش پائی تھی۔

لیکن ایسے ماحول کی تخلیق کا باعث کیا ہو سکتا ہے؟ ۔۔۔۔۔۔

اپنی کتاب "تہذیب کی نشوونما" میں مغربی محقق ڈبلیو، جے، پیری نے ایک

جگہ لکھا ہے "تہذیب میں دو بڑے رجحان کارفرما ہیں: ایک طرف تو تعمیری رجحان ہے جس کی وجہ سے لوگوں نے آج تک نت نئی دریافتیں کی ہیں، علوم و فنون اور صنعتوں کو فروغ دیا ہے، دنیا کے مختلف حصّوں کے درمیان سلسلۂ پیام رسانی کو جاری کر کے اُسے قائم رکھنے کی کوشش کی ہے، اُن نئی سرزمینوں کو آباد کیا ہے جہاں دل پسند اشیاء موجود تھیں، کتابیں، نظمیں اور ناٹک لکھے ہیں، تصویریں بنائی ہیں، راگ کی تخلیق کر کے نئے سے نئے گیت گائے ہیں اور اَن گنت وہ باتیں کی ہیں جن کی وجہ سے تہذیب ایک قابلِ قدر چیز بن گئی ہے —— اور دوسری طرف۔ اس کے ساتھ ہی چند خامیوں نے جو تہذیب کی نشو و نما کے دوران میں انسانی تعلقات میں پیدا ہو گئیں سماجی ہم آہنگی کو توڑ دیا ہے"۔

ان الفاظ کی روشنی میں جب ہم یورپ کی یہود دشمنی کو دیکھتے ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ انسانی تعلقات میں ان خامیوں کے پیدا کرنے میں مذہب اور نسلی امتیاز و افتخار کا درجہ کم نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مذہب جو انسان کی زندگی میں بہت سی باتوں کا بنانے والا ہے، وہی جب ذہنیتیں تخریب آلود ہو جائیں تو ایسے بگاڑ پیدا کر دیتا ہے جن کا سُدھار کسی کے بس کی بات نہیں رہتا۔

ہائینے کو اپنے یہودی نسل سے ہونے کا احساس تھا، چنانچہ اپنی ادبی تخلیقات کے دوران میں وہ اکثر اپنے کو یونانی یہودی کہتا رہا۔ شاید اس طرح اس کی نظر میں یہودی خون کا اثر کم ہو جاتا تھا۔ شاید وہ یونان کے فنون و ادب کے ذخائر کی وجہ سے اپنے کو یوں منسوب کرنا چاہتا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک خالص یہودی تھا۔

یہاں اُس اختلاف کا اظہار بھی بے جا نہ ہوگا۔ جو ایک یونانی اور یہودی کے زندگی اور ادب اور آرٹ سے متعلق نظریوں میں ہے۔ یونانی کسی تخلیق کا جواز اُس مسرت کو سمجھتے تھے جو کسی فن کار کو کسی چیز کے بنانے میں حاصل ہوتی ہے، گویا وہ صحیح معنوں میں "فن برائے فن" کے قائل تھے لیکن یہودی اپنی تمام تاریخ میں اس قسم کے ممتاز، بلند اور انفرادی مقصد سے کبھی بھی مطمئن نہ تھے اُن کا مطمحِ نظر اگر کوئی ہو سکتا ہو تو یہ تھا کہ "فن برائے حیات"۔

توریت کے مرتب کرنے والے پجاری پیغمبروں سے لے کر زبور کے نغمہ خواں تک، اُن کے تصور کے افق پر صرف ایک ہی رنگ چھایا ہوا تھا —— جمہوری رنگ۔ ماضی کے یہ تمام یہودی اپنے نغموں اور اپنی زندگی کو ایک ہی چیز سمجھتے تھے۔ یہ سب لوگ آسمانی باتوں کو زمین پر پھیلانے والے پیغمبر تھے۔ انہیں اپنی ذات پر پورا بھروسہ تھا، پیغامبری کی روحانی نسبت نے ان میں ایک خود بینی پیدا کر دی تھی اور اس کی وجہ سے وہ اپنے کو محض فن کار سے بالاتر تصوّر کرتے تھے۔ جب وہ خدا کی حمد میں ایک والہانہ نغمہ الاپتے تھے تو حقیقت میں وہ اُن خدائی صفات کو سراہتے تھے جو اُنہیں انسان میں نظر آتی تھیں۔

اُن کے لئے حسن کی ہستی کو تسلیم کرنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ حُسن اُن کے ساتھ شانہ بہ شانہ کھڑا ہو، ان کے ساتھ مل کر ہر کام کرے، اُن کے ساتھ مل کر کھائے پیئے، اُن کے ساتھ مل کر زیست کی تگ و دو کے لئے اپنا خون پسینہ ایک کر دے، انہی کی طرح دکھ درد سہے، اور اُن کی روزمرّہ کی اُمنگوں، آرزوؤں اور خوابوں کا ایک جُزو بن جائے ان کے لئے حسن کی من موہن خصوصیات ہی اس کا جواز نہ تھیں۔ خود ہائنے کہتا ہے کہ اہلِ یہود ایک ایسی نسل ہیں جن کی جبلت میں ہی بغاوت فساد، استقلال و استحکام کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسی نسل ہیں جسے یونانیوں کے حد سے بڑھے ہوئے شعور اور بلند وقار سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے —— اور خود ہائنے کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ایک غیر معمولی جذباتی اور تیز مزاج انسان تھا۔ اور اس لحاظ سے مشرقی، صحیح معنوں میں سامی نسل کا ایک فرد، اور اُس کے احساس اُس وقت پوری تیزی پر ہوتے تھے۔ جب وہ اپنے درد کو طنزیہ قہقہوں میں چھپاتا تھا —— یہودیت سے ہائنے کا اُدب نہ صرف اُس کے ملکی حالات کا آئینہ دار ہے، ورنہ برتری کے لحاظ سے یہودیوں کا درجہ بہت بلند ہے۔ یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے سب سے پہلے خدا کی وحدانیت کا تصور قائم کیا۔ آج بھی دنیا کا سب سے بڑا احساب دان حکیم آئن سٹائن ایک یہودی ہے اور نفسیات جدید کا پیمبر ڈاکٹر سگمنڈ فرائڈ بھی اسی نسل کا ایک فرد تھا۔ آج کی بات کو جانے دیجئے، تاریخ بتاتی ہے کہ یورپ سے اپنے تعلق کے آغاز ہی سے، اُس وقت سے جب کہ ابھی یورپ کی موجودہ قومی زبانوں اور علم ادب کی ساخت بھی نہ ہوئی تھی، وہاں کی تمدنی زندگی میں اہلِ یہود کا نمایاں حصّہ رہا ہے۔ اُس قدیم یونانی زمانے میں بھی جس کا علم روما سے ہوتا ہوا، پھیل کر، تمام یورپ پر چھا گیا۔ اسکندریہ میں بہت سے یہودی شاعر، یہودی ڈرامہ نگار، یہودی فلسفی اور یہودی تاریخ نویس تھے اور

وہ سب یونانی زبان میں لکھتے تھے۔ جہاں کہیں بھی یہودی رہے ہیں انہوں نے سماج کو اپنی مفید کارگزاریوں سے شاداب کیا ہے۔ تاریخ مذہب میں تو اُن کے حصّے کو پوری طرح تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن سماجی تعلقات، تفکّر اور علم ادب اور بعض دوسرے میدانوں میں انہوں نے نوعِ انسانی کی جو خدمت بجا لائی ہے اُس کی طرف سے یا تو اغماض برتا گیا ہے یا اُس پر بہت ہی کم توجّہ دی گئی ہے۔

ایک مشہور یہودی کے اِس ادّعا کو خواہ یورپ کی عیسائی قومیں گستاخی پر ہی کیوں نہ محمول کریں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ "وہ کون سی قوم ہے جس نے بنی اسرائیل کی سلطنت میں سے اپنا حصّہ نہ لیا ہو؟" —— اسی نظریے کی ایک مثال ہائنے کا کلام ہے۔ ہائنے جرمن زبان کا وہ شاعر تھا جس نے یورپی علم ادب کی مشہور تحریک رومانی پر ایک زبردست اثر کیا۔ لیکن ہائنے کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے اس تحریک کے متعلق بھی کچھ جان لینا ضروری ہے۔

۲ علمِ ادب کی مثال صاف، کھلے، پھیلے ہوئے آسمان کی سی ہے اور اس آسمان میں مختلف شعراء چاند ستاروں اور سیّاروں کی مانند ہیں۔ اگر اس استعارے کو ذرا بڑھایا جائے تو ادبی تحریکیں وہ آتے جاتے بادل ہیں جو فضائی تغیّر کا باعث ہوتے ہیں اور آسمان پر چمکتی ہوئی بجلی کو اگر ہم اندرونی اثرات سمجھ لیں تو بادلوں کو بہا کر لانے اور لے جانے والی ہواؤں کو بیرونی تاثرات کہہ سکتے ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے یورپ میں وہاں کے ادب کے آسمان پر ایک زبردست تحریک کے بادل چھائے۔ اس تحریک کو رومانی تحریک کہا جاتا ہے۔ ایک مغربی نقّاد نے اس تحریک کے متعلق ذیل کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

نوعِ انسانی کی نشو و نما اور ارتقا میں مد و جزر کی طرح دو بنیادی تحریکیں کارفرما ہیں۔ ان میں سے ایک مرکز کی طرف آتی ہوئی تحریک ہے اور دوسری مرکز سے ہٹتی ہوئی۔ ان تحریکوں کو ہم کئی نام دے سکتے ہیں ——
محدود، وسیع ..... تنظیمی، تخریبی ..... ساکن، متحرک ..... جامد، مشتق ..... قدامت پرست، انقلابی ..... کلاسیکی اور رومانی۔

سطحی طور پر یہ رجحان خواہ کتنے ہی متضاد اور مختلف کیوں نہ معلوم ہوں، حقیقتاً ان کی حیثیت اضافی ہے۔ زندگی کے بہاؤ کی موزونی کو قائم رکھنے کے لئے ان کا باہمی سمجھوتہ اور تبادلہ ضروری ہے۔ یہ دونوں تاریخ کی لازمی خصوصیات ہیں۔ جب جوش و خروش اور بے ترتیبی کا زمانہ گذر جاتا ہے تو تنظیم کا دور آتا ہے اور جب یہ تنظیم کا زمانہ ایک مضرِ حیات یکسانی اور بیزاری پیدا کر دیتا ہے تو کسی انقلابی محرّک کی ضرورت پیدا ہو جاتی ہے تاکہ زندگی اور سماج پر ایک جمود نہ طاری ہو جائے۔ یوں زندگی یا دہ پر اسرار روحِ حیات جسے ہم جو بھی جی چاہے نام دے لیں خود بخود ایک روانی کے ساتھ بڑھتی اور بہتی رہتی ہے۔

جس طرح تاریخ انسانی کے یہ دو پہلو ہیں، اُسی طرح انسانی شخصیت میں بھی ایسے ہی دو اہم پہلو کارفرما ہیں۔ انسانی شخصیت میں جو سوچنے والا پہلو ہے وہ عموماً تنظیم کی طرف مائل رہتا ہے۔ اور نہ سوچنے والے پہلو کا رجحان ہر اس بات کو بدل دینے کی طرف ہوتا ہے جو یک رنگ اور قدیم ہو جائے۔ لیکن اگر ان دونوں میں سے ایک ہی تحریک کام کرتی رہے تو زندگی کو بہت جلد زوال آ جائے۔ بنتے ہیں لاکھوں بگڑ بگڑ کر، بگڑ گئے بے شمار بن کر —— یوں ہی یہ نظام قائم ہے۔

اگر صرف سوچنے والا پہلو ہی زندگی کی رہنمائی کرتا رہے تو بہت جلد زندگی کی وہ خصوصیت زائل ہو جائے جس سے ہر بات کی تجدید ہوتی ہے یوں سماجی جسم ایک زندہ نظامِ عمل کی بجائے ایک منظّم مشین کی صورت اختیار کر لیگا اور اگر صرف نہ سوچنے والا پہلو ہی کارفرما ہو جائے تو اس کا نتیجہ بدنظمی اور ہیولیٰ کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

نوعِ انسانی اور حیاتِ انسانی کا وہ پہلو جو معیّن، ساکن اور علمی ہے، اسی کو ہم سوچنے والا پہلو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر اُس دور میں جب سوچنے والے پہلو کا اقتدار ہو، زندگی کا "اندھا بھید" گھٹ گھٹا کر چند مدلّل اصولوں کا تابع ہو جاتا ہے، ایسے وقت میں احساسات وجذبات اور مذہبی تجربات —— یہ سب باتیں انسان کو مشکوک نظر آتی ہیں۔ لیکن اس کے مقابلے میں اگر نہ سوچنے والے پہلو کے سامنے مکمل طور پر ہار مان لی جائے تو انسان کا اندرونی استقلال و استحکام، انسان کی قوّتِ ارادی بلکہ عقلِ سلیم بھی ضائع ہو جائے۔

انسانی نشو و نما کو سوچنے اور نہ سوچنے والے پہلوؤں کے باہمی عمل میں ایک توازن درکار ہے۔ لیکن نشو و نما کے تقاضے کے مطابق ان دونوں پہلوؤں کا تناسب گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ چنانچہ عین ممکن ہے کہ آج جس رجحان کو زندگی اپنی ضرورت کے لحاظ سے سچ سمجھ کر اختیار کرے اُسے شاید کل جھوٹ ہی تصور کیا جائے۔ ارتقائے انسانی کا ہر دور اپنی مخصوص سچائیوں کا حامل ہے اور وہ سچّائیاں اُسی وقت تک برحق شمار کی جا سکتی ہیں جب تک وہ مفیدِ مطلب ہیں، جب تک اُن میں

زوروں سے۔ ان کے مفید پہلو کا زور ختم ہوا اور ان کی بجائے نئے حقائق اور رجحانات آگے جو نہ صرف پہلی باتوں سے مختلف ہو سکتے ہیں بلکہ یکسر ان کے متضاد۔ چنانچہ آج اگر ایمان بالغیب کا مذہبی دور ہے تو کل سوچ بچار اور عقلی دلائل کا زمانہ آجاتا ہے۔ آج اگر خوشمند انہ مادیت کا دور دورہ ہے تو کل اس عمل کا ردِ عمل رومانیت اور جذبات پرستی کی صورت میں نمودار ہو جاتا ہے۔ یورپ میں رومانی مادیت کا دور جب ختم ہوا تو تمام پہلے تصور بدل گئے اور عیسائیت نے ایک نیا انسان بنا ڈالا اور اسی طرح موجودہ مادی دور کا پیشرو آج سے سو سال پہلے کا وہ زمانہ تھا جب رومانیت کی لہر پھیل کر تمام یورپ کے ادبی شعور پر چھا گئی تھی۔

یہ کہنا کچھ غالباً معلوم ہوتا ہے کہ وہ تحریک جسے رومانی تحریک ادب کہا جاتا ہے اُس انقلاب کا ایک حصہ تھی جو یورپ کے شعور ذہنی میں نمودار ہوا۔ یہ ذہنی انقلاب ایک ایسی کیفیت تھی جس نے لوگوں کو زندگی اور دنیا کے متعلق اپنے اندازِ نظر کو یکسر تبدیل کر کے از سر نو قائم کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس نئے اندازِ نظر کی تخلیق کئی وجوہ سے ہوئی۔ ان میں سے ایک اہم وجہ اٹھارھویں صدی عیسوی کی یورپی تہذیب کا ایک طرفہ استدلال اور تکلف تھا۔ کیونکہ اگرچہ اس صدی میں یورپ کے ہر ملک میں احیائے علوم و فنون ہوا۔ مگر اس صدی کے علم و فن میں اور علم و فن کی جستجو میں ایک نئی روشنی تو تھی البتہ علم و حکمت کی گہرائی نہ تھی اور یہ نئی روشنی اس قابل نہ تھی کہ وہ ذہنوں کو ذات پات اور سماجی پابندیوں کے بندھنوں سے رہائی دے سکے۔ اس زمانے میں سماجی شائستگی کا معیار حاصل کرنے کو کسی شخص کے لئے ضروری تھا کہ وہ معاشرتی ممنوعات کا زبردست لحاظ رکھے۔ اس پر تکلف اور ساختہ ماحول کے باعث اٹھارویں صدی کی یورپی تہذیب فطری روش سے بہت ہی دور ہو گئی۔ اتنی دور کہ ان دونوں میں کوئی تعلق ہی نہ رہا۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان میں از سرِ نو ہم آہنگی پیدا کی جائے۔

اسی اٹھارھویں صدی کے آغاز کے بعد اور انیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں اُس اندرونی جوش اور اُبال کی تخلیق، نشوونما، بلندی اور زوال ہوا۔ جسے "رومانیت" نے تعبیر کرتے ہیں۔ وضاحت کے طور پر عموماً کہا جاتا ہے کہ یہ "رومانیت" ادب اور زندگی کی فرسودہ رسموں کے خلاف ایک بغاوت تھی، انفرادی احساسات و تخیل کی ایسی فتح تھی جو رومان نوازوں کو ذہنی پژمردگی پر حاصل ہوئی۔ حقیقی زندگی کی بے مزہ کیفیتوں سے فرار۔ دور دراز کی غیر معین اور لامحدود دلچسپیوں کے لئے ایک تشنگی، وغیرہ وغیرہ۔

رومانیت کی یہ تمام وضاحت صحیح ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ ایک تشنگی، ایک فرار، ایک فتح اور ایک بغاوت سے زیادہ پیچیدہ اور گہرا معاملہ ہے۔ کیونکہ ایک طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ "رومانیت" کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنے کہ رومانی افراد ــــ لیکن ان افراد میں بھی چند خصوصیتیں یکساں ہوتی ہیں، اُن خصوصیتوں کے اجتماع کا ہی دوسرا نام رومانی ذہنیت رکھا جا سکتا ہے۔

اس رومانی ذہنیت کے تصور اور مفہوم کو سمجھنے کے لئے فرانس کے ادیب ردسو کی شخصیت پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالنا چاہئے۔ روسو کو اکثر یورپی رومانیت کا روحانی باپ کہا گیا ہے۔ اگرچہ اس کا وجود رومانیت کی تحریکِ ادبی سے بہت پہلے ہوا پھر بھی رومانی ذہنیت کے مطالعے کے لحاظ سے روسو ایک بہت اچھا موضوع ہے۔ اس کی شخصیت میں ایک گہرا مانع عقلیت رجحان تھا اور اس کے ساتھ ہی اس میں اُس مدافعت کی بھی کمی تھی جس کا ہونا حقیقت سے مقابلے کے لئے ضروری ہے اور جس کے نہ ہونے کی وجہ ہی سے ذہن انسانی اس دنیا سے تنگ آکر رومانی رجحانات کا حامل ہو جاتا ہے اور اس میں ایک تنفر کرانہ خود بینی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ حقیقی زندگی کے عملی پہلو کا ایک خیالی نعم البدل سوچ لیتا ہے۔ روسو کے مشہور عالم "اقبال نامے" سے ظاہر ہے کہ وہ ایک جھجکنے والا، شرمیلا سا انسان تھا، سپنے دیکھنے کا عادی جس کی ہستی ہمیشہ حالات و واقعات کے رحم پر اپنے دن گذارتی رہی۔ قوتِ عمل کی کمی نے اُسے کشمکشِ حیات سے پنپنے کے ناقابل بنا دیا تھا۔

اس کے علاوہ سماجی طور پر وہ ایک "مردود" انسان تھا۔ اپنے طبقے کو چھوڑ کر اس نے سماج کے جس اونچے طبقے میں اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنے جوہر خداداد کے بل پر بار پایا، اُس طبقے نے اُسے کبھی بھی برابری کا رتبہ نہ دیا۔ اُسے ہمیشہ ایک "طباع اچھوت" ہی سمجھا گیا۔ اور روسو ایسے حساس انسان کو یہ بات ہمیشہ ناگوار گذرتی رہی اور اس کی خود پسندی و خود بینی کو صدمہ پہنچاتی رہی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ اُس کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ گئی کہ عملی لحاظ سے اُس کی سیرت میں جو خامیاں ہیں اُن کی ذمہ داری اُس پر نہیں بلکہ اس سماج اور اُس تہذیب پر عائد ہوتی ہے جس کی وہ پیداوار تھا اور اس کی تمام تصنیفات میں اسی خیال کی ترجمانی ہونے لگی وہ اپنی خارجی

زندگی اور اپنے ماحول کو الزام دینے لگا۔

یورپ کے جدید شعور کے لحاظ سے روسو کی اہمیت اس بات میں ہے کہ وہ پہلا شخص تھا جس نے اُس "علٰحدگی" اور "دُوری" کے چند پہلوؤں پر روشنی ڈالی جو یورپ میں لوگوں کے ذہنوں پر ایک ہمہ گیر طریقے سے اُس وقت چھا رہی تھی، جب پرانے جاگیردارانہ نظام پر نیا صنعتی عہد بُری طرح حملہ آور ہو رہا تھا۔

جس بات کو "رومانیت" کہا جاتا ہے وہ اُس ہنگامہ پرور زمانے کا ایک متعلقہ ردِّ عمل تھا کیونکہ اُس زمانے نے پہلی تمام قائم شدہ رسموں اور قدر و قیمت کے معیاروں کو درہم برہم کر دیا تھا، تمام فرقوں اور جماعتوں کو باہم ملا دیا تھا، تمام اعتقادات کو مٹا دیا تھا، اور لوگوں کے ذہنوں کو ان کے داخلی مرکز سے ہٹا کر خارجی مرکز پر متوجہ کر دیا تھا۔ گویا روحانی اندازِ نظر کو مادّی اندازِ نظر بنا دیا تھا۔

یہ ایک عام دیکھی بات ہے کہ جب کبھی اس طرح کا انقلابی یا ہنگامہ پرور دَور طاری ہو اور اقتصادی اور سماجی لحاظ سے ایک بے ترتیبی اور بے اطمینانی پھیل جائے تو لازماً چند ایسے افراد پیدا ہو جاتے ہیں جو عضوی اعتبار سے کسی خاص گروہ یا جماعت سے تعلق نہیں رکھتے۔ وہ اپنے گردوپیش کے حالات کو قبول کرنے کے ناقابل ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یا تو یہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کی تگ و دو کا مقابلہ کرنے میں کمزور ہوتے ہیں یا وہ اپنے آپ کو نئے حالات کے مطابق نہیں ڈھال سکتے یا اُن کے اپنے شخصی مطالبات اور ذوق اس قدر بلند ہوتے ہیں کہ ان کی تسکین کبھی ہو ہی نہیں سکتی۔ ایسے افراد گویا ہجوم میں بھی تنہا ہی رہتے ہیں اور اپنے خارجی ماحول سے انہیں کوئی تعلق نہیں ہوتا اور یہ تنہائی یا علٰحدگی اُسی اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی ہے جتنا کہ کوئی شخص کم یا زیادہ حساس ہو۔ اور انتہائی حالتوں میں اس قدر خطرناک صورت بھی اختیار کر جاتی ہے کہ اُس فرد کے لئے اپنے خارجی حالات برداشت سے باہر ہو جاتے ہیں۔ اس کیفیت کی وضاحت روسو کے الفاظ میں یوں کی جا سکتی ہے:۔

"مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں اس زمین پر کسی اور سیّارے سے آگرا ہوں، جس پر میں نے پہلے زندگی گذاری ہے۔ خارجی دنیا میں مجھے جو بات بھی دکھائی دیتی ہے اُس سے مرے دل میں درد اور اذیّت ہی کی تخلیق ہوتی ہے"۔

گویا اس کیفیت کا ردِّ عمل صرف ایک ہو سکتا ہے یعنی ذہن کا مرکز خارجی سے داخلی دنیا میں تبدیل ہو کر قائم ہو جائے۔ اُس داخلی دنیا میں جہاں ہر طرح کی غیر عقلی دلچسپیاں اور امکانات موجود ہیں لیکن یوں غیر شعوری اور غیر مدلّل اثرات کا مفتوح بن کر ہی ممکن ہے کہ پہلے سے کہیں بڑھ کر متضاد باتوں کا سامنا کرنا پڑے۔ ایسی متضاد باتوں کا سامنا جو رہائی اور تسکین کی بجائے قوتِ ارادی کے آخری اجزا کے شیرازے کو بھی بکھیر دیں اور اس فرد کے اندرونی توازن کو درہم و برہم کر کے رہی سہی بات بھی گنوا دیں۔

ان نئی پیدا ہو جانے والی داخلی متضاد کیفیتوں سے نپٹنے کے لئے ایسا فرد ایک کام کر سکتا ہے کہ وہ اپنی رہنمائی کے طور پر کسی ایک خیال، تصوّر یا آدرش کو مقرّر کر لے جو اس کے ذہن کو ایک مرکز پر قائم رکھے۔ اور عموماً ہوتا بھی ایسا ہی ہے کہ ہر وہ شخص جو قوتِ عمل کی کمی سے گھبرا کر داخلی اندازِ نظر اختیار کر لیتا ہے، اپنے لئے کسی رہنما اصول کا سہارا خود بخود ڈھونڈھ لیتا ہے اور پھر اُسی کے بل پر آئندہ اظہارِ نفس کرتا ہے۔ رومانی ذہنیتیں جس اشتیاق سے اس سہارے کی جستجو کرتی ہیں اُسی سے ظاہر ہے کہ اس طرح کی نفسی مرکزیّت اور خود بینی رومانی ذہنیت کا ایک ستون ہے، اور دوسرا ستون وہ سچی تلاش ہے جسے رومانی رجحان والے افراد زندگی اور انسان میں ایک بلند ہم آہنگی کو حاصل کرنے کے لئے جاری کرتے ہیں۔ یہ ہم آہنگی وہ طفلانہ ہم آہنگی نہیں ہوتی جو ابتدائی وحشی انسان کا خاصہ تھی (یعنی حالات کے مطابق جُوں تُوں اپنے کو ڈھال لینا) اُس میں اور اس میں ایک امتیاز ہوتا ہے۔

وہ انتہائی داخلی اندازِ نظر جو کسی شخص کے زاویۂ نظر کو اس قدر محدود کر دے کہ وہ اس دنیا میں صرف اپنی ہی ذہنی کیفیتوں، اپنے ہی احساسات، اور اپنے ہی دُکھ درد کو دیکھتا رہے، ایک توازن چاہتا ہے اور یہ توازن اُس پُرجوش لیکن بے مصرف تمنّا سے پورا ہوتا ہے جو اس فرد کو اپنے آپ سے دور نکل جانے پر اُکساتی ہے بلکہ بعض دفعہ اُس عالمگیر حد تک پہنچا دیتی ہے جو ایک فرد کو ایک انسان سے بڑھا کر تمام بنی نوعِ انسان پر حاوی کر دیتی ہے۔ والٹ وٹمن کا کلام اس کی مثال ہے۔

گویا ایک ردّ کیا ہوا، تنہا علٰحدہ سا انسان اس لئے رومانی اندازِ نظر کا حامل ہو جاتا ہے کہ اس کے بغیر اس کے لئے زندگی کے ناقابلِ برداشت ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ تو حقیقت کو حسبِ منشا بنا سکتا ہے، نہ خود حقیقت کے مطابق بن سکتا ہے اور اُس کے اندر،

حیاتِ کُل کے درمیان جو خلاء پیدا ہو جاتی ہے اُس کے پُر کرنے کو اُس کا جذبۂ حفاظتِ نفسی اُسے اُکساتا ہے۔

اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے ایک رومانی فرد دو راستے اختیار کر سکتا ہے۔ اور راستے کا انتخاب اُس کی افتادِ طبع پر منحصر ہے ——— آیا وہ تیز اور عملی رجحان رکھتا ہے یا سست اور غیر عملی رجحان۔ غیر عملی رجحان والا ایک ایسی پناہ کی جستجو کرے گا جو اُس کے احساسِ تنہائی کے درد کو کم کر کے اُسے آرام دے، وہ ایک خیالی دنیا میں پہنچنے کی کوشش کرے گا، ماضی کے دھندلکے میں کھو جانے کی کوشش کرے گا، مستقبل کے سنہرے جال میں گرفتار ہونے کی جستجو کرے گا، اپنے ملک کو چھوڑ بیٹھے گا، کسی اور ملک کی طرف راغب ہو جائے گا، اپنے ماحول سے مختلف ماحول میں بسنا چاہے گا۔ شہری ہے تو مناظرِ قدرت اُسے پسند آ جائیں گے، دیہاتی ہو تو شہر کی الجھنوں میں جا پھنسے گا۔ دہریت کا قائل ہے تو اُسے مذہبی جنون ہو جائے گا، پابندِ مذہب ہے تو لا مذہبیت کو اپنا شعار بنا لے گا۔ تخیل پرستی، نظارہ بینی، روحانیات، جذبات پرستی ——— یہ سب وہ مختلف راستے ہیں جن پر ایسے افراد اپنی رومان پسندی کی وجہ سے جا پڑتے ہیں۔

اسی بات کو ہم چند لفظوں میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ غیر عملی اور مفکر رومان پسند زندگی سے پہلو تہی کرتا ہے اور دبی ہوئی قوتِ عمل والا رومان پسند زندگی اور حقیقت کا ایک زبردست ناقد بن سکتا ہے بلکہ بعض اوقات ایک باغی بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ میدانِ عمل سے باہر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک بھرپور زندگی کا آرزو مند بھی ہوتا ہے اور اس لئے معاشری ماحول سے اپنے تعلق کو ہم آہنگ نہیں بنا سکتا۔ اس لئے نتیجے کے طور پر معاشری ماحول اُسے اپنا دشمن نظر آتا ہے، اپنا ایک ایسا مخالف جو اُس کے ارادوں میں قدم قدم پر ایک روک بنتا ہو۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا "رومانیت" محض ایک کمزوری ہی کا دوسرا نام ہے؟ کیا یہ ایک طاقت نہیں، بلکہ طاقت کا سراب ہے؟ ——— جواب یہ ہے کہ "رومانیت" صرف کمزوری ہی کا دوسرا نام نہیں ہے۔ بہت سی مثالیں ایسے وقتوں کی پیش کی جا سکتی ہیں جب ایسی "رومانیت" کا ظہور ہوا جس میں ایک زور تھا اور ایک قوت تھی۔ لیکن یہ ضرور کہنا پڑے گا کہ ایسے دور صحیح معنوں میں رومانی نہیں تھے بلکہ کسی حد تک "ہیجانی" تھے یعنی اُن میں چند افراد اپنے خیالات کی بہتوں کو سر کرنے میں کوشاں رہے۔ جیسے آج کل اردو میں جوش ملیح آبادی یا ترقی پسند ادیب اور شعراء۔

ان تمام باتوں سے رومانی ذہنیت کی پیچیدہ حیثیت کا اظہار ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک واحد خصوصیتِ رومانی کا تعلق بھی بعض دفعہ ایسی جبلی تحریکات سے ہو جاتا ہے جن کو اصل رومانی اندازِ نظر سے دور کی بھی نسبت نہیں ہوتی۔ مثلاً اختر شیرانی اور حالی کو کوئی بھی ایک گروہ میں رکھنے پر تیار نہیں ہو سکتا لیکن ان دونوں شاعروں نے ایک ہی رومانی روحِ حیات کا مختلف اظہار اپنی اپنی طبیعت کے مطابق کیا ہے۔ حالی نے ماحول کے قومی زوال اور ذہنی جمود سے باغی ہو کر ایک نیا رستہ نکالا ہے اور اختر شیرانی نے اردو کی عشقیہ شاعری کی جنسی تخریب سے بیزار ہو کر اُس میں فطری شگفتگی پیدا کی ہے۔

اس حقیقت کو دیکھتے ہوئے رومانیت کی مخالفت نہیں کرنا چاہئے کہ رومانی شاعر ایسے افراد ہوتے ہیں جو اپنے داخلی احساسات اور خواب آلودہ جذبات کی بنا پر عملی زندگی سے مُنہ موڑ لیتے ہیں۔ رومانی تحریکات کی قدر و قیمت اُسی حساب سے بدلتی جاتی ہے جس سے ہم اُسے بروئے کار لائیں اور جس رخ پر ہم اُسے چلا دیں۔

بہر حال ایک بات مسلّم ہے کہ صحتِ خیال کے لئے استحکام کی ضرورت ہے اور استحکام کا نتیجہ حقیقت پرستی ہے۔ یا یوں کہئے کہ استحکام یا سکون و جمود سے رومانیت اور حقیقت پرستی کا وہ امتزاج پیدا ہو جاتا ہے جو ہمیں کسی حد تک غالب میں ملتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ غالب کی قنوطیت اُسے یہ کہنے پر مجبور کر دیتی ہے کہ

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔

اور اس کا اندازِ نظر غیر عملی یا رومانی ہو جاتا ہے لیکن غالب ہی ظاہری صورتوں کی ماہیت معلوم کرنے پر ہمیں اکساتا ہے "دلِ ناداں! تجھے ہُوا کیا ہے؟ ——— آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟ ——— ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟ ——— عشوہ و غمزہ و ادا کیا ہے؟" ——— اُس کا یہی تجسّس ہم میں حقیقت پرستی کے رجحان پیدا کرتا ہے۔

رومانی شعرا کی ادبی تخلیقات کا باعث زندگی سے اُن کی ہم آہنگی نہیں بلکہ یہ زندگی سے ان کی مناقشت تھی جس سے بچنے کو وہ اپنے لئے بہت سے شاعرانہ نعم البدل تلاش کرتے تھے۔

یہ تو ادب اور آرٹ میں کم و بیش یا مکمل رومانی رجحان رکھنے والے فن کاروں کی بات ہوئی۔ لیکن اس کے علاوہ ہم سب بھی ایک طرح

سے رومانی ہی ہیں خواہ ہم میں اور کسی قسم کی خصوصیات بھی ہوں۔ ہمارے رومانی ہونے کی کئی دلیلیں ہیں۔ ہم دنیا کی موجودہ حالت سے مطمئن نہیں اس لئے ہم رومانی ہیں، ہمارے دلوں میں زندگی کی بلند تر صورتوں کو حاصل کرنے کی ایک گہری آرزو ہے اس لئے ہم رومانی ہیں، ہم حسن اور تکمیل کے خواہاں ہیں اس لئے ہم رومانی ہیں۔ رومانیت کوئی خطرناک رجحان نہیں البتہ اس رومانیت کو اس طور پر تنظیم دینا کہ وہ عملی روش اختیار کر کے نہ صرف زندگی کے مطابق ہو جائے بلکہ اسے مکمل بنائے، اس میں ایک شدت پیدا کر دے اور ہماری تخلیقی کوششوں میں ایک نہ مٹنے والا تواتر پیدا کر دے، یہ بات از بس ضروری ہے۔

اسی رومانی ذہنیت اور رومانی تحریک کی مثال جرمنی کے یہودی شاعر ہائنے کی شخصیت ہے۔

ہیولاک ایلس لکھتا ہے کہ ہائنے کے ذہن کا ایک حصہ یونانی تھا اور دوسرا عبرانی ـــ لیکن خواہ ہائنے کے کلام میں اُس کا یونانی پہلو زیادہ تر کار فرما ہو یا عبرانی پہلو، اُس نے زندگی کے لئے جو آدرش قائم کیا تھا، اس کے لحاظ سے دونوں پہلوؤں کی مساوی حرکت ضروری تھی یا دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ وہ روح اور جسم دونوں کے سنجوگ کا جویا تھا۔

ایک جگہ وہ لکھتا ہے کہ از منۂ وسطیٰ کے مقدس اور خونخوار طائروں نے ہماری زندگی کے لہو کو اس درجہ چوس لیا ہے کہ دنیا ایک ہسپتال بن کر رہ گئی ہے۔ ہائنے کے دل و دماغ میں ماحول کے تأثرات سے جو تلخی پیدا ہو گئی تھی اس کا اظہار اس فقرے سے بخوبی ہوتا ہے۔
ہائنے کی پیدائش اُس وقت ہوئی جب گوئٹے کے جوہرِ خداداد کی چمک سے تمام جرمنی روشن ہو رہا تھا۔ جرمنی کے رومانی شعرا میں مرتبے کے لحاظ سے اس نے پہلا درجہ حاصل کیا، البتہ وقت کے لحاظ سے وہ ان شعراء میں آخر میں نمایاں ہوا۔ اس نے ارادہ و شعور کے ساتھ نئی احساسات روح کو پرانی شعری صورتوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ وہ اپنے فن کی تخلیق سادگی اور وضاحت کے ساتھ کرتا تھا۔ اُس کے کلام پر ایک نفسی رنگ چھایا ہوا ہے لیکن اس کے شعر کا عشرت پرستانہ رنگ کیٹولس کی طرح ایک بلندی اور وقار لئے ہوئے ہے۔

جرمنی کی تاریخ میں اپنے ملک کی آزادانہ ذہنی رہنمائی کے لحاظ سے لوتھر اور لیسنگ نمایاں درجہ رکھتے ہیں اور ہائنے کے دل میں ان دونوں کے لئے بہت عقیدت تھی اور وہ ان کے خیالات کو چاہ سے دیکھتا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ اپنے ملک کو پہلے سے زیادہ متحد اور باعظمت بنا دے۔ لیکن اُسے موجودہ حالات میں بہت سی باتیں پسند نہ تھیں۔ ان کے خلاف اُس کے دل میں ایک اندھا جوش تھا۔ پرانے نظام کے خلاف اُس کی پکار آج ہماری کس قدر ہم نوائی کرتی ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے "پرانے سماجی نظام کو مٹنا ہی ہوگا، اس نظام کی جانچ پڑتال خوب کر لی گئی ہے اور اسے مردود قرار دے دیا گیا ہے، اب اسے اپنی قسمت کو بھگتنا ہی پڑے گا۔ یہ پرانا نظام جس میں انسانوں کے دلوں میں دنیا سے بیزاری اور تلخی کی نشو و نما ہوتی ہے، جس میں انسان انسان سے ناجائز فائدے اٹھاتا ہے۔ اُن ٹوٹی ہوئی قبروں کو اب یکسر نابود کر دینا چاہئیے جو جھوٹ اور ناانصافی کے مسکن ہیں"۔

لیکن کسی شخص کی فطرت اور سیرت کو بخوبی سمجھنے کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات اور عام حالات کو مدِنظر رکھا جائے۔ جب ہم ہائنے کی زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں "آبِ حیات" میں سید انشا کا حال یاد آ جاتا ہے۔ آزاد مرحوم نے سعادت یار خاں رنگین کی زبانی انشا کی زندگی کے چار دور کئے ہیں۔ ہائنے کی زندگی کو بھی ہم اسی طرح تقسیم کر سکتے ہیں۔

ہائنے ۱۳ دسمبر ۱۷۹۹ء کو دریائے رہائن کے کنارے ڈوسل ڈورف کے قصبے میں پیدا ہوا۔ یہ مقام اُس وقت فرانسیسیوں کے زیرِ حکومت تھا۔ ہائنے کے ماں باپ دونوں یہودی تھے۔ اپنی نسل کے بارے میں ہائنے کے جو خیالات تھے اُن کا اظہار اس سے ہوتا ہے کہ ایک بار اس نے کہا تھا کہ یہی نسل وہ خام مواد ہے جس سے دیوتاؤں کی تخلیق ہوتی ہے
ہائنے کی ماں کا گھرانا اس کی پیدائش سے ایک صدی پہلے ہالینڈ سے آ کر رہائن کے کنارے پر آباد ہوا تھا۔ ہائنے کی ماں کا نام بیٹی تھا، وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون تھی اور اُسے اپنی اعلیٰ تعلیم میں اپنے بھائی سے بھی مدد ملی تھی جو ایک مشہور ماہرِ طب گذرا ہے۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی دونوں زبانیں بخوبی جانتی تھی، اور جرمنی تو اس کی اپنی زبان تھی۔ روسو اور گوئٹے اس کے محبوب مصنف تھے۔ ناول یا شاعری سے اُسے کوئی دلچسپی نہ تھی اور اُس کے رجحانات جذباتی نہیں بلکہ منطقی تھے اور الفاظ کی صحیح قدر و قیمت کے متعلق وہ بہت محتاط رہتی تھی۔
چوبیس سال کی عمر میں اُس نے جو خطوط لکھے ہیں اُن سے پتہ چلتا ہے

کہ اُس کی طبیعت میں ایک بے باکی، ایک جرأت اور ایک شیرینی تھی یوں بھی وہ ایک دلکش عورت تھی اور اُس کے چاہنے والوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی۔

۱۷۹۶ء کے موسمِ بہار میں اُن کے گھر میں ایک شخص سمسون ہائنے آیا۔ یہ شخص ہینوور کے ایک یہودی سوداگر کا بیٹا تھا۔ دیکھنے میں ایک لمبا چوڑا جوانِ رعنا: اس کے بال نرم اور سنہرے تھے اور اس کے ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ ہائنے اپنے باپ کے متعلق لکھتا ہے "اُس میں پختہ سیرت کا فقدان تھا، ایسا فقدان جیسا کہ عورتوں میں ہوتا ہے اور وہ ایک بڑی عمر کا بچہ معلوم ہوتا تھا"۔ اس شخص سمسون ہائنے اور بیٹی میں کچھ عرصہ معاشقہ ہوتا رہا اور پھر دونوں نے شادی کر لی اور دونوں ڈوسل ڈورف ہی میں رہنے سہنے لگ گئے۔

ہائنے کی طبیعت میں جو ڈھیلے اور غیر متوازن خصائص اور تکلف تھا وہ اُس نے اپنے کمزور اور رومانی باپ سے ورثے میں لیا۔ اور جیسا کہ ہائنے خود بھی تسلیم کرتا ہے اُس کی ذہنی نشو و نما اور ارتقاء میں اس کی ماں ہی کا حصّہ زیادہ تھا۔ اور ماں جس کی فطرت صحت ور اور مضبوط تھی اور جو ذہنی اور جذباتی طور پر بہت پختہ عورت تھی شاعروں اور مشاہیر کی ذہنی نشو و نما اور زندگی میں جو درجہ اور دخل اُن کی ماؤں کو رہا ہے اُس کی مثال ہمیں نپولین، باڈلیئر اور روڈمن کے علاوہ ہائنے میں بھی ملتی ہے۔

ہیری ہائنے ایک طفلِ طرار تھا۔ اور اگرچہ وہ جسمانی طور پر مضبوط نہ تھا لیکن اُس کے احساسات تیز تھے۔ وہ مطالعے کا بے حد شوقین تھا۔ اور ڈان کوہیٹے اور گولیور کے سفر اُس کی محبوب کتابیں تھیں۔ ان کتابوں کے نکتے کو ہمیں پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کیونکہ ان کتابوں ہی کی خیالی دنیائیں تھیں جن کا نقش شاعر کے ذہن پر بہت گہرا ہؤا اور نوجوانی اور آئندہ عمر میں ان طفلانہ تاثرات کا اظہار اس کے کلام میں ہؤا۔

ہائنے اپنی بہن کے ساتھ مل کر بچپن ہی سے شعر و شاعری کے مشغلے میں حصّہ لیا کرتا تھا اور دس سال کی عمر میں اس نے ایک ایسی نظم لکھی جسے اس کے استادوں نے ایک شاہکار تسلیم کیا۔ سکول کی طالب علمی کے زمانے میں وہ دن رات بہت اچھی طرح پڑھائی میں مصروف رہا اس دوران میں صرف ایک بار اُسے غم کا سامنا ہؤا۔

ایک دفعہ وہ سکول کے کسی مجمعے میں ایک نظم پڑھ کر سنا رہا تھا کہ اچانک اس کی نگاہیں ایک خوبصورت لڑکی پر پڑیں۔ یہ لڑکی سامعین میں موجود تھی۔ وہ پڑھتے پڑھتے جھجکا، رُک رُک کر اُس نے پھر پڑھنے کی کوشش کی، لیکن بے کار۔ وہ خاموش ہو گیا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ مشہور ماہرِ جنسیات ہیولاک ایلس لکھتا ہے کہ اس واقعے سے ہائنے کی زندگی میں بچپن ہی سے اُس شدّتِ احساس کا اظہار ہوتا ہے جو اس کی فطرت میں موجود تھی۔ گویا وہ بچپن ہی سے اپنے جذبات و تخیّل کا محکوم تھا۔

اس بات کو کئی سال گذر گئے۔ ہائنے سترہ سال کا تھا اور اُس کا امیر چچا سلیمان ہائنے اس بات کی بیکار کوشش میں تھا کہ اپنے بھتیجے کو تجارت کی طرف لگا دے۔ اس زمانے میں ہائنے کی ملاقات اُس عورت سے ہوئی جس نے اُس کے دل میں پہلی اور آخری بار ایک گہرے جذبے کو بیدار کیا تھا لیکن اس جذبے کی اس کے سوا اور کسی طرح تسکین نہ ہو سکی کہ شاعر کی نظمیں اس سے چمک اٹھیں۔ ہائنے نے کبھی اس عورت کا نام تک اپنی زبان پر نہ آنے دیا اور میر تقی[1] کی طرح ساری عمر ایک غیر سرزمین میں جا کر گذار دی اور اپنی محبوبہ کی شخصیّت کو ہمیشہ چھپائے رکھا۔ یہاں تک کہ اس کی موت کے بھی بہت بعد میں جا کر لوگوں کو معلوم ہؤا کہ جس عورت کے متعلق شاعر ایسے میٹھے اور دکھ بھرے گیت گاتا رہا ہے اور جس کی شخصیّت پر وہ میریا، زلیکا اور ایوے لینا کے ناموں کے پردے ڈالتا رہا ہے وہ اُس کی بنتِ عم ایمیلی ہائنے تھی۔

ہائنے کی شخصیّت کا انسانی پہلو تو اپنے اس ناکام افسانۂ محبت کی تلخی کے اثرات سے عہدہ برآ ہو گیا، لیکن اس کی رگوں میں جو یہودی

---

[1] منشی غلام غوث بے خبر تذکرۂ بہارِ بے خزاں میں میر تقی کے حال میں لکھتے ہیں:۔

"بشہرِ خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشت آخر عشقِ او خاصۂ مشک پیدا کردہ می خواست کہ بجنبہ بجا رسوئے رسوائی مے کند و حسن بے پردہ بجلوہ گری در آید ساز ننگِ افشائے راز وطعن اقربا با دلِ بغل پروردۂ حسرت و حرماں و با خاطرِ ناشاد دست بجگر بیاں قلع رشتۂ حبِ وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ براندازی ہا بشہرِ لکھنؤ رسید۔ وہمیں جا بصد حسرتِ جانکاہِ جلاوطنی و حرماں نصیبی از دیدارِ یار و دیارِ جان بہ جہاں آفریں داد۔ تا بہ قیدِ حیات بود، طوقِ محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بپا داشت؛ از کلامِ عاشقانہ و اشعارِ درد انگیز پیداست کہ صد ہزار آرزو بخاک بردہ"۔

خون دوڑ رہا تھا۔ اُسے کبھی اس صدمے سے صحت نہ ہوئی۔ بلکہ اس کے
یہودی ہیلو نے تو اس موضوع کو ہمیشہ کے لئے اپنا لیا اور اس قدر
وسعت دی کہ اس سے نہ صرف اس کے کلام میں ایک مستقل رنگ پیدا
ہو گیا بلکہ یہ اُس کی شاعری کا ایک نمایاں جزو بن گیا۔ اردو میں اختر شیرانی
کے کلام میں جس طرح سلمیٰ کی آمد ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ساون کی پھیلتی
ہوئی گھٹا کی طرح اُس کی تمام تخلیقاتِ شعری میں پڑھنے والوں کو سلمیٰ ہی
کا جلوہ نظر آنے لگا اُسی طرح ہائینے کے کلام میں بھی ایک ایسی عورت
ایک تواتر کے ساتھ نمودار ہوتی رہی جس سے اُسے نوجوانی کے زمانے
میں محبت ہوئی، اور جس نے شاعر پر ایک زردار کو ترجیح دے کر جرمن زبان
میں لافانی نغمے پیدا کئے۔ اپنے کلام کی تلخی کی وضاحت کرتے ہوئے ہائینے
خود تسلیم کرتا ہے:-

تعلیل

لوگ کہتے ہیں کہ گیتوں میں مرے ہے تلخی،
اے مری جان! کہو، اور بھی کچھ ممکن ہے؟
[illegible] جس کا دارو نہ ہو، تم نے ہی وہ جادو کر کے
تم نے ہی اِن کو بنایا ہے مری جاں! زہری!
لوگ کہتے ہیں کہ گیتوں میں سمِ قاتل ہے،
یہ نہ ہوتا تو بتاؤ کہ بھلا کیا ہوتا؟
ناگ رہتے ہیں ہزاروں مرے پہلو میں سدا،
اور اے جانِ جہاں! ان میں تمہارا دل ہے!

چار سال تک ہائینے اس ناکام جذبے کو پرورش کرتا رہا جو اس کے دل میں
اپنی بنتِ عم کے لئے پیدا ہوا تھا اور جب اُس نے شادی کر لی تو شاعر کے احساسات
کا رخ اپنی پہلی محبوبہ کی چھوٹی بہن تھیریس کی طرف ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس
معاملے نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔

اپنے چچا کی مدد سے ہائینے نے برلن اور دو اور مقامات پر قانون کا مطالعہ
کیا۔ برلن میں اس پر جرمن فلسفی پروفیسر ہیگل کے خیالات کا بہت نمایاں اثر
ہوا۔ اور اسی اثر کی وجہ سے بعد میں جا کر ہائینے کی ذہانت میں وہ خصائص پیدا
ہوئے جن کے باعث اُس کے کلام نے رومانی ادب و شعر کا خاتمہ کر دیا۔
برلن ہی میں ۱۸۲۱ء میں اُس کی نظموں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا اور اس کے بعد
سے وہ اپنے اصلی رنگ میں دنیا کی نظروں کے سامنے آنے لگا۔

اس زمانے میں وہ ایک خوش طبع اور نرم مزاج نوجوان تھا لیکن
میل جول میں وہ بہت محتاط تھا اور اپنے صحیح احساسات کا اظہار اُسے
ناپسند تھا اس کے حلیئے میں درمیانہ قد، دُبلا پتلا جسم، لمبے ہلکے بھورے
بال، پیلا بیضوی چہرہ جس پر داڑھی، روشن نیلی لیکن کم نظر آنکھیں، یونانی
ناک، گالوں کی اونچی ہڈیاں، بڑا سا دہن، اور بھرے ہوئے، لوبھی، استہزا
سے پُر ہونٹ ـــ شامل ہیں۔ صورت شکل سے وہ جرمنی کا خاص باشندہ
معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تمباکو نوشی کی اُسے عادت نہ تھی، بیئر پینا وہ ناپسند کرتا تھا۔
اور شراب تو اس نے پیرس پہنچنے سے پہلے چکھی بھی نہ تھی۔

چند سالوں تک وہ قانون کا مطالعہ کرتا رہا لیکن یہ کام نہ تو کرنا چاہتا
تھا نہ اُس میں اس کے کرنے کی اہلیت تھی لیکن اس زمانے میں اس کا
شاعرانہ پہلو ذرا دبا دبا ہی رہا۔ کبھی کبھی اُسے دورہ سا پڑتا، اُس کے دل میں
کوئی نیا خیال کروٹ لیتا، کسی دلکش منظرِ فطرت، کسی باغ کے پھولوں کو وہ
دیکھتا، کوئی حسین لڑکی اُس کی نگاہوں کے سامنے آتی اور اس کے احساس
شعری کو تحریک ہوتی اور وہ خیال کرتا کہ یوں اپنے مہربان اور امیر چچا کے
سہارے پر عمر بسر کرتے رہنا کچھ اچھا نہیں لیکن یہ شاعرانہ تحریکیں یہیں
تک بغاوت پیدا کر کے رہ جاتیں۔

قانون کا ڈپلومہ حاصل کرنے کے کچھ عرصے کے بعد اس نے
اس توقع میں کہ جرمنی میں اُسے کوئی سرکاری ملازمت مل جائے، یہودیت
کو چھوڑ کر عیسائیت کو اختیار کر لیا۔ لیکن اُسے جلد ہی اپنے اس اقدام
پر پشیمانی ہوئی۔ کیونکہ اس سے اُسے کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ الٹا نقصان ہوا۔
عیسائی اس کے نئے مذہب کی "سطحیت" پر اُس کے دشمن ہو گئے، اور
یہودی اُس کے ارتداد پر۔ لیکن اس کے خاندان کو اُس کی تبدیلیٔ اعتقاد
کی کوئی خاص پروا نہ تھی۔ ہائینے کی ماں مذہبی قسم کی تھی، لیکن اس کے
باپ کو ان باتوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ البتہ ان کے گھر میں یہودی مذہب
کے رسم و رواج پر باقاعدہ عمل درآمد ہوتا تھا۔

ابھی اس کے ذہن سے وکالت کا خیال پوری طرح نہ نکلا تھا کہ
۱۸۲۶ء میں اس کی نظموں کے دوسرے مجموعے کی پہلی جلد شائع ہوئی۔
اس مجموعے کی بے باکی، دلکش اندازِ بیان اور جدت نے اسے تمام جرمنی
میں مشہور کر دیا۔ دوسری جلد پہلی سے بہتر اور زیادہ بیباک تھی، اسے
دیکھ کر بعض لوگ خوش ہوئے اور بعض ناخوش۔ بلکہ آسٹریا، پرشیا اور
چند دوسری چھوٹی ریاستوں میں تو اسے ممنوع قرار دیا گیا۔

یہ ہائینے کی زندگی کا پہلا رنگ تھا۔

دوسرا رنگ وہ تھا کہ ہائینے جرمنی کو چھوڑ کر انگلستان کو روانہ ہوا۔ جرمنی سے اُس کا دل بیزار تھا اور انگلستان میں اسے اپنے وطن کی نسبت زیادہ آزادی نظر آتی تھی۔ لیکن وہاں پہنچ کر اُس پر جلد ہی ظاہر ہو گیا کہ دُور کے ڈھول سہانے ہوتے ہیں اور اسی زمانے سے اس کے دل میں انگلستان اور (یہاں کے شاعروں کے سوا) ہر اُس بات سے جو اس ملک سے تعلق رکھتی ہو ایک زبردست تلخی اور نفرت پیدا ہو گئی۔

اپنے چچا کی اقتصادی مدد برابر اس کے شاملِ حال رہی لیکن دولت کے باوجود لندن کا شہر اُسے پسند نہ آیا۔ صرف انگلستان کی سیاسی زندگی میں اُسے دلچسپی تھی۔ یہاں سے ہٹ کر وہ اٹلی پہنچا جہاں اُس نے اپنی زندگی کے سب سے شاداں دن بسر کئے اور آخر کار جب اُسے یقین ہو گیا کہ جرمنی میں اُسے سرکاری ملازمت کبھی بھی نہیں مل سکتی، تو اس نے وطن کو چھوڑ کر ۱۸۳۱ء کے بعد سے مستقل طور پر پیرس کو ہی اپنا گھر بنا لیا اور مختصر وقفوں کے علاوہ یہیں وہ جرمن اخباروں کے نامہ نگار کی حیثیت سے بسر اوقات کرتا رہا، اور آخری دم تک یہیں رہا۔

ہائینے کی زندگی کا تیسرا رنگ اس کے پیرس میں داخلے سے شروع ہوتا ہے۔ پیرس کو وہ "نیا یروشلم" کہتا تھا۔ اِس وقت وہ اکتیس سال کا تھا، ابھی جوانی باقی تھی، اور وہ نئے اثرات کو قبول کرنے کے قابل تھا اور باوجود دردِ سر کے دوروں کے اُس کی صحت اچھی تھی۔ ابھی اس کی ذہنی نشو و نما جاری تھی اور یہ نشو و نما جوانی کے بعد رُک نہیں گئی بلکہ آخر دم تک جاری ہی رہی۔ یہاں تک کہ اس کی نظموں میں اب وہ پہلی سی غیر مادّی اور آسمانی دلکشی باقی نہ رہی تھی، لیکن اس کی بجائے حقیقت پر اس کی گرفت بڑھ گئی تھی، اس کے طنزیہ قہقہے بلند تر ہو گئے تھے، اور اس کی دردانگیز چیخیں زیادہ تند و تیز۔

اُدبا اور فن کاروں کے اُس گروہ نے جو اس وقت پیرس کے ماحول میں یک جا تھا، ہائینے کا دلی استقبال کیا۔ اس گروہ میں وکٹر ہیوگو ایسا شاعر اور ادیب تھا، جارج سینڈ جیسی ناول نگار مصنفہ تھی، بالزک ایسا داستان گو مفکر تھا، الفریڈ دی میوسے جیسا شاعر اور ڈراما نگار تھا، تھیوفائیل گاٹیے ایسا انشا پرداز اور افسانہ نویس تھا اور ہائینے نے ان سب فن کاروں کی رنگا رنگ دلچسپیوں میں دلی مسرت اور اشتیاق کے ساتھ حصہ لینا شروع کر دیا۔ کچھ عرصے تک اس کا تعلق سینٹ سائمن اور اس کے پیرؤوں سے بھی رہا۔ یہ گروہ انسانیت کے مذہب کی تبلیغ کرتا تھا اس لئے ان کے خیالات میں ہائینے کو اپنے جمہوری خیالات کے خوابوں کی تکمیل دکھائی دی۔

پیرس پہنچنے سے چند سال بعد ہائینے کے دل میں ایک ایسا تعلقِ خاطر پیدا ہوا۔ جسے اس کی زندگی میں بہت نمایاں دخل رہا۔ ۱۸۳۴-۳۵ء کے موسمِ سرما میں اُس کی واقفیت "میتھلڈے" یوجینی میرات سے ہوئی۔ یہ ایک سولہ سالہ، نوجوان اور زندہ دل لڑکی تھی جس کا باپ ایک امیر اور بلند مرتبہ آدمی تھا، لیکن وہ اُس کی جائز لڑکی نہ تھی۔ نارمنڈی سے پیرس میں وہ اس لئے آئی تھی کہ ایک جُوتوں کی دکان میں کام کرے جو اس کی چچی کی ملکیت تھی۔ ہائینے کا گذر اکثر اس دکان کے سامنے سے ہوتا تھا۔ پہلے پہل تو وہ دونوں ایک دوسرے کو دُکان کے شیشوں میں سے ہی دیکھتے رہے لیکن رفتہ رفتہ یہ تعلق گہرا اور زیادہ قریبی ہو گیا۔ میتھلڈے نہ لکھنا جانتی تھی نہ پڑھنا۔ ایک دیہاتی قسم کی سیدھی سادی لڑکی جو بیرونجات سے پیرس میں کام کاج کے لئے آئی ہو لکھنا پڑھنا جان بھی کیونکر سکتی تھی چنانچہ جب عشق و عاشقی کا افسانہ شروع ہو کر نشو و نما پانے لگا تو سب سے پہلے یہ فیصلہ کیا گیا کہ کچھ عرصے کے لئے شاعر کی محبوبہ سکول میں جا کر لکھنا پڑھنا سیکھے۔ اس تعلیم و تدریس کے بعد ہائینے نے اس کے ساتھ مل کر ایک گھر میں رہنا شروع کر دیا۔ لیکن اس مل کر رہنے میں عقد و مناکحت کی عام پابندیوں کو کوئی دخل نہ تھا۔ مل کر رہنے سہنے کا یہ باہمی سمجھوتہ ایک ایسا نظام تھا جسے خاص "پیرس کا گھریلو نظام" ہی کہا جا سکتا ہے۔ پیرس میں اس طور پر رہنے کو سماجی لحاظ سے تقریباً جائز سمجھا جاتا تھا اور ہائینے کو بھی اس طریقِ زندگی پر کوئی اعتراض نہ تھا بلکہ یہ انداز اس کے لئے مرغوبِ خاطر تھا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ شادی بیاہ کے معنی مذہبی یا قانونی بندھن نہیں ہیں لیکن چند سالوں کے بعد اُسے مجبوراً یہ رسمی زنجیر بھی پہننا ہی پڑی۔ نوبت یوں آئی۔ ہائینے نے ایک عورت میڈم سٹراس کے متعلق کچھ رائے زنی کی۔ میڈم سٹراس کے ایک دوست کو ہائینے کی باتیں ناگوار گذریں اور نوبت مبارزے تک پہنچی۔ اس مبارزے میں شامل ہونے سے پہلے ہائینے نے اس خیال سے اپنی رفیقۂ حیات سے باقاعدہ شادی کر لی کہ اگر وہ اس جھگڑے میں کام آ گیا تو اُس کے بعد اُس کی بیوی کا رتبہ محفوظ رہے۔ اس شادی کی رسم کے بعد اُس نے اپنے اُن تمام دوستوں کو کھانے کی دعوت دی جن کا اپنی اپنی محبوب عورتوں سے اسی طرح کا تعلق تھا۔ اس دعوت سے ہائینے کا مقصد یہ تھا کہ اُس کے دوست

بھی اس کی طرح ہی اپنی اپنی رفیقۂ حیات کو باقاعدہ نکاح میں لے آئیں، لیکن معلوم نہیں کہ اس کا یہ مقصد پورا ہوا کہ نہیں۔

اس بات کو سمجھنا کچھ خاص مشکل نہیں کہ ایک ایسے شاعر کے دل میں جس کے احباب کے حلقے میں بہت سی ذہنی طور پر ترقی یافتہ اور اونچے درجے کی عورتیں بھی شامل تھیں، کس طرح ایک معمولی سی سیدھی سادی دیہاتی، زندہ دل اور خوبصورت لڑکی کے لئے اتنی زبردست گہری اور مستقل کشش پیدا ہو گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نوخیز لڑکی میں ایک بھولپن تھا اس کی ہنس مکھ صورت میں ایک سادگی تھی، ایک طفلانہ بے ساختگی تھی اور وہ محض ایک نادان ہستی تھی۔ ہائینے کے لئے یہی بات بے حد دلچسپ تھی کہ اس کی بیوی نے اس کی نظموں کا کبھی ایک مصرعہ بھی نہ پڑھا تھا، اسے معلوم ہی نہ تھا کہ ایک شاعر ہونا کیا بلا ہے، وہ اگر ہائینے کو چاہتی تھی تو صرف ہائینے کی حیثیت میں ہی چاہتی تھی اور ہائینے کے لئے اس میں ایک مستقل ماخذ تھا، تازگی کا شگفتگی کا نت نئے جوش کا۔ وہ گویا زندگی کے تھکا دینے والے سفر میں اس خوش مزاج اور سادہ دل عورت کی طفلانہ مزاجی سے قدم قدم پر تازہ دم ہو جاتا تھا۔ اور تازہ دم ہونے کی اسے ضرورت بھی تھی کیونکہ اس کی اسی شادی کے بعد کے سالوں میں ہی اس کے گرداگرد داخلی اور خارجی طور پر تاریک سائے اکٹھے ہونا شروع ہو گئے اور اس کے ذہنی اور جسمانی افق پر گھٹائیں چھانے لگیں۔

اس زمانے میں وہ اگرچہ شاعری میں اپنے شاہکار تصنیف کر رہا تھا پھر بھی ادبی ذرائع سے اس کی آمدنی بہت کم تھی۔ اس کی بیوی کوئی سگھڑ اور ہوشیار عورت نہ تھی، وہ گھر گرہستی کو اچھی طرح نہیں چلا سکتی تھی اور اپنے چچا سلیمان سے کافی وظیفہ حاصل ہونے پر بھی ہائینے کو روپے پیسے کے معاملے میں کافی دقتیں پیش آتی تھیں۔ آخر ان دقتوں ہی سے مجبور ہو کر اسے حکومت فرانس سے ایک چھوٹی سی پنشن قبول کرنی پڑی۔ وقت گذرتا گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کے دشمنوں کی مخالفت بڑھتی گئی اور اس کے دل میں بھی نفرت کا جذبہ پرورش پاتا رہا اور اس کی اس طبعی تلخی کا اظہار اس کے کلام میں ہونے لگا۔ اب وہ زمانہ آ پہنچا کہ اس کی محبوب بیوی بھی صرف عیش و عشرت ہی کو تحریک دینے والی عورت نہ رہی، وہ الھڑ حسینہ جس پر کسی زمانے میں شاعر کا دل ریجھا تھا اب ایک ادھیڑ عمر کی عورت تھی، لیکن اس کی طبیعت میں کوئی فرق نہ آیا تھا، وہ اب بھی اسی طرح سادہ دل تھی، اس کی طفلانہ خصوصیات اب بھی اسی طرح قائم تھیں۔ وہ ہائینے کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لے سکتی تھی۔ اسے تھیئٹر اور سرکس کے تماشوں کا شوق تھا اور ہائینے ان تماشہ گاہوں پر ہمیشہ اس کے ساتھ نہ جا سکتا تھا۔ اس لئے ایسے موقعوں پر اس کے ذہن میں ایک بے تعصب اور غیر مدلل حسد کا احساس پیدا ہونے لگا۔ اس پر طرّہ یہ کہ اس کا چچا سلیمان ہائینے مر گیا، اور اس کے بیٹے نے اپنے باپ کا مقرر کیا ہوا وظیفہ ہائینے کو دینے سے انکار کر دیا لیکن آخر بہت دباؤ ڈالنے پر وہ راضی ہو گیا۔

اس پیچیدگی سے ہائینے کو ایک سخت صدمہ ہوا اور اس سے اس مرض کو تحریک ہو گئی جو اس کے اعصاب میں آسودہ تھا۔ فالج کی علامات نمودار ہوئیں اور چند ہی مہینوں میں وہ، اپنے قول کے مطابق، ایک زندہ درگور انسان نظر آنے لگا۔ آئندہ سالوں میں اگرچہ اس کا ذہن ہمیشہ بالکل صاف اور روشن رہا لیکن مرض کی وجہ سے اس کی زندگی ایک المناک فسانہ بن گئی اور وہ اس مہلک عارضے سے آخر دم تک رہائی نہ پا سکا۔ ان وحشت ناک ایام میں اس کی زندگی کے افق پر صرف ایک روشنی نظر آئی اور وہ یہ کہ ایک نوجوان مصنفہ کیمیلی سیلڈن جس کا ذکر ہائینے "موشے" کے نام سے کرتا ہے، آخری دم تک اس کی دلسوزی سے تیمار داری کرتی رہی۔

مئی ۱۸۴۸ء میں وہ آخری بار گھر سے باہر نکلا۔ بینائی کافی حد تک جا چکی تھی۔ آدھا اندھا اور آدھا لنگڑا، وہ ان گلیوں میں سے آہستہ آہستہ چلتے ہوئے جن میں انقلاب فرانس کا شور، غل اور ہنگامہ بپا تھا، پیرس کے مشہور نگار خانے تک پہنچا۔ یہ وہ مندر تھا جس میں حسن کی دیوی وینس کا مجسمہ رکھا ہوا تھا۔ وہ اس مجسمے کے قدموں میں جا بیٹھا اور بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ وہ اپنے پرانے دیوتاؤں کو خیرباد کہہ رہا تھا، اس کی طبیعت اب دکھ درد کے دھرم کی عادی ہو چکی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے نکل آئے۔ حسن کی کی دیوی نے اسے دیکھا، اس کی نگاہوں میں دیا کی بھیک جھلک رہی تھی لیکن وہ بھی بے بس تھی، وہ شاعر کے دکھ کو نہیں مٹا سکتی تھی۔

ہائینے کے اس رنگ کا بیان ایک انگریز نے لکھا ہے "وہ چٹائیوں کے ایک ڈھیر پر لیٹا ہوا تھا، اس کا جسم گھل کر کانٹا ہو چکا تھا، اور وہ اپنی اوڑھی ہوئی چادر کے نیچے ایک بچے کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے چہرے کے ہر ایک نقش سے دکھ درد اور اذیت کے آثار آشکار تھے"

اس درد و اذیت کو کم کرنے میں صرف مارفیا ہی ایک معاون تھا۔ اور اس کی بھی بڑھتی ہوئی مقدار کی روزانہ ضرورت تھی لیکن اس مہلک مرض کے علاوہ دوسرے مصائب کے باوجود اس کی ہمت میں کسی طرح کا فرق نہ آیا۔

اُس کے ڈاکٹروں میں سے ایک کی رائے تھی کہ "وہ غضب کا انسان ہے، اُسے صرف دو باتوں کی فکر ہے، ایک یہ کہ اپنی ماں سے اپنی حالت کو چھپائے رکھے اور دوسرے اپنی بیوی کے مستقبل کا پورا پورا انتظام کر دے۔" اس زمانے میں اس کی ادبی تخلیقات اگرچہ مقدار میں کم ہو گئیں لیکن اُن کا زور وہی یہی پرانی شان لئے رہا۔

۱۶ر فروری ۱۸۵۶ء کو ہائنے مرگیا۔

یہ اُس کی زندگی کے چوتھے رنگ کا انجام تھا۔ یہاں پھر سید انشا کے متعلق آزاد مرحوم کے الفاظ یاد آتے ہیں "بعض فلاسفۂ یونان کا قول ہے کہ مدّتِ حیات ہر انسان کی سانسوں کے شمار پر ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ہر شخص جس قدر سانس یا جتنا رزق اپنا حصّہ لایا، اسی طرح ہر شئے کہ جس میں خوشی کی مقدار اور ہنسی کا اندازہ بھی داخل ہے وہ لکھوا کر لایا ہے"۔۔۔ ہائنے ۔۔۔ نے اُس ہنسی کی مقدار کو جو عمر بھر کے لئے تھی، تھوڑے وقت میں صرف کر دیا باقی وقت یا خالی رہا یا غم کا حصہ ہو گیا۔"

ہائنے کی زندگی میں جہاں اپنی نسبتِ غم سے اُس کی شگفتگی، اُس کی سادہ دل بیوی، اس کی تیمار دار منو شے اور اس کے یہودی نسل سے تعلق کو اہمیت حاصل ہے، اسی طرح اس کا پیرس پہنچنا بھی اہم ہے۔

نیا شہر، اور وہ بھی فرانس کا دارالسلطنت نئے تاثرات، نئے مقاصد، نئی دلچسپیاں، اِن سے اس کی شاعرانہ تخلیق میں ایک وقفہ پیدا ہو گیا۔ چونکہ وہ فطری طور پر حسّاس بھی تھا اور ایک رنگ رس انسان اور جسمانی لذّتوں کا رسیا بھی، اس لئے پیرس ایسے عشرت پرست شہر کو اس کی طبیعت سے ایک قدرتی مناسبت تھی لیکن جب تک اُس کے ادبی اور نسلی آغاز پر غور نہ کیا جائے اُس کی شخصیت کے شاعرانہ پہلو کو سمجھنا ذرا مشکل ہے۔ وہ پیدائشی لحاظ سے یہودی تھا اور اپنے ہمہ گیر خیالات اور اعتقادات کے باوجود اپنی نسل کی پیچیدہ اور متضاد ذہنیت سے پیچھا نہ چھڑا سکا۔

ایک یہودی میں اُسی طرح متضاد خصوصیات کا اجتماع ہوتا ہے۔ جس طرح یورپ میں ایک روسی میں، چین میں ایک چینی میں اور ہندوستان میں قدیم زمانے کے سنسکرت بولنے والے برہمن میں۔ یا آج کل کسی حد تک ایک پنجابی میں۔ ایک یہودی انتہا کا حسّاس بھی ہو سکتا ہے اور انتہا کا نفس پرست بھی، اُس میں ذہانت کی بلند نفاست بھی ہوتی ہے اور عامیانہ، کینہ پرور طنز بھی، اُس کے دل میں سچے، گہرے احساس بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور وہ انہی جذبات پہ قہقہے بھی لگا سکتا ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی خود بین و خود کام کیوں نہ ہو حقیقت کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا۔ اُس کی بلند دماغی خواہ کتنی ہی بڑھ جائے وہ ہر شئے کی قدر و قیمت کو خوب جانچ لیتا ہے۔ چونکہ وہ ایک زیر دست نسل سے تعلق رکھتا ہے اس لئے اس کے دل میں باغیانہ خیالات بہت آسانی سے پیدا ہو سکتے ہیں، لیکن وہ کسی مقصد کے لئے جوش اور بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے بھی اُس مقصد کے صحیح ہونے پر شک کر سکتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کا دِل ناپسندیدگی اور نفرت سے پاک ہو لیکن ایک خاص حد تک نفرت اور اُس کے ساتھ ہی کسی گئے گذرے زمانے سے اس کے خون میں رچا ہوا ڈر اُس میں موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات اپنے اچھے ارادوں کو پورا کرنے سے بھی جھجک جاتا ہے۔ اگرچہ وہ عام زندگی میں اتنا محتاط ہوتا ہے کہ اُس کی حد سے بڑھی ہوئی احتیاط کو بزدلی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ لیکن استقلال میں وہ صبرِ ایوّب کی مثال بھی قائم کر سکتا ہے۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ دُکھ درد کو خوش آمدید کہے بلکہ خود اپنے پر دُکھ درد کو طاری کرے اور اس درد و اذیت کی زیادتی میں بھی ایک لذّت اور مسرّت محسوس کرے۔ اُن قوموں میں ایک احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے جن سے دوسری قومیں بُرا سلوک کریں۔ ایک یہودی کا بھی یہی حال ہے اور اس وجہ سے اکثر یا تو وہ بہت ہی عاجز اور مسکین بنا رہتا ہے یا ردِ عمل کی صورت میں دعوے بازی کا عادی ہو کر ادعائے محض کرنے لگتا ہے اور چونکہ یہ دعوے بازی ایک دھوکا یا زعم ہوتی ہے اور اس کی بنا خودداری پر نہیں ہوتی اس لئے اس میں کوئی شان نہیں ہوتی، کوئی وقار نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح جیسے اُس کی حد سے بڑھی ہوئی عاجزی میں بھی کوئی شان نہیں ہوتی۔ رنج و اندوہ اور غم و الم ہی ایک ایسی کیفیت ہے جس میں ایک یہودی عظمت کی بلندی کو حاصل کر سکتا ہے۔ ایسی عظمت اور بلندی جیسی کہ خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروں میں ہوتی ہے۔ لیکن عین ممکن ہے کہ یہی پیغمبر جو آج اپنے درد و غم کی وجہ سے عظمت کی بلندی حاصل کر چکا ہے کل جب اپنے کو از سرِ نو زندگی کے عام حالات میں دیکھے تو اُسی پہلی عظمت اور بلندی کا مذاق اڑائے۔ چونکہ اُسے سماجی لحاظ سے ایک نقلی اور ساختہ قسم کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اس لئے وہ وقت کے مطابق بدلتا رہتا ہے۔ اور ہر قسم کے اندازِ نظر اختیار کرتا رہتا ہے لیکن اپنے دل کی گہرائی میں وہ ان بدلتی ہوئی کیفیتوں پر، اپنے آپ پر اور اپنے دیکھنے والوں پر مسکراتا رہتا ہے۔ وہ کسی بات کو بغیر سوچے سمجھے یوں ہی نہیں مان لیتا کیونکہ اس کا مشاہدہ گہرا ہے اور اُسے ہر بات کے متعلق پوری معلومات حاصل ہیں۔ اور جب کبھی اُسے مناسب اور محفوظ موقعہ مل جاتا ہے وہ دنیا کی ریاکاری اور ڈھونگ کے بخیئے اُدھیڑنے میں ایک مسرّت محسوس کرتا ہے

اور جب وہ یوں ڈھول کا پول کھول دیتا ہے تو قہقہے لگاتا ہے، اور اس کی یہ ہنسی کسی درباری مسخرے کی ہنسی کی مانند ہوتی ہے جو خود بھی بنتا ہے اور دوسروں کو بھی بناتا ہے لیکن ایک یہودی میں درباری مسخرے اور ایک پیغمبر کی خصوصیات کا جو امتزاج ہے اس کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ کب وہ معجزے دکھانے شروع کردے گا اور کب خالی خولی دلگی پہ اُتر آئے گا۔

اس قدر متضاد کیفیتوں کو اپنے دل و دماغ میں پالنے اور پھر اُن کے بُرے اثرات سے محفوظ رہنے کے لئے جس نفسی زور اور قوت کی ضرورت ہے وہ ایک یہودی میں موجود ہے ہائینے اس لحاظ سے ایک مثالی یہودی تھا بلکہ مستزاد یہ کہ وہ شاعری کے لحاظ سے جوہرِ خداداد کا مالک بھی تھا اور اُس کے اس جوہرِ خداداد کی نشو ونما اور تربیت جرمن تمدن اور جرمن رومانی تحریکِ ادبی میں ہوئی تھی۔ یہ بات جدا ہے کہ بعد میں جاکر رومانیت کی تحریک کا خاتمہ بھی اُسی نے کیا۔

یورپ کے شعرا میں ہائینے سے بڑھ کر اور کوئی ایسا شاعر نہیں گذرا جس کی ذہانت اور طبیعت میں رومانیت کے ساتھ ساتھ اس قدر مخالفِ رومانیت خصوصیات بھی اکٹھی ہوں۔ اُس کی نظموں کے اُس مجموعے میں جس کا نام کتابِ نغمہ ہے اِس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ اس کتاب کی نظموں میں سے بعض جرمنی کی رومانی شاعری کے بہترین نمونے ہیں، جن میں آہوں کا ذکر ہے، چاندنی راتوں کا بیان ہے، اُن گلاب کے پھولوں کی کہانی ہے جنہیں ہائینے بلبلوں کی کابل دلہنیں کہتا ہے، اور طائروں کے نغموں کی صدائیں ہیں ـــــ روحوں کے فسانے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ ہی ساتھ اچانک وہ اپنے رومانی طلسم کو توڑ دیتا ہے اور اپنے احساسات کی نزاکت کو ایک قہقہے سے مٹا دیتا ہے۔ گہرائی کو چھوڑ کر یک دم سطحی انداز اختیار کرلیتا ہے، بے ساختگی اور آمد سے ہٹ کر یک قلم تکلف اور آورد پر اُتر آتا ہے۔ جب اُس کی حساس طبیعت کا بار اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے تو وہ ایک نیا چولا پہن لیتا ہے جسے دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ "شاعر نہیں تو بھانڈ ہے بھڑوے" ـــــ شاید وہ یہ سمجھ کر قہقہے لگاتا ہے کہ اُن میں اُس کی آہوں کی آواز کھو جائے گی۔ وہ خود ایک جگہ لکھتا ہے کہ اُس کے قہقہے ایک بے آس، رومان نواز کے قہقہے ہیں جس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہو۔ ـــــ یہ بالکل سچ ہے کہ اُسے ان قہقہوں کی ضرورت بھی تھی تا کہ وہ اس ہتھیار سے دنیا کا مقابلہ کرسکے۔ کیونکہ دنیا کی دشمنی نے اس کے ذہن کو عجیب اُلجھی ہوئی کیفیتوں میں پھنسا رکھا تھا۔ ان اُلجھی ہوئی کیفیتوں کی ایک مثال اُس اندازِ نظر سے ملتی ہے جو اجتماع کے متعلق اُس کے ذہن میں پیدا ہوگیا تھا۔ چونکہ وہ جسمانی طور پر عمر کے آخری ایّام میں ہجوموں میں ملنے جلنے اور اُن کی سنگت سے لطف اٹھانے کے ناقابل تھا اس لئے عوام کے متعلق اُس کے مختلف ذہنی ردِّ عمل تھے۔ شاید یہ علیحدگی کے برے اثرات کا نتیجہ تھا کہ کبھی وہ اجتماع سے بیزار ہوجاتا تھا، کبھی ڈرتا تھا، اور کبھی گہری نفرت کا اظہار کرتا تھا۔

ہیولاک ایلس کے خیال میں ہائنے کی نظر میں جذبۂ محبت اور جذبۂ جنسی دو الگ الگ چیزیں تھیں لیکن وہ عشرت پرست بھی تھا اور محض جذباتی بھی۔ بلکہ یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک جذباتی نفس پرست تھا اور اُس سے بڑھ کر ایسا کوئی شاعر یورپ میں نہیں ہُوا۔ جب اُسے اپنی جذبات پرستی سے خطرہ محسوس ہوتا تو وہ اس کا مقابلہ اپنے طنزیہ اور نفس پرست رجحانات سے کرلیتا لیکن چونکہ محبت اور جنس اُس کی نظروں میں دو مختلف چیزیں تھیں اس لئے اُس کے کلام میں وہ صحت ور لذّتِ نفس نہ آسکی جو عرب کی ایّامِ جہالت کی شاعری میں تھی، امرا القیس میں تھی، سنسکرت کی قدیم عشرت پرستانہ شاعری میں تھی، امارو، بھرتری ہری اور دوسرے شعرا میں تھی۔ نواب مرزا شوق کی زہرِ عشق میں تھی۔ شعر و ادب میں یہ رنگ اُسی صورت میں پیدا ہوسکتا ہے جب کہ فن کار کی نظر میں جنسیت اور محبت ایک ہی بات کے دو نام ہوں۔ چونکہ ہائینے کی شاعرانہ نفسیّت پیچیدہ قسم کی تھی اس لئے اُس کے لئے عشرت کی لذّت بھی درد کی صورت اختیار کرلیتی تھی جیسے کہ اذیت پرست شعراء کا عام انداز ہے۔ اردو میں تو شروع سے اب تک شاعری کا یہی حال رہا ہے۔ اس کی بجائے کہ وہ تلاشِ مسرّت میں مسرّت تک پہنچیں، اپنی ذہنی پستی کی وجہ سے پلٹ کر پھر غم کی طرف ہی آجاتے ہیں ؏

جس سے پوچھا کہ دل خوش ہے کہیں دنیا میں؛

رو دیا اُن نے، اور اتنا ہی کہا "کہتے ہیں!" سودا

شاید وہ اپنی خودی کو اپنے دُکھوں کی مُورت میں پوجتے ہیں۔ عشق ایسا حیات افروز جذبہ بھی اُنہیں روشنی سے دور ہی لے جاتا ہے ـــــ

"عشق میں ہم نے یہ کمائی کی، دل دیا، غم سے آشنائی کی" (شوق) ـــــ البتہ غالب اپنے فلسفیانہ انداز سے اسی بات میں ایک گہرائی پیدا کر دیتا ہے۔

"عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا۔ درد کی دوا پائی، دردِ لادوا پایا"ـــــ

لیکن حاصل اُسے بھی دردِ لادوا ہی ہوتا ہے۔ اردو شعرا محض عشرت کی طرف

آتے بھی ہیں تو صرف بیانیہ شاعری تک ہی پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔

مشرق اور مغرب کی اس شاعرانہ اذہنیت پرستی میں اتنا اختلاف ہے کہ مشرق میں اس کی حیثیت اجتماعی ہے یعنی ہر شاعر اپنی نسلی اور بنیادی خصوصیات کی وجہ سے اذہنیت پرست ہوتا ہے نیز اس لئے بھی کہ اس کا مطمح نظر ایک ماورائے مادیات دنیا ہوتی ہے جو اُسے مل نہیں سکتی اور اس کا نہ ملنا ہی اُسے غم والم کی طرف راغب کر کے پست ہمت اور تاریک بین بنا دیتا ہے مغرب میں فطری رجحان عمل پرستی ہونے کے باعث شاعری میں دکھ درد کے عنصر کی وجہ انفرادی ہوتی ہے۔ جس میں شاعر کی نسل اور حالاتِ زندگی کے علاوہ ذہنی اور نفسی نشو و نما اور تربیت کو دخل ہوتا ہے۔ جیسے بادلیئر ہائنے بھی اپنی نسلی اور ذہنی خصوصیات کے لحاظ سے مشرقی تھا اور اس حقیقت سے آگاہ کہ اُس کے نغموں کی تخلیق کا دار و مدار اُس کے ذاتی درد و غم پر ہے۔ لکھتا ہے ؎

وہ درد جو اپنی تندی سے تن من کو گھلاتا جاتا ہے،
مجھ کو تو مٹاتا جاتا ہے پر گیت بناتا جاتا ہے۔

ضبطِ گریہ اور فقدانِ گریہ باشدتِ گریہ کا نتیجہ ہے۔ ؎

یتیم کو پیار نہیں ہم سے ہنس مکھ کے ہنسنا چھوٹ گیا،
دُکھ درد کا پردہ کوئی نہیں اب تو مُسکانا چھوٹ گیا۔
یتیم کو پیار نہیں ہم سے، اب ہم کو رونا یاد نہیں۔
دل ٹوٹا، لیکن آنکھوں کو اشکوں سے دھونا یاد نہیں۔

اور اس تمام غم کا باعث وہی اُس کا مستقل موضوعِ سخن ہے، اس کی ذاتی زندگی، اُس کی بنتِ عم ؎

پھولوں کو اگر معلوم یہ ہو کتنا دکھ ہے میرے دل میں،
وہ دل کا بوجھ کریں ہلکا، اور ساتھ مرے مل کر روئیں!
گاتے پنچھی گر جان سکیں میرے دل کے دُکھ بپتا کو،
گا گا کر جنگل گونجا دیں اور دُور بھگائیں چنتا کو!
آکاش کے تاروں کو جو کبھی میرے دُکھ کا کچھ دھیان آئے
دینے کو تسلی راتوں میں ہر تارا ٹوٹ کے آجائے!
لیکن انجان ہیں یہ سارے، اک دل کا دُکھ پہچانتی ہے!
دل کو گھائل کرنے والی دل کے گھاؤ کو جانتی ہے۔

اور یہ دُکھ کا احساس اس قدر شدید صورت اختیار کر کے اُس کے ذہن پر طاری ہو جاتا ہے کہ اُسے ہر بات غم آلود نظر آتی ہے، ہر حسن مٹنے والا۔ اور وہ اللہ بس باقی ہوس پکارتا نظر آتا ہے۔

مایا

پریم کا یہ دیوانہ میلہ نفس کے عیش کا وحشی ریلہ
ختم ہُوا، ہم دونوں کھڑے ہیں۔
ہوش میں اب تو آئے ہوئے ہیں
ایک تھکن ہے، اِک بیزاری، وہ لو، وہ لو، آئی اُباسی!
چپکے کھوئے ہوئے تکتے ہیں۔
ہر شے سے بیزار ہوئے ہیں

خالی ہے، خالی ہے پیالہ، جس میں بھری تھی کام جوالا!
لیکن اب وہ نور نہیں ہے
خالی ہے، بھرپور نہیں ہے!
خالی ہے، خالی ہے پیالہ جس میں بھری تھی کام جوالا!

ساز وہ اب خاموش ہیں سارے، گت پر ناچے پاؤں ہمارے،
ناچ وہ دھندلے، پیارے پیارے،
ناچ رسیلے مدھ متوارے!
جیسے ناچیں گگن کے تارے! ساز مگر خاموش ہیں سارے!

اب فانوس نہیں ہیں روشن، چُپ ہے جگمگ کرتا آنگن!
اب یہ سوچ ہے دل میں میرے،
مٹ جائیں گے جلوے تیرے!
تیری سندرتا کا جادو، کب ہوگا! بس میرے آنسو
بہتے ہوں گے۔ کہتے ہوں گے:
"خاک میں جلوے رہتے ہوں گے!"

اور زندگی اور دنیا کی ہر شے کی ہیچ مقداری بعض دفعہ اُس کے ذہن میں ایک عجیب کیفیت طاری کر دیتی ہے۔ جب وہ ہر بات کو ایک خواب یا خیال سمجھ لیتا ہے اور اس کے غم آلود احساس اپنی شدّت کی وجہ سے ایک غیر مرئی درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جیسے پانی بے انتہا گرم ہو کر بھاپ بن جاتا ہے۔

نزاکت احساس

محبت تھی اک دوسرے سے، مگر
نہ آپس میں دونوں وہ بولے کبھی!
رہی اجنبی ہو کے اُن کی نظر،
محبت سے تھی گرچہ جاں پر بنی!

جدا ہو گئے، اور تصور میں ہی
ملے دونوں۔ سپنا مگر مٹ گیا۔
بالآخر جب آئی گھڑی موت کی
انہیں موت کا بھی کب احساس تھا!

ہائینے میں غزل کی ایک ایسی نزاکت، تازگی، شگفتگی اور سادگی تھی جس سے اس کی نظموں میں دیہاتی گیتوں کا سا اچھوتا پن محسوس ہوتا ہے، وہ اپنے پیچیدہ سے پیچیدہ احساسات میں بھی دیہاتی گیتوں کا سا لہجہ اور بیساختگی پیدا کرنا جانتا تھا اور سادگی اور نزاکت کے اس امتزاج سے اس کی بعض نظموں میں ایک چبھتی ہوئی شوخی نمایاں ہو جاتی ہے بعض دفعہ وہ معمولی انداز میں ایک سیدھی سادی سی بات کو بیان کر جاتا ہے لیکن اسی میں اشارے اور رکنائے کی گہرائی بھی ہوتی ہے۔

ساتھی

صنوبر کا اک پیڑ استادہ ہے ——— بہ طرفِ شمال،
ہیں بہتی ہوائیں جہاں تھم ہیں ——— بہ زورِ کمال!
ہے سویا ہوا نیند کی گود میں ——— صنوبر کا پیڑ
اڑھایا ہوا ہے اُسے برف نے ——— سفید ایک شال
اسے نیند میں لو، نظر آیا خواب ——— کسی پیڑ کا!
کسی مشرقی ملک میں اک کھجور ——— ہے تنہا کھڑی!
اکیلی ہے وہ، اُس کے قدموں تلے ——— ہے صحرا بچھا!
ہیں تپتی ہوئی ریت پر اُس کے پَیر ——— وہ گُھل جائے گی!

ہائینے کی پیدائش کے وقت جرمنی کا تمدن ایک شاداب حالت میں تھا۔ اور ہر قسم کے فلسفے اور تنقید و تبصرے کی کثرت اور وسعت موجود تھی جرمن تخیل اور ذہانت کے تمام خزانے ہر شخص کو مہیا تھے۔ ان خزانوں سے ہائینے نے خاطر خواہ فائدہ حاصل کیا۔ اُس کی ذہانت سے زندگی پھوٹ رہی تھی، اُس میں ایک تیکھی تیزی تھی اور وہ ذہانت ہر نئی صورت میں ڈھل جانے کے قابل تھی۔ اس لئے اس نے اپنے ملکی تخیل و تفکر کے موجودہ خزانوں کو اپنی تخلیقات کی زینت بنا لیا اور جس طرح اس نے جرمنی سے کانٹ، شیلنگ اور ہیگل ایسے فلاسفہ کے خیالات کو اپنایا اسی طرح فرانس میں پہنچ کر وہاں کے سیاسی اور جمہوری خیالات کے مصنفین کی خوشہ چینی کی۔

طنز اور ہنسی کھیل سے اُسے ایک دلی تعلق تھا۔ اور یہی اس کے ذہن کی بنیادی خصوصیت تھی۔ لیکن یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا طنز اور تمسخر ایک ساختہ کیفیتِ نفسی ہے یا بے ساختہ اظہارِ روح! کیا ہنسی یا طنز سے بھی اسی طرح شاعری کی تخلیق ہو سکتی ہے جس طرح دوسری جذباتی کیفیاتِ ذہنی سے؟ ——— مثلاً کسی پر دباؤ ڈالنا یا بھڑکانا ایک قلبی یا روحانی کیفیت نہیں ہے بلکہ ایک ارادی عمل ہے، اس عمل سے خطابت کی تخلیق ہو سکتی ہے لیکن اس میں بنفسہٖ شعریت نہیں موجود ہے البتہ شعریت کو یہ اپنا معاون بنا سکتی ہے۔ طنز یا مضحکہ یا تمسخر کے لئے بھی یہی خصوصیات لازمی ہیں یعنی یا کسی پر دباؤ ڈالا جا رہا ہو گا یا کسی کو برانگیختہ کرنے کا سامان ہو گا۔ ہنسی مذاق یونہی پیدا ہوتا ہے۔ ہنسی مذاق اکیلے یا اوروں کے ساتھ مل کر ایک عملی انداز میں حظ اندوز ہونے کا نام ہے۔ مذاق کے لئے ہم تصورات کو ایک ایسے غیر متوقع انداز میں ترتیب دیتے ہیں۔ جس سے وہ جسمانی ردِ عمل پیدا ہوتا ہے جسے ہم ہنسی یا قہقہہ کہتے ہیں۔

لیکن یہ اندازِ نظر شاعرانہ اندازِ نظر سے بالکل مختلف بلکہ ایک حد تک اس کا مخالف ہے کیونکہ شاعر اپنی توجہ کو اپنی ہی ذات کی گہرائیوں پر مرکوز کرتا ہے اور جو باتیں اُسے وہاں ملتی ہیں وہ انہیں الفاظ کی گرفت میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور پھر اپنے اُسی لفظی نقشے سے دوسروں کو بھی غور کرنے پر مائل کرتا ہے ظرافت، طنز یا مذاح کا ماہر ہمارے پھیپھڑوں کو قہقہوں سے ورزش کراتا ہے، یا ہمارے لبوں پر تبسم کی لہر دوڑا دیتا ہے۔ لیکن ہمارے دلوں پر اس کا اثر نہیں ہوتا۔ شاعر ہمارے ذہنوں میں تصورات کے سلسلے کو جگا دیتا ہے اور ہمارے دلوں کے ساتھ سے احساسات کے نغمے چھیڑ دیتا ہے۔ شاعرانہ طبیعت میں ایک وقار ہوتا ہے، ایک متانت ہوتی ہے، ایک زندگی ہوتی ہے لیکن اس زندگی کی آواز قہقہے کی صورت نہیں اختیار کرتی۔

ہنسنے ہنسانے والے لوگ اُس قسم کے فن کار ہیں جیسے کوئی

خطیب ہو۔ دونوں کو اپنے عمل کی مدد کے طور پر شاعرانہ تصورات سے مدد لینی پڑتی ہے۔ لیکن ان کے عمل کا نتیجہ شاعرانہ صورت میں نہیں برآمد ہوتا بلکہ اس سے ایک عملی قسم کا اثر ظاہر ہوتا ہے اور چونکہ اس طرح وہ شاعری کو ایک ذریعہ یا ایک آلۂ کار بنا لیتے ہیں انہیں شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ سودا جب کہتا ہے کہ

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے (لیجو) کہ چلا میں   لینا

تو یہ شاعری ہے۔ لیکن جب وہ اپنے غلام سے کہتا ہے۔
"اے غنچے اذا الانا تو میر اقلمدان!" تو اس وقت وہ محض ایک ہجو نگار بن کر رہ جاتا ہے۔

سید انشا لکھتے ہیں ؎

انشا نے سن کے قصۂ فرہاد یوں کہا
کرتا ہے عشق چوٹ تو ایسے ہی منڈ پہ

یہاں محض قافئے (منڈ) نے ایک سنجیدہ بات میں مذاح کا پہلو پیدا کر دیا۔ اسی طرح سنجیدگی میں مذاح اور طنز کی آمیزش کرنے میں یورپ کے شعراء میں ہائینے کا کوئی مدِمقابل نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ بعض جگہ ہائینے کے کلام میں صرف اسی وجہ سے ایک زبردست اثر نظر آتا ہے کہ وہ سنجیدگی کی بلندی میں قہقہوں کی عمومیت کو نہایت چابک دستی اور نفاست سے گھلا ملا دیتا ہے۔

ہائینے کی طبیعت میں شاعری کی ایک سچی، آزاد اور صحیح اور باقاعدہ موج تھی جس پر اُس کے تصوّرات کے حسن کا پردہ پڑا ہوا تھا اور ان تصورات میں ایک گہری احساساتی خصوصیت تھی، جسے وہ ایک عملی نتیجہ پیدا کرنے کے لئے استعمال میں لاتا تھا۔ شاعری کی اس موج یا خاصے کو بعض نقادوں نے پُرتکلف اور جذباتی کہا ہے لیکن ایک اطالوی نقاد کے خیال میں یہ بات صحیح نہیں ہے۔ وہ اعتراض کی دلیل کے طور پر کہتا ہے کہ وہ تاثر یا اظہار جو ہائینے کی روح میں سب سے پہلے نمودار ہوتا ہے، دوبارہ کم موافق حالات میں بھی نظر آتا ہے بلکہ اُس کے آخری ایام تک قائم رہتا ہے اور اُن ننھی اور نازک نظموں میں ظاہر ہوتا ہے جو اوس کی بوندوں کی مانند شفاف اور پاکیزہ ہیں نظم کے علاوہ اس کی نثر کی غیر معمولی تازگی میں بھی یہی بات نظر آتی ہے اس لئے اس متواتر شگفتہ اظہار کو ہم محض پُرتکلف اور جذباتی کہہ کر ہی نظر انداز نہیں کر سکتے۔

ہائینے کی تمام شاعرانہ تحریک کا سرچشمہ اس کی بچپن کی شاعری کو کہا جا سکتا ہے۔ وہ بچپن کی شاعری یا شاعرانہ اندازِ نظر جو ہر شخص اپنے گھر کی گرم جوشی اور اپنے ماں باپ کی عاطفت میں محسوس کرتا ہے۔ یہ وہی طفلانہ اندازِ نظر ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہم بچپن میں آنکھیں کھولے، ایک معصوم استعجاب کے ساتھ آدھی آدھی رات تک کہانیاں سنتے رہتے ہیں۔ انہی کہانیوں کی وجہ سے ہمیں تاریخ میں دلچسپی ہو جاتی ہے اور ہم شہزادوں، شہسواروں اور بڑے بوڑھے داناؤں کو سراہنے لگتے ہیں۔ اور اُن فرضی کرداروں سے ایک گہری ہمدردی محسوس کرنے لگتے ہیں، اُن کے کاموں میں خیالی طور پر حصّہ لینے لگتے ہیں۔ ہمارے ذہنوں پر پرانے قلعے اور محل ایک گھٹا کی مانند چھا جاتے ہیں۔ ہائینے کے ذہن میں بچپن کے یہ نقوش اس قدر گہرے ہو گئے کہ ماضی کی دلکشی اس کے لئے ایک خبط اور جنون بن گئی اور وہ چاہنے لگا کہ وہی گذرا ہوا زمانہ لوٹ آئے بچپن میں ڈان کوبیٹے اور گولیور کے سفر اُس کی محبوب کتابیں تھیں اور بلوغ کے بعد ماضی کی طرف یہ رجعت ایک اور ہی رنگ اختیار کر گئی جس میں شاید اس بات کو بھی دخل تھا کہ اُس کے ذہن میں اپنی پہلی محبوبہ امیلی کی ہستی ناکامی کی وجہ سے کسی اور ہی دنیا کی بن کر رہ گئی تھی اور اس لئے اُس کو مری ہوئی عورتوں سے ایک خاص تعلق نفسی رہا۔ وہ اپنی نظموں میں بارہا ایسی عورتوں کا ذکر کرتا ہے جو از سرِ نو قبروں سے جاگ کر نکلتی ہیں اور اپنے عشاق کو دکھائی دیتی ہیں۔ ایک جگہ وہ سلومی کی ماں ہیروڈیاس کو مخاطب کرتا ہے، وہ اُس کی نظروں میں ایک ایسی سانولی یہودن ہے جو نخلستان کے تاڑ کی طرح کھڑی ہے اور جس کی چھاتیوں کے درمیان مشرقی خوشبوئیں موجود ہیں "اے مردہ یہودن! میرے دل میں سب سے بڑھ کر تیری ہی چاہت ہے، میں تجھے یونان کی دیوی وینس (زہرہ) سے بھی زیادہ چاہتا ہوں اور شمال کی پری سے بھی زیادہ۔"

ماضی کی اس قدر دلکشی کا باعث طفلی کے نقوشِ ذہنی ہوتے ہیں اور اس اندازِ نظر پر ہی تمام رومانی ادب کی بنیاد قائم ہوئی اور وہ ادب نہ صرف جرمنی میں بلکہ تمام یورپ میں پھیل گیا لیکن اس ادب کی شدّت کو ہائینے سے بڑھ کر اور کسی نے محسوس نہ کیا۔ جس طرح انسان کے دل سے تجربے کے ساتھ ساتھ نت نئی صورتوں کی چاہ کے باوجود پہلے پیار کی شیرینی کبھی نہیں جاتی اور زندگی کی کشمکش اور تلخی میں ہمیشہ ایک قسم

کی جھوٹی تسکین دیتی رہتی ہے، اسی طرح ہائینے کے ذہن میں بچپن کے یہ تصوّرات ہمیشہ زندہ رہے۔

وہی اطالوی نقّاد جس کا حوالہ اُوپر آچکا ایک اور جگہ لکھتا ہے کہ ہائینے کی عشقیہ شاعری کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اُسے اُس کے بچپن کی اُن آرزوؤں کی بازگشت سمجھیں جن سے بعض افراد کبھی رہائی نہیں حاصل کر سکتے۔

چونکہ ہائینے کی نظر میں محبت ایک جنسی جذبہ یا جسمانی احساس نہ تھی اور وہ اسے اپنی طفلی کی نگاہوں سے دیکھ کر صرف ایک دلچسپ کھیل سمجھتا تھا اس لئے وہ ساری عمر اپنے کلام کے ذریعے سے اس کھیل میں حصّہ لیتا رہا جو اس دارالمحن میں تسلّی کا واحد ذریعہ ہے۔

اس کا اظہار ذیل کی نظم میں دیکھئے۔

دُکھ کا دارو

درد نے دل کو کچل ڈالا مرے
دیکھتا ہوں دیدۂ پُرآب سے
اُس گئے گذرے زمانے کا سماں
جب نہ تھا غم کا کہیں کوئی نشاں
جب نہ دیکھی تھی زمانے نے کبھی
شکل صورت ابتری کے دَور کی۔
جب ہر اک انسان کا دل شاد تھا
جب جہاں کا نام عیش آباد تھا۔

اب مگر دنیا پہ چھایا ہے جنوں
یہ کئے جاتی ہے ہر راحت کا خوں
دوڑ نا آگے کو گھائل کر گیا
دیکھیں کیا حالت ہوا انسان کی
آسمانوں پر خدا بھی مرگیا
اور زمیں پر مرگیا شیطان بھی

چھاگئی ہے زندگی پر ریل پیل
جس سے اُلجھن بن گئی ہر ایک شے۔

آہ! اس اندھے ہجوم دہر میں
دوسرے کو سب ہی دیتے ہیں دھکیل
وجہِ تسکیں اک اکیلا عشق ہے
راحتیں ہیں جس کی ہر اک لہر میں!

ہائینے نے رومانیت کو مٹانے سے پہلے اس کی تمام خصوصیّات کو ایک تازہ زور کے ساتھ استعمال کیا اور اُن میں ایک تخیّلی حقیقت پرستی بھر دی۔ چاندنی، اُجڑے ہوئے باغ، گل و بلبل، قبروں سے نکلتے ہوئے مردہ پریمی اور یتیم، وحشی سوار، رقصاں تیچر، دیو جنگل اور سمندر کی پریاں — یہ سب چیزیں اُس کی نظموں میں لگاتار آتی - جاتی رہتی ہیں۔

ہائینے کے کلام سے پوری طرح حظ اٹھانے کے لئے اُس کی زندگی اور محبت کے فسانے کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ کیونکہ بعض دفعہ اس کی سادگی میں کوئی اور ہی بات بل کھا کر چھپی ہوئی ہوتی ہے - اور اس لئے مترجم کو بھی ایک مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ اُس کی بہت سی نظمیں ایسی ہیں جو اپنے اصلی مدّعا کو صرف ادھورے طور پر ہی ظاہر کرتی ہیں بلکہ بعض دفعہ وہ اپنے مطلب کا اظہار ہی نہیں کرتیں جس طرح ہائینے اپنی زندگی میں ہر بات کو غیر معمولی احتیاط سے چھپا کر رکھتا تھا اسی طرح وہ اپنی نظموں میں بھی اپنے اصلی مفہوم کو چھپاتا ہے۔ ایک نظم دیکھئے۔

پرارتھنا

ننھّی تُو اک پھُول ہے گویا
پیارا پیارا اور پاکیزہ!
تیری صورت کو جب دیکھا میرے دل میں آئی اُداسی!
میں اک سرگوشی میں بولا؛ ایک دعا ہے میرے دل کی!
تیرے ماتھے کو میں چھولُوں،
اور خدا سے اتنا کہہ دوں،
"ایسے پھول کو ہر دم رکھنا پیارا پیارا اور پاکیزہ!"

اس نظم کے متعلق لوئیس انٹرمیئر لکھتا ہے کہ یہ محض ایک جذباتی گیت ہی نہیں ہے۔ پہلی بات جو اس میں نمایاں ہے یہ ہے کہ اس میں کسی محبوبہ کو مخاطب نہیں کیا گیا ہے۔ اس میں شاعر کا تخاطب کسی ننھی لڑکی سے ہے بلکہ کسی بچّی سے ہے۔ اس پھول سی بچّی کے معصوم حسن کو دیکھ کر

شاعر چاہتا ہے کہ اُس کے ماتھے کو چھوئے اور خدا سے دعا کرے کہ اسے ایسا
ہی رکھیو جیسی یہ اب ہے —— "پیاری پیاری اور پاکیزہ ——" اس نظم میں ٹھنڈی
ایک آہ بھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے گویا اُسے اس کا احساس ہے کہ یہ معصومیت
مٹ جانے والی ہے اور پھر شاید اُسے سوچ آتی ہے کہ کس طرح ایک ایسے
ہی حسن اور پاکیزگی کی مورت نے اُس سے بھی دھوکا کھیلا تھا۔ یہی ایک خیال
اس کے ذہن پر چھایا رہتا ہے اور ہائینے ہمیشہ اسی خیال کو جو بنیادی تھا۔
اپنے کلام میں چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس خیال کی شدت اور
چھپانے کی مدافعت سے ایک ردِ عمل ہوتا تھا اور وہ چھپانے کی بجائے
مکمل اظہار کر جاتا تھا۔ وہ اس ڈر سے کہ کہیں اس کے پڑھنے والے اس کے
دلی راز دل کو نہ پالیں، سیدھے استعاروں کے استعمال سے بھی گریز کرتا
ہے، ان چھپانے اور دکھانے کی مختلف حرکتوں یا اس شعری آنکھ مچولی کے
بعد جب وہ پلٹتا ہے تو اپنے پرانے موضوع کا رُخ کرتا ہے اور شاید میر تقی کی
طرح دل میں یہ سمجھتا ہے کہ

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ایک بے آس بے باکی، نرمی، عمومیت، طنز، یہ سب باتیں اُس
کی شخصیت میں قائم رہتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی وہ اپنے سینے سے اُس
اذیت کو لگائے رہتا ہے، جو ناکام محبت کی وجہ سے اُس کے نصیب میں
لکھی تھی۔

گفتگو کی آسان روی اور شاعری کا امتزاج، احساس اور طنز کا
امتزاج، اخلاص اور بناوٹ کا امتزاج —— ہائینے کے کلام میں ہر جگہ
دبا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن ظاہری صورت سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے
ہائینے کا کلام بظاہر بے ساختہ لیکن حقیقتاً بہت ہی سوچی سمجھی کہی ہوئی
چیز ہے۔ وہ اپنے کلام کی بہت گہری چھان پھٹک کیا کرتا تھا۔ اس حیران
کن سادگی اور بے ساختگی کو حاصل کرنے کے لئے وہ ایک ایک نظم کو چھ سات
بار نئے سرے سے لکھا کرتا تھا، تب کہیں جا کر وہ نظم پہلے سے بہتر آسان
اور واضح بنتی تھی۔ اور نظم کی طرح اس کی نثر کا بھی یہی حال تھا نظم و نثر کی
ان خصوصیات کے لحاظ سے ہائینے انشا سے بہت ملتا جلتا ہے۔ انشا
کے کلام میں (نظم و نثر دونوں میں) شوخی تھی، طنز اور بے ساختگی، اور تکلف
سبھی باتیں تھیں لیکن ان سب کے باوجود وہ بعض دفعہ بہت مؤثر چیزیں لکھ
جاتا تھا۔ ہائینے کی نثر کے متعلق ایک مغربی مصنف استعارۃً کہتا ہے کہ
وہ ایک ایسی بگڑی ہوئی، پر تکلف طوائف تھی جس میں انتہا کی دلکشی ہو، اور
جس کی نکتہ سنجی اور شوخی اُسی قدر تیز ہو جاتی ہو جس قدر کہ وہ اپنی دردناک
حالت کو بھلانے کی کوشش کرے۔

ہائینے نے خواہ کوئی بلند یا پر عظمت زندگی بسر نہ کی ہو لیکن یہ تسلیم
کرنا پڑے گا کہ اُس کی زندگی میں جو کمی عظمت کے لحاظ سے تھی اُسے اُس
نے اپنے کلام کی عظمت سے پورا کر دیا۔

ہائینے اور اس کے کلام کو سمجھنے کے لئے ایک اور بات کا لحاظ
بھی رکھنا چاہئے اور وہ اُس کی بیماری کا واقعہ ہے۔ اس کے کلام کی تیزی
اور تلخی محض یہودی ذہنیت اور نفسیاتی کیفیت کا نتیجہ ہی نہ تھی بلکہ اس کی
محرک اُس کی جسمانی پیچیدگی بھی تھی۔ اس کی زندگی میں کبھی کبھی ایسا موقعہ بھی
آیا کہ اس کی شخصیت کا یہودی پہلو جس کی مخالف اُسے تمام دنیا نظر آتی
تھی نسبتاً آرام سے رہا لیکن اُس کے جسم کو یہ سکون اور راحت کبھی نہ ملی۔
اُس کا جسم ایک مستقل اذیت میں مبتلا تھا۔ وہ ایک جگہ اپنے ایک
دوست کو لکھتا ہے "پچیس سال پہلے مرحوم پروفیسر ہیگل نے مجھے یقین
دلایا تھا کہ انسان دو ٹانگوں والا ایک دیوتا ہے لیکن اب کبھی کبھی مجھے اُن
کا یہ بیان مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔ خصوصاً اُس وقت جب درد میری
ریڑھ کی ہڈی میں اپنا اذیت رساں عمل کو ایک جگہ سے دوسری جگہ بدلتا
ہے۔ گذشتہ سال جب فصلیں پکی ہوئی تھیں اور چاندنی راتیں جوبن پر
تھیں تو مجھے مجبوراً بستر پر ہی لیٹے رہنا پڑتا تھا اور تب سے اب تک میں
چارپائی سے نہیں ہلا۔ میں اب وہ دو ٹانگوں والا دیوتا نہیں رہا۔ اب وہ
ہنستا ہوا انسان نہیں رہا جو ہر بات کو ہنسی میں اُڑا دیا کرتا تھا۔ اب
میں صرف رنج و اندوہ کا پتلا ہوں۔ ایک غمزدہ انسان، ایک بیچارہ
بیمار یہودی۔"

اور ہائینے کو صرف ان ذہنی اور جسمانی مصائب ہی کا سامنا نہ تھا۔
بلکہ اُسے اپنے دشمنوں اور قرض خواہوں سے بھی سابقہ پڑتا رہتا تھا۔ پچاس
سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی وہ اپنی آدھی بینائی کھو بیٹھا تھا، چل پھر
بھی نہ سکتا تھا، اُس کی قوت شامہ اور قوت ذائقہ بھی ناکارہ ہو چکی تھی۔
اس کے ہونٹوں پر فالج گر چکا تھا، —— اور اس کے علاوہ وہ بے حد غریب
اور نادار تھا۔ آٹھ سال تک وہ یونہی صاحبِ فراش رہا۔ اُس کی یہ غم نصیبی
شروع عمر سے ہی اس کے ساتھ تھی۔ نوجوانی کے زمانے میں اسی غم نصیبی
نے اُس کے شگفتہ اور اُمنگوں بھرے تخیل کو آلودہ کر دیا تھا۔ سولہ اور

بیس سال کی عمر میں اس نے جو گیت اور نظمیں لکھیں اُن کے عنوانات ہی سے ان آنے والے غموں کی جھلک دکھائی دیتی ہے "سپنوں کی تصویریں" "جُواں سال دُکھ"

ہائینے کا کلام رومانی سکول کے زوال کا باعث اس لئے ہوا کہ اُس نے اپنے کلام کو پرانے خیالات کے مٹانے میں ایک زبردست حربہ بنایا۔ اس کے علاوہ اس نے جرمنی کے سیاسی حالات کی مخالفت میں بھی اُسے استعمال کیا۔ لیکن یہ انفرادی مخالفت اُس وقت ایک اجتماعی صورت اختیار کر چکی تھی۔ سیاسی اور سماجی حالات کی وجہ سے نئی نسل کے لئے پہلا اندازِ شعر و ادب اور رومان نوازی مرغوبِ طبع نہ رہی تھی۔ لوگوں کی ضروریات کو وہ ادب پورا نہ کرسکتا تھا جو حقیقت اور عوام سے دور ایک الگ تھلگ خیالی دنیا میں پرورش پاکر ظاہر ہو۔ دنیا اُس ادب کی جویا تھی جو زندگی کے مطابق ہو اور اس لئے حقیقت پرستی کے رجحان ترقی پا رہے تھے۔ یہ زمانہ ایک طرح سے بالکل حالی اور سر سید کے زمانے کے مطابق تھا۔

جرمن ادب پر نظر ڈالتے ہوئے ہائینے کی شاعری کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے اور وہ سمندر کے متعلق اس کی نظمیں ہیں۔ شاید جرمن ادب پر سب سے بڑا احسان اُس نے یہی کیا ہے۔ یونان، انگلستان، سکنڈے نیویہ کی شاعری اور امریکہ کے شاعر والٹ وٹمن کے کلام میں سمندر کے متعلق جن شاندار احساسات کا بیان ہے اُس کی نفیس اور اعلیٰ گونج اگر دیکھنی ہو تو ہائینے کے علاوہ جرمنی کے کسی اور بڑے شاعر کے کلام میں نظر نہیں آئے گی۔ اس کے علاوہ جرمنی کے غزلیہ شعراء میں ہائینے ہی سب سے زیادہ ہمہ گیر شاعر ہے۔ یورپ کے تمام ممالک میں اور کسی شاعر کو اتنا نہیں پڑھا گیا جتنا اُسے۔ اور اُس کے مجموعۂ نظم "کتابِ نغمہ" سے بڑھ کر اور کسی کتاب نے تحریکِ رومانی پر اثر نہیں کیا۔ گویا ہائینے ہی نے جرمنی کی غزلیہ شاعری کو یورپی درجہ دیا۔

اور اب اس غزلیہ شاعری کی چند اور مثالیں!

ہائینے کی بعض نظمیں بہت ہی چھوٹی ہوتی ہیں۔ مثلاً

غموں سے، آنسوؤں سے پھول کھل کھل کر نکلتے ہیں
مری آہوں سے پیارے پنچھیوں کے گیت اُبلتے ہیں
مری پیاری! جو تو چاہے تو میں یہ پھول لاؤں گا،
ترے دوارے پہ تجھ کو راگ پنچھی کے سناؤں گا۔

ایک اور دیکھئے:۔

میں نااُمید ہو کر اوّل اوّل سب سے کہتا تھا؛
میں سہہ سکتا نہیں اس کو، نہیں یہ بات سہنے کی!
مگر سہتا ہوں نااُمید ہو کر۔ کیسے سہتا ہوں؟
نہ پوچھو مجھ سے، ہمت ہی نہیں ہے مجھ میں کہنے کی!

ایک اور:۔

نازک پھول کنول کا چپکا دیکھ رہا تھا اُوپر کو،
دیکھتے دیکھتے اُس نے دیکھا پیلا چہرہ چندا کا!
پھول کی چاہت میں ڈوبا تھا چاند، نگاہیں روشن تھیں
پریمی کے چہرے جیسا تھا پیلا چہرہ چندا کا!
پھول نے دیکھا تو شرمایا اور جھکایا نظروں کو،
لیکن پانی میں پھر دیکھا پیلا چہرہ چندا کا!

محبوبہ کا مکان

رات سکوں لئے ہوئے، ٹھہر یہ لب گلی گلی،
سامنے گھر میں رہتی تھی، وجۂ سکونِ دل مری!
چھوڑ کے شورِ شہر کا عرصہ ہوا چلی گئی،
گھر ہے مگر کھڑا ہوا ویسے کا ویسا آج بھی!

اور بھی ایک شخص ہے راہ میں یاں کھڑا ہوا،
تکتا ہے آسماں کو وہ، یاس کا اک مجسمہ!
نورِ سفید چاند کا پھیلا جب اُس کی شکل پر،
دیکھنا! دیکھتا ہوں کیا، عکس ہے میری ذات کا!

اے مرے عکسِ ناتواں! کس لئے آگیا یہاں؟
کس لئے اپنی آنکھ سے اشک بہا رہا ہے تو؟
میں بھی یہاں پہ رویا ہوں، اب وہ زمانہ ہے کہاں!
خالی گئے ہیں ہیں نے بھی، یاں کئی چشم کے سبو!

ہائینے کے دل میں عورت کی بے وفائی کا نقش اتنا گہرا تھا کہ اُس کے کلام میں ہر جگہ اُبھر آتا ہے۔ ذیل کی نظم میں بھی یہ نقش اُبھرا ہوا ہے۔ اس نظم کا اندرونی فسانہ دو طرح کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ ایک یوں کو شاعر

اپنی پہلی بے وفا محبوبہ سے تصور میں مخاطب ہے۔ دوسرا یوں کہ وہ کسی اور عورت سے مخاطب ہے اور اس کا اظہارِ محبت اُسے پہلی بے وفائی کی یاد دلاتا ہے۔

اندیشہ

جب دیکھتا ہوں ان آنکھوں کو، دُکھ درد بھی کھو جاتے ہیں،
جب چومتا ہوں۔ اِن ہونٹوں کو۔ مجھ کو بلوان بناتے ہیں۔
جب رکھتا ہوں اپنے سر کو اس نرم، معطر سینے پر،
میں دیوتا بن جاتا ہوں، مجھے آکاش کے سُکھ کب بھاتے ہیں!
لیکن جب تم کہتی ہو مجھے "مجھ کو بس چاہ تمہاری ہے"
تب جی بھر آتا ہے میرا اور آنسو اُمڈے آتے ہیں!

اندازِ نظر

فسردہ ہو کے کبھی دل جو ٹوٹ جاتے ہیں
ستارے ہنستے ہیں اور قہقہے لگاتے ہیں
ہے اُن کا اپنا انوکھا طریقہ باتوں کا
وہ سوچتے ہیں، بس اور سوچتے ہی جاتے ہیں:

"یہ خاکی عشق میں گھُل گھُل کے زیست کرتے ہیں
"ہمیشہ پھر بھی محبت پہ ہی یہ مرتے ہیں!
"محبت اِن کو دکھاتی ہے درد کے جلوے
"مگر یہ درد سے دامن کو اپنے بھرتے ہیں!

"ہمیں تو ایسی محبت کا کچھ نہیں معلوم!
"کہ جس کی ہستی بس اک لمحے میں بنے موہوم!
مٹائے چاہنے والے کو، اور مٹ جائے۔
"یہی ہے وجہ نہ ہوں گے کبھی بھی ہم معدوم"!

نور کا جادو

رات نے چھاؤنی چھائی اندھیرے اور انجانے رستوں پر!
دل میں تھکن ہے، انگ انگ میں روگ ہے میری سانسوں پر!

پیارے چندا! تو نے میرے دل کا بوجھ کیا ہلکا،
مجھ کو سہارا ہے بس تیرا، تیری کرنوں کے بل کا!

چاند! یہ تیرا نازک جادو رات کے سب اندیشوں کو،
دور بھگا دیتا ہے مجھ سے ڈر کے اندھے خیالوں کو!
میرے دل میں جتنے ڈر ہیں سب کے سب مٹ جاتے ہیں!
دل کے گھاؤ سہلاتے ہیں، سکھ کے آنسو آتے ہیں!

ذیل کی نظم میں ہائینے خود چھپاتے ہوئے اپنے راز کا واضح اظہار کر رہا ہے:-

رازِ درون پردہ

اس کا اندیشہ کبھی دل میں نہ لانا ہرگز،
اپنی چاہت کو میں رسوا نہ کروں گا پیاری!
استعاروں میں ترے حُسن کے گن گاتا ہوں
غور کرتی نہیں، نادان ہے دنیا ساری!
بھید اپنا ہے نہاں پردہ خاموشی میں،
اس نے اوڑھی میرے گلہائے سخن کی چادر!
راز پرنور ہے اور گرم ہے روپوشی میں
علم ہو سکتا نہیں اس کا کسی کو یکسر!
خواہ یہ پھول بھڑک اُٹھے، جوالا ہو جائے
پھر بھی اندیشہ کبھی آئے نہ تیرے دل میں!
جان سکتا نہیں کوئی بھی رہے گا پھر بھی
شعلۂ حسن نہاں شعر کے ہی محمل میں!

ذیل کی نظم سے اِس نکتہ وری کا اظہار ہوتا ہے جسے شاعری میں گھُلا مِلا کر ہائینے اپنا سیدھا سادا تاثر پیدا کرتا تھا۔

چغلی

تمہارے خط نے مرے دل پہ کچھ اثر نہ کیا،
اگرچہ اس کا ہر اک لفظ زور والا ہے!
یہ کہتی ہو کہ نہیں اب سے دل میں چاہ مری!
مگر میں سوچتا ہوں خط یہ کتنا لمبا ہے؟!
ہیں پورے بارہ ورق، صاف اور دونوں طرف،
یہ خط ہے یا کوئی مضمون تم نے لکھا ہے؟
میں پوچھتا ہوں کہ جب "الوداع" ہی کہنی ہو
تو کون ہے جو مصیبت میں اتنی پڑتا ہے؟

انسان کے اعتقادات اور نظریات کی بنیاد اس کے تجربوں پر ہوتی ہے۔ ہائینے کے دل پر اس کی پہلی ناکام محبت کا زخم بہت کاری لگا۔ اور اس سانحے سے وہ گویا اسی خیال کا حامی بن گیا کہ عورت کی ذات میں وفا نہیں۔ اس نظم سے اسی محدود نظریے کا اظہار ہوتا ہے۔

بھروسہ

نرم، اجیالے جسم کی چاہ کا میرے دل میں ڈیرا ہے،
انگ انگ کو جس کے کام دیو نے آ کر گھیرا ہے!
جذبوں والی آنکھیں ہیں اور اُن پہ ماتھا نورانی،
اور ماتھے پر زلفوں کی کالی لہروں کا بسیرا ہے!

دیس دیس میں ڈھونڈ کے آیا جس کو تم وہ رانی ہو،
آج ملی ہو، تم ہو اچھوتی لیکن بہت پرانی ہو!)
تم ہو بالکل میرے ڈھب کی، تم نے مجھ کو سمجھا ہے
آؤ زبانوں پر اب اپنے پریم کی میٹھی بانی ہو!

میں ہوں مرد وہی، بیٹھی تکتی تھیں تم رستہ جس کا!
دو دن کی سنگت میں مل کر ہنسنا اور مل کر رونا!
پریم کی بات کی رات سہانی چاند چھپا تو بیتے گی،
تم بھی، جیسے ریت ہے جگ کی، مجھ کو دھوکا دے دینا!

شدّتِ احساسِ غم

اکیلا آنسو مری آنکھ میں جھلکتا ہے
یہ آنسو پہلے، پرانے غموں سے دھندلا ہے
جو دن تھے رنج و الم کے وہ سارے بیت گئے
مگر یہ آنسو ابھی تک وہیں پہ ٹھہرا ہے۔

تھے اس کے اور بھی ساتھی، وہ اک زمانہ مٹا،
مٹے وہ، جیسے غم و عیش کا فسانہ مٹا!
ہر ایک مٹتے ہے نہاں شب میں باد و باراں کی۔
رہا نہ کچھ بھی، مری زیست کا بہانہ مٹا!

چھپے وہ اوس کی مانند سیکڑوں حلقے،
ستارے تھے، کہ تبسم گناں وہ نیزے تھے!
مسرتوں کو، غموں کو انہی نے چھیدا تھا،
وہ مسکراتے ہوئے دل میں میرے اُترے تھے!

مٹے وہ، اور مٹی دل سے اب تو چاہت بھی،
وہ چاہ سانس تھی میرا کہ جس کو کھینچا تھا!
میں تجھ سے کہتا ہوں، سُن میرے اشکِ کم رفتار
چلا جا آیا ہے اب لمحہ تیرے جانے کا!

آمدِ بہار

کھلا کھلا یہ بن ہے، ایسے جیسے کوئی کنواری ہو،
سج کر اس کو ملنے جائے جس کے دل کو پیاری ہو۔
ہنستی ہیں سورج کی کرنیں، کیا کہتی ہیں، کون کہے
آیا بسنتی سماں سہانا، جگ مگ جگ اپنے ساتھ ہے۔

کان میں آئی تان سریلی، ایک پپیہا بول اُٹھا،
میرے من کی بات ہی کیا ہے، سارا بن ہی ڈول اٹھا
میں نے جان لیا ہے پنچھی! دکھ کی تیری کہانی ہے
تیرے منہ پر بس لے دے کر اک "پی پی" کی بانی ہے

پریمی

تیتری کے دل میں چاہت پھول کی	ہے بسی!
لیتی رہتی ہے بلائیں سارا دن،	پھول کی!
پھول کی متوالی سورج کی کرن،	ناچتی،
ناچتی رہتی ہے اُس کے پاس ہی،	ہر گھڑی!
ہاں مگر ہے کون پیارا پھول کو!	سوچنا!
کس کی چاہت میں ہے وہ پیلا پڑا،	کانپتا!
کیا اُسے پیارا ہے تارا شام کا؟	پوچھنا!
یا ہے وہ پنچھی کہ جس کا راگ ہو	جانفزا!

پھول کے ہیتم کا مجھ کو کیا پتا : کیا پتا؟
میرے دل میں سب کی چاہت ہے چھپی، بر ملا!
میرے گیتوں میں ستارا شام کا ہے چھپا!
تیتری، پنچھی، کرن، اور پھول بھی نغمہ زا!

منظر

ایک ستارا، ایک ستارا جگمگ کرتا ٹوٹ گیا،
پھیلے ہوئے، نیلے آکاش کے دامن سے وہ چھوٹ گیا۔
دیکھ رہا تھا میں بھی اس کو، تھا وہ ستارا چاہت کا،
ٹوٹا، گہرائی میں ڈوبا، اب تو نہیں وہ ابھرے گا!

کلیاں پتے، کلیاں پتے، پیڑ سے گرتے جاتے ہیں،
گرتے گرتے فضا میں سارے رکتے، لرزتے جاتے ہیں!
دیکھ رہا ہوں، بہتی ہے یاں رنگیلی شاداب ہوا،
کلیاں پتے اس شاداب ہوا سے لپٹتے جاتے ہیں!

راج ہنس ہے، راج ہنس ہے، من کی موج میں گاتا ہے،
دیکھ رہا ہوں، گاتے گاتے سطح پہ بہتا جاتا ہے!
جھکتا ہے، جھکتے جھکتے اوجھل ہوتا ہے نگاہوں سے،
گیت بھی چھپ جاتا ہے، گانے والا بھی چھپ جاتا ہے!

خاموشی ہے، خاموشی ہے، اور ہر سو تاریکی ہے،
وہ جو ستارا ٹوٹا تھا، اب وہ اک خاک کی مٹھی ہے!
راکھ بنے بکھرے ہیں سارے پتے اور ساری کلیاں،
راج ہنس کا گیت بھی اب تو ختم ہے، دنیا سونی ہے!

جرمنی کا یہودی شاعر ہائینے بھی راج ہنس کی طرح گیت گا کر ختم ہو گیا لیکن اس کا سارا خیال صحیح نہ تھا۔ گیت نہیں مٹے، وہ اب بھی باقی ہیں۔ البتہ ان گیتوں کے متعلق اس نے جو کہا تھا کہ

مصیبت، اذیت، غضب آرزو کا
دکھایا ہے میں نے، چھپایا نہیں ہے
جو دیکھے گا ان کو مجھے جان لے گا
مرے دل کی ہر بات گویا یہیں ہے!

اس کی سچائی سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

میراجی

آئینۂ حیرت

غزل

غم نہیں یہ کہ انتظار کیا بلکہ یہ ہے کہ اعتبار کیا
بے تعلق ہی ہم تو اچھے تھے اس تعلق نے اور خوار کیا
سچ تو یہ ہے کہ دیدۂ و دل کو مفت ہی میں گناہگار کیا
ہو گیا اک سکون سا حاصل جب گریباں کو تار تار کیا
ہو سکا جب نہ اور کچھ ہم سے شیوۂ صبر اختیار کیا
کب کیا آپ ہی نے کوئی کرم جب کیا دل پہ ایک وار کیا

کوئی اپنا نہ ہو سکا حیرت
تجربہ یہ بھی بار بار کیا

عبدالمجید حیرت

سپاہی کی واپسی

یہ نیلے نیلے آسماں پہ ننّھی ننّھی بدلیوں کے قافلے
یہ اُونچی اُونچی چوٹیوں پہ جنگلوں کے سلسلے ہرے بھرے
یہ سبز سبز کھیتیاں یہ اُونچے نیچے راستوں کی کروٹیں
یہ سوئی سوئی جھیل پر شعاعِ مہر کی حسین لرزشیں
وہ بکریوں کی اِک قطار جا رہی ہے گھاٹیوں کی چھاؤں میں
وہ ڈھول کی صدا سُنائی دے رہی ہے دُور ایک گاؤں میں
مہین سا دھندلکا اک اُفق پہ خیمہ زن ہے جانے کس لئے؟
صبیح کائنات کی جبیں پہ یہ شکن ہے جانے کس لئے
میں واپس آ رہا ہوں آج پانچ سال رہ کے ہانگ کانگ میں
یہ جی میں ہے کہ طے کروں میں پانچ پانچ میل اک چھلانگ میں
الٰہی بھر دے بجلیاں سی میرے اِن تھکے تھکے سے پاؤں میں
عروسِ صبح میری منتظر ہے بیس میل دُور ایک گاؤں میں!

احمد ندیم قاسمی

بے کراں رات کے سنّاٹے میں

تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سنّاٹے میں
جذبۂ شوق سے ہو جاتے ہیں اعضاء مدہوش
اور لذّت کی گرانباری سے
ذہن بن جاتا ہے دلدل کسی ویرانے کی!

اور کہیں اس کے قریب
نیند آغازِ زمستاں کے پرندے کی طرح
خوف دل میں کسی موہوم شکاری کا لئے
اپنے پر تولتی ہے، چیختی ہے!

بے کراں رات کے سنّاٹے میں
تیرے بستر پہ مری جان کبھی

آرزوئیں تیرے سینے کے کہستانوں میں
ظلم سہتے ہوئے حبشی کی طرح رینگتی ہیں!

ایک لمحے کے لئے دل میں خیال آتا ہے
تو مری جان نہیں،
بلکہ ساحل کے کسی شہر کی دوشیزہ ہے
اور ترے ملک کے دشمن کا سپاہی ہوں میں
ایک مدّت سے جسے ایسی کوئی شب نہ ملی
کہ ذرا روح کو اپنی وہ سبک بار کرے!

بے پناہ عیش کے ہیجان کا ارماں لے کر
اپنے دستے سے کئی روز سے مفرور رہوں میں
یہ مرے دل میں خیال آتا ہے
تیرے بستر پہ مری جان کبھی
بے کراں رات کے سنّاٹے میں!

ن۔م۔ راشد

شوہر کی بھوک ہڑتال

افراد

۱۔ مقصود احمد (وکیل)	بھوک ہڑتالی شوہر	۴۔ دلیل احمد	مقصود کا چچا
۲۔ ممتاز جہاں	اُس کی بیوی	۵۔ سیتا رام	"عالمگیر نیوز ایجنسی" کا نمائندہ
۳۔ عزت حسن	ممتاز جہاں کا باپ	۶۔ مخبر	روزنامہ "مرد میدان" کا نامہ نگارِ خصوصی

زمانہ :۔ گاندھی جی کے راجکوٹ والے "برت" کے بعد

[عزت حسن کے بنگلہ کا ڈرائنگ روم۔ اس کی تفصیلات بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ہمارے ہاں ڈرائنگ روم ایک سے ہوتے ہیں۔ میں نے لکھتے وقت اپنے کمرے کا تصور کیا اور آپ پڑھتے وقت پہلے اپنے ڈرائنگ روم کا نقشہ ذہن میں رکھیں!

پردہ اُٹھتا ہے ــــ یعنی اسٹیج کا پردہ۔ عزت حسن صاحب کے گھر کا پردہ تو ایک عرصہ پہلے ہی اُٹھ چکا ــــ عزت حسن بے قراری کے عالم میں ٹہلتے نظر آتے ہیں۔ عمر تقریباً چالیس سال۔ سر کے بال ندارد۔ باربار سر کھجاتے جاتے ہیں۔ یہ ان کی عادت ہے۔ ہفتہ میں دوبار ناخن ترشواتے ہیں۔ یہ بھی اُن کی عادت ہے۔

ان کی صاحبزادی ممتاز جہاں صوفہ پر بیٹھی اخبار دیکھ رہی ہے۔ دست مرہونِ کیوٹیکس ہیں۔ ناک نقشہ اچھا ہے۔ لیکن ابرو کے بال بہت کم ہیں۔ عمر کوئی ۲۰ سال۔ چہرے سے ذہانت ٹپکتی ہے۔ اخبار ہٹا کر باپ کو دیکھتی ہیں۔ پھر گھڑی پر نظر ڈالتی ہیں۔ سات کے پونے آٹھ بجے ہیں]

ممتاز۔ (اخبار رکھ کر مسکراتی ہیں) ابا! آپ نے کتنا فاصلہ طے کیا؟

عزت۔ (یکایک رک کر) فاصلہ؟ کیا مطلب؟

ممتاز۔ میں نے کہا، آپ تین روز سے برابر ٹہلے جا رہے ہیں۔ کُل فاصلہ اب تک کتنا ہوا ہوگا؟ ہوگا یہی تین چار سو میل (ہنستی ہے) ابا آپ کی ٹانگیں واقعی ــــ جی ہاں! سمجھ گئے نا آپ؟

عزت۔ (ایک دم ٹہلنے لگتے ہیں۔ پھر رُک کر) بیٹا! ہمارے خاندان کی عزت کی بازی لگی ہے اور تجھے مذاق سُوجھا ہے۔ لاڈ پیار کا صلہ تُو نے بہت اچھا دیا۔ تُو نے ــــ تُو نے بس ــــ اُف!

ممتاز۔ (نہایت بھولے پن سے) میں نے کیا کیا؟

عزت۔ تُو نے ــــ تُو نے ــــ تُو آخر میکے آئی کیوں؟ (سر کھجاتا ہے)

ممتاز۔ لو اور سنو! میں میکے آئی کیوں! دوسری لڑکیوں کے ماں باپ تو کہتے ہیں، تُو میکے سے جاتی کیوں ہے؟ اور آپ پوچھتے ہیں، تُو میکے آئی کیوں؟ ــــ واہ ابا وا! آپ بڑے ستم ظریف ہیں۔ بیچاری امّی! خدا اُنہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے! وہ آج زندہ ہوتیں، تو کبھی ایسا سوال نہ کرتیں۔ واقعی ابا! امّی اور آپ ہم خیال کبھی ہو نہ سکے۔

عزت لیکن مرحومہ نے کبھی اس طرح مجھے دُکھ بھی نہ دیا، جس طرح تُو مقصود کو دے رہی ہے۔ مرحومہ اس طرح رُوٹھ کر میکے میں کبھی اعتکاف میں نہ بیٹھیں

ممتاز ۔ اور اگر وہ کبھی اعتکاف میں بیٹھتیں تو کیا آپ بھی اس طرح بھوک ہڑتال کر دیتے؟

عزت ۔ بھوک ہڑتال! (صوفہ پر گر پڑتا ہے) بھوک ہڑتال! ـــــ بیوی خفا ہو کر میکے چلی آئی ۔ اور سسرال کو واپس جانے سے انکار کیا ۔ یہ دیکھ کر شوہر نے بھوک ہڑتال کر دی ـــــ یہ ناشدنی نئی نسل! خدایا! اس کی نجات کیونکر ہوگی؟ (سر کھجاتا ہے)

ممتاز ۔ (اُٹھ کے کھڑکی کے پاس جاتی ہے) ابا! ہماری صنف کی نجات اسی میں ہے کہ ہم اپنا وجود منوائیں ۔ حقوق منوائیں ۔ ترقی یافتہ ممالک کی خواتین کی صف میں جا کھڑی ہوں ۔ سربلند ہوں ـــــ ابا! ہماری صنف نے آپ کی صنف کے ظلم و ستم اب تک بہت برداشت کئے ۔ لیکن اب؟ اب ہمارے اندر ان زنجیروں کو توڑ پھینکنے کی طاقت پیدا ہو گئی ہے ۔ یہ زمانہ تہذیب اور ترقی کا ہے ۔ نئی روشنی نے ـــــ

عزت ۔ (کانوں پر ہاتھ رکھ کر قطع کلام کرتا ہے) بس ممتاز! بس! اپنی تقریر بند کر ۔ یہ خواتین کا جلسہ نہیں ۔ یہ تیرا میکہ ہے ۔

ممتاز ۔ آپ نے زبان کھلوائی ہے، تو تلخ حقیقتیں بھی سُن لیجئے ۔

عزت ۔ افسوس مجھے یہ دن بھی دیکھنا تھا ۔ بیٹی زورِ خطابت دکھا رہی ہیں اور میں ـــــ میں جواب نہیں دے سکتا (ہاتھ خود بخود سر کی طرف جاتا ہے)

ممتاز ۔ (طنز سے) ابا! آپ اس عہدِ جاہلیت کو حسرت سے یاد کرتے ہوں گے، جب باپ اپنی بیٹیوں کو ـــــ

عزت ۔ بس بس! زیادہ گستاخ نہ بنو! ـــــ زمانہ اب تو ایسا آیا ہے ۔ کہ بیٹی باپ کو زندہ در گور کر دیتی ہے ۔ ممتاز! تُو نے خاندان کے نام کو بٹہ لگانے میں کوئی کسر اُٹھا رکھی؟ تین دن سے زندگی جہنم بن گئی ہے ۔ بھوک ہڑتال تو داماد کرتا ہے اور اُنگلیاں خسر پر اُٹھتی ہیں دفتر میں اب چپڑاسی تک مجھے دیکھ کر مسکراتے ہیں ۔ آہ! یہ وہی چپڑاسی ہیں جو اب تک میرے نام سے تھر تھر کانپتے تھے ۔ (سر کھجانے لگ جاتا ہے)

ممتاز ۔ تو ابا اس میں میرا کیا قصور ۔ بُرا بھلا آپ ناحق مجھے کہہ رہے ہیں جا کے اپنے داماد کو کیوں نہیں سمجھاتے؟

عزت ۔ توبہ! پھر وہی عورتوں کی منطق! ـــــ میں پوچھتا ہوں تم اُس سے لڑ جھگڑ کر یہاں آ کر بیٹھ نہ رہتیں، تو وہ بھوک ہڑتال کیوں کرتا؟

ممتاز ۔ آپ اُن کے ہم جنس ہیں نا! آپ یقیناً اُن کی حمایت کریں گے ۔ نہ ہوئیں آج امی! وہ ـــــ اُن کو ضرور میرے ساتھ ہمدردی ہوتی ـــــ آہ! آج میں اپنے آپ کو تنہا پاتی ہوں ۔

عزت ۔ تنہا خدانخواستہ کیوں ہونے لگیں؟ آج تمہاری پُشت پناہی پر تو سارے ہندوستان کی تعلیم یافتہ اور ترقی پسند خواتین ہیں مبارک باد کے تار اور خطوط آ رہے ہیں کہ ایک جائز کاز کے لئے جو سٹینڈ آپ نے لیا ہے اس کے لئے تہنیت و عقیدت کے پھول ہم آپ کے قدموں میں ڈالتے ہیں ۔ حقوق کی اس جنگ میں تمہاری شاندار کامیابی کی پُرخلوص تمنائیں ظاہر کی جا رہی ہیں ۔ ہمدرد نسواں اخبارات میں تمہارے رویّہ کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے پُرزور مقالے لکھے جا رہے ہیں ۔ "انجمن تحفظِ حقوق نسواں" کا جلسہ اظہار ہمدردی کے لئے ہونے والا ہے ـــــ اخلاقی تائید کے یہ مظاہرے کچھ کم ہیں؟

ممتاز ۔ تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آج بھی ہم پچاس سال پہلے کی عورت بن کر رہنا پسند کریں گے؟ ابا! وہ دن گئے کہ حق و انصاف کا گلا گھونٹا جاتا تھا ۔ مرد کی مطلق العنانی کا وہ خوشگوار دور ختم ہو چکا ۔ بیوی کے ساتھ بُرا سلوک کر کے یہ سمجھنا کہ دادِ مردانگی دی ۔ اس خوش فہمی کا خاتمہ جس قدر جلد ہو جائے بہتر ہے ۔ آپ اپنے داماد صاحب سے پوچھئے اُنہوں نے سوسائٹی میں مجھے کتنا ذلیل کیا ۔ اُنہیں عزیز کون ہے؟ دوست یا میں؟ دن رات یار دوستوں کے پیچھے پڑ کر اُنہوں نے کچھ بھی میرا پاس یا لحاظ کیا؟ میں تو محض ان کے گھر کی زینت کا سامان تھی جیسے فرنیچر ۔ ان سے پوچھئے، وکالت ان کا پیشہ ہے بے پروائی اور عدم توجہی کی وجہ سے کتنے مؤکل ہاتھ سے جا رہے ہیں؟ ـــــ ابا! میں نے یہ چار سال کس طرح گذارے اور کتنی روحانی اذیت اُٹھائی، یہ میرا دل جانتا ہے ۔ ہم جنسوں کے طعنے سُن سُن کر کلیجہ چھلنی ہو گیا ۔ کسی کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ رہی ۔ (صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

عزت ۔ خود کردہ را علاجے نیست ۔ مقصود تمہاری پسند کا نوجوان تھا ۔ مجھے اختلاف تھا مگر تم نے اپنی ماں کو ہم نوا بنا کر شادی کی اجازت دینے پر مجھے مجبور کیا ۔

ممتاز ۔ (سر جھکا لیتی ہے) چار سال کے اس عرصہ میں میں زیادہ عقلمند ہو گئی ہوں۔

عزت ۔ ہونہہ! ـــــ مگر یہ ہنگامہ آخر کیوں؟ فرض کر لیا کہ مقصود نے تمہارے ساتھ بدسلوکی کی۔ تو اس کے معنے یہ تھوڑے ہوئے کہ تم اس قسم کا رویہ اختیار کرو۔ مقصود بیچارے نے تمہاری منت سماجت کی، کہ گھر چلی چلو۔ میں نے بھی کتنا سمجھایا۔ مگر تم نے "گذشتہ را صلوٰۃ" کا سبق تو پڑھا ہی نہ تھا۔ تمہارا یہ رویہ ہمارے خاندان کے ہرگز شایانِ شان نہیں۔ تم ایک ہٹ دھرم اور وہ ایک ضدی۔ لاکھ سمجھایا۔ کہ بابا! یہ بھوک ہڑتال ڈرتال تو گاندھی جی کے واسطے رہنے دو۔ مگر کوئی ہماری بات مانے بھی تو؟ ـــــ اب تم ذرا سوچو۔ خدانخواستہ کچھ ہو جائے تو اس کی ذمہ داری کس کے سر رہے گی؟ تین روز ہی میں وہ بہت کمزور ہو گیا ہے اخبار میں لکھا ہے، وزن پونے دو پونڈ گھٹ گیا ہے۔ ڈاکٹر سنجیدہ صورت بنانے لگے ہیں ـــــ ممتاز بیٹا! ٹھنڈے دل سے غور کرو۔ تم ـــــ (جملہ پورا نہیں کر سکتا اور سر کھجانے لگتا ہے)

ممتاز ۔ (آواز میں تھرتھراہٹ ہے) زیادہ سے زیادہ میں بیوہ ہو جاؤں گی اور کیا!

عزت ۔ (غصے سے) بس بس! تم بہت سر چڑھتی جا رہی ہو۔ یہ بات زبان سے نکالنے کی تھی؟ نالائق کہیں کی۔

ممتاز ۔ خیر میں نالائق سہی۔ مگر کہئے، آپ چاہتے کیا ہیں؟

عزت ۔ یہ کہ تم مان جاؤ۔

ممتاز ۔ مگر ابا! سوال وقار کا ہے۔

عزت ۔ وقار! جھوٹا وقار! عورت کا وقار شوہر کی فرمانبرداری میں ہے یا نافرمانی میں؟

ممتاز ۔ پہلے اس سوال کا جواب دیجئے۔ شوہر کا وقار بیوی کی دلجوئی میں ہے یا برگشتگی میں؟

عزت ۔ توبہ! کیسی نامعقول لڑکی سے پالا پڑا ہے! بیٹا! میں جانتا ہوں کالج میں تیرا اختیاری مضمون منطق تھا۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں کہ ـــــ (سر کھجاتا ہے)

ممتاز ۔ پھر آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں، جن کے معنی آپ خود نہیں سمجھتے؟

عزت ۔ (تنگ آ کر) تو یوں کہو کہ تم صلح کرنے پر راضی نہیں۔

ممتاز ۔ نہیں، میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں ہر وقت راضی ہوں۔ لیکن پہل فریقِ ثانی کو کرنی پڑے گی۔

عزت ۔ مگر تمہارا رویہ ایسا ہی رہا تو گفت و شنید بس ہو چکی۔

ممتاز ۔ گفت و شنید کے وقت میں یہاں تھوڑی رہوں گی: میری جانب سے بات چیت آپ کریں گے ـــــ مگر میں سمجھتی ہوں کہ گفت و شنید ہو گی ہی نہیں۔

عزت ۔ (گھبرا کر) ہیں! کیوں؟ (ہاتھ سر کی طرف جاتا ہے)

ممتاز ۔ آپ نے اُن کو یہاں بلایا تھا۔ گھنٹہ بھر ہو گیا۔ وہ اب تک نہیں آئے۔ اب نتیجہ آپ نکال لیں۔

عزت ۔ (اُٹھ کر ٹہلنے لگتا ہے) ہوں! دلیل احمد کو میں نے بھیجا تھا۔ خیال تھا، چچا بھتیجے کو راضی کر لیں گے۔ لیکن ـــــ لیکن ـــــ ہر کام چوپٹ ہوتا ہے۔ ہائے رے قسمت! ـــــ اے کاش! میں نے شادی نہ کی ہوتی! ـــــ کمبخت کے گھر میں ٹیلیفون بھی نہیں۔ عجیب و غریب وکیل ہے۔ ٹیلیفون پر پوچھ لیتا، میاں کیا ارادہ ہے؟ بات چیت کے لئے آتے ہو یا نہیں؟ ـــــ بڑا چچا بھی عجیب آدمی ہے بھتیجے کو قائل معقول کر کے لا نہ سکا ـــــ خیر میں ذرا باہر جا کر دیکھوں

(سر کھجاتے ہوئے باہر نکل جاتے ہیں ممتاز عجیب طرح سے مسکرا کر دروازے کی طرف دیکھتی ہے پھر اخبار اٹھا کر دیکھنے لگتی ہے اتنے میں کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے)

ممتاز ۔ (گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوتی ہے اور اندر کے دروازہ کی طرف بڑھتی ہے پھر رک کر ڈرتے ڈرتے پوچھتی ہے) کون ہے؟

آواز ۔ رپورٹر! ـــــ یعنی میں ہوں، مخبر!

ممتاز ۔ (اطمینان کا سانس لے کر صوفے پر بیٹھ جاتی ہے اور کہتی ہے) آیئے

(سیتا رام اور مخبر آتے ہیں۔ دونوں نوجوان ہیں۔ مخبر کا نام، نام کم ہے اور تخلص زیادہ۔ دونوں کے ہاتھ میں نوٹ بک اور پنسلیں ہیں)

سیتا رام، مخبر ۔ آداب عرض!

(ممتاز سر کی جنبش سے جواب دیتی ہے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتی ہے)

ممتاز ۔ آپ حضرات پھر وارد ہو گئے۔ کہئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتی ہوں؟

مخبر ۔ جی وہ ـــــ ہم آپ کے تازہ بیان کے لئے حاضر ہوئے ہیں۔

سیتارام۔ آپ کے پتاجی ابھی باہر نکلے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ آپ یہاں براجتی ہیں۔ ہم نے کہا، چلو ——

مخبر۔ جی وہ —— میں نے باہر کیمرہ بھی تیار رکھا ہے۔ فلیش لائٹ فوٹوگراف لینا چاہتا ہوں۔

ممتاز۔ مگر پرسوں ہی ایک تصویر آپ لے گئے تھے۔

مخبر۔ جی ہاں —— جی وہ آپ کی مہربانی۔ آپ نے دیکھا ہوگا، وہ تصویر آج کے "مردِ میدان" میں چھپ گئی ہے۔ جی وہ —— آپ کے —— آپ کے —— مسٹر مقصود کی تصویر بھی چھپی ہے۔ بھوک ہڑتال کی تازہ ترین خبر بھی "اسٹاپ پریس" میں موجود ہے اتنی تفصیلی خبریں کسی دوسرے اخبار میں نہیں۔ جی وہ —— کیا میں یہ اخبار لے سکتا ہوں؟

ممتاز۔ شوق سے۔ آپ ہی کا مال ہے؛

مخبر۔ جی وہ —— ہیں ہیں ہیں! خوب مذاق فرمایا آپ نے! اس نازک صورتِ حال میں بھی آپ نے —— آپ کی خوش طبعی اُسی طرح قائم ہے۔ (اخبار لے کر) دیکھا مسٹر سیتارام، خبروں کی سیٹنگ کتنی اچھی ہے! اور پھر سرخیاں دیکھو۔ کیا ہی جاذبِ نظر ہیں! "مسٹر مقصود احمد بی اے، ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ کی بھوک ہڑتال کا تیسرا دن! —— نقاہت بڑھتی جاتی ہے۔ ڈاکٹر وقتاً فوقتاً معائنہ کر رہے ہیں —— مسٹر مقصود احمد کا بصیرت افروز اور ہنگامہ پرور بیان! —— صلح کی اُمید کم نظر آتی ہے؛ —— "مردِ میدان" کا نامہ نگار خصوصی رقمطراز ہے، کہ ——" یعنی یہ ناچیز! ہیں ہیں ہیں! —— اور پھر تصویریں دیکھو۔ مسٹر مقصود احمد کی تصویر کیسی اچھی چھپی ہے! بالکل تازہ ترین تصویر ہے۔ موصوف کا بیان ہے کہ آپ نے یہ تصویر اس بھوک ہڑتال سے ایک مہینہ پیشتر کھچوائی تھی۔ بڑی لاجواب تصویر ہے! ایسی تصویر تو کسی اخبار میں نہیں —— محترمہ! جی وہ —— آپ نے ملاحظہ فرمایا ہوگا کہ اخبار "ستارہ" میں بھی آپ کی تصویر چھپی ہے۔ لیکن وہ پرانی تصویر ہے۔ ہمارے ہاں کی تصویر کی گرد کو بھی نہیں پاتی۔

سیتارام۔ مسٹر مقصود! کہنا یہ تھا، کہ بھوک ہڑتال کا چرچا بہت ہو رہا ہے۔ ہر جگہ لوگ اسی کے بارے میں بات چیت کر رہے ہیں۔ "عالمگیر نیوز ایجنسی" کے ہیڈ آفس نے مجھے لکھا ہے کہ معاملہ اہم ہوتا جا رہا ہے چنانچہ کل میں نے ۳ سو لفظ تار پر بھیجے اور آج ساڑھے تین سو۔ اور آج رات کوئی نئی بات ہو تو اور لفظ بھیج سکتا ہوں۔

مخبر۔ جی ہاں وہ —— ہم تھوڑی دیر پہلے مسٹر مقصود کے دولت مکان پر گئے تھے۔ وہاں ہم نے اُڑتی اُڑتی خبر سنی، کہ گفت و شنید مفاہمت کا امکان پیدا ہونے کو ہے۔ کیا آپ اس نئی صورت حال پر مزید روشنی ڈال سکتی ہیں؟ (دونوں جواب کے انتظار میں نوٹ بک اور پنسلیں سنبھال کر بیٹھ جاتے ہیں)

ممتاز۔ میں —— میں —— مجھے اس بارے میں کچھ کہنا نہیں۔

مخبر۔ (لکھتے ہوئے) "مسز مقصود نے واقعات کی اس نئی کروٹ کی نسبت کچھ کہنے سے انکار کیا۔ اُن کے چہرے سے اُن کے دلی جذبات کا پتہ چلانا دشوار تھا ——" (سیتارام انگریزی میں لکھتا جاتا ہے) محترمہ! جی وہ —— یہ مسئلہ آپ جانتی ہیں کہ آل انڈیا مسئلہ بن گیا ہے۔ سماجی دنیا کی نظریں آپ کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ "مردِ میدان" نے اس نکتہ کو بڑی خوبی سے آج کے ایڈیٹوریل نوٹ میں واضح کیا ہے تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا تازہ بیان چاہئے۔

ممتاز۔ میں کل کے بیان میں کچھ اضافہ کرنے سے قاصر ہوں۔

مخبر۔ تو گویا اپنی حجت پہ قائم ہیں؟ —— خیر تو، جی وہ —— کوئی نیا تار مبارکباد کا آیا ہے؟

ممتاز۔ آپ اس تپائی پر ایک نظر ڈال لیں۔

مخبر۔ اوہو! یہ تو کئی تار اور خطوط معلوم ہوتے ہیں! دیکھا مسٹر سیتارام؛ کیا کثرت ہے! (کچھ لکھنے لگتا ہے۔ ممتاز ان لفافوں میں سے چن کر ایک اُٹھاتی ہے)

ممتاز۔ اس کو آپ دیکھ سکتے ہیں۔

مخبر (کاغذ نکال کر پڑھتا ہے) "All India progressive women's Society" کی صدر صاحبہ کا رقعہ ہے (کچھ لکھتا ہے) محترمہ! جی وہ —— ہاں خوب یاد آیا۔ "انجمن شوہرانِ ٹمبکٹو" کا ایک طویل تار مسٹر مقصود احمد کے نام آیا ہے۔ اس میں موصوف کو اس مستحسن اقدام پر دلی مبارکباد دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ اپنی بھوک ہڑتال سے شوہرانِ عالم کی مفید خدمت انجام دے رہے ہیں۔ اس کی نقل بھی میں لے آیا ہوں۔

ممتاز۔ (ذرا سختی سے) تو پھر آپ ہماری سوسائٹی کی صدر صاحبہ کا تار پڑھنے دیجئے

مخبر۔ جی وہ ——— جی وہ ——— دونوں تار دینے میں کیا حرج ہے، ہمارا کام تو طرفین کا نقطۂ نظر ایمانداری کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ جی وہ ——— آپ ———

ممتاز۔ آپ کچھ پئیں گے؟

سیتارام، مخبر۔ جی نہیں۔ شکریہ! شکریہ!

ممتاز۔ پی لیجئے نا۔

مخبر۔ جی نہیں۔ جی نہیں۔ بہت بہت شکریہ! جی وہ ——— ابھی چائے خانے سے آرہے ہیں۔ تو اچھی بات ہے۔ شوہران ٹمبکٹو کا تار روک لیتے ہیں۔

ممتاز۔ جی نہیں۔ آپ میری خاطر ——— آپ کو اپنا فرض پورا کرنا چاہیئے۔ کوتاہی مناسب نہیں۔

مخبر۔ جی نہیں۔ جی نہیں۔ اختیار تمیزی سے بھی تو بعض وقت کام لینا پڑتا ہے۔ جی ہاں ——— اچھا تو۔ جی وہ ——— ایک اور بات عرض کرنی ہے۔ پبلک حلقوں میں کہا جارہا ہے کہ اس نزاع کی اصل وجہ یہ ہے کہ مسٹر مقصود ——— یعنی یہ کہ آپ اور وہ ——— یعنی مسٹر سیتارام! آپ کہئے۔

سیتارام۔ مسز مقصود! مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کا بیاہ چار برس پہلے ہؤا تھا آپ کے کوئی اولاد نہیں۔ اس لئے سمجھا جارہا ہے۔ کہ مسٹر مقصود نے دوسرا بیاہ کرنا چاہا۔ آپ نے کہا، ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔ آپ میکے چلی آئیں۔ اس پر مسٹر مقصود نے احتجاج کے طور پر بھوک ہڑتال شروع کردی ——— مسز مقصود! کیا یہ سچ ہے؟

ممتاز۔ (صوفے سے اُٹھ کر) میں صرف اتنا کہہ سکتی ہوں۔ کہ آپ کے پبلک حلقوں کے دماغ بہت زرخیز ہیں۔ (مخبر اور سیتارام بھی کھڑے ہوجاتے ہیں)

مخبر۔ (لکھتے ہوئے) "مسز مقصود نے بدوران ملاقات پبلک حلقوں کے اس عام خیال کی پُرزور تردید کی، کہ ..." اچھا تو اب اجازت دیجئے۔ ہم باہر ٹھہرے رہتے ہیں۔ باور کیا جاتا ہے کہ گفت وشنید کا امکان ——— یعنی ہمارا موقع پر رہنا ضروری ہے۔ جی ہاں ——— اور جی وہ ——— آپ کی تصویر۔ میں آج لئے بغیر نہیں جاؤں گا۔ جی ہاں۔ آداب عرض! (دونوں جاتے ہیں)

(ممتاز دروازہ کھول کر اندر جاتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ایک کاغذ لئے ہوئے آتی ہے۔ بار بار اس پر نظر ڈالتی ہے۔ اتنے میں دروازہ زور سے کھلتا ہے اور عزت حسن گھس پڑتے ہیں۔ ممتاز چونک کر اُن کو دیکھنے لگتی ہے۔)

عزت۔ توبہ! ان رپورٹروں سے ناک میں دم آگیا۔ کمبخت پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔ یہاں تو ہماری جان پر بنی ہے، اور وہ ہیں کہ برابر رٹ لگائے جارہے ہیں۔ کہ بیان دیجئے! بیان دیجئے!! ——— ——— ممتاز! وہ لوگ آگئے ہیں۔ موٹر کو دیکھتے ہی وہ رپورٹر مجھے چھوڑ کر ان کی طرف لپکے ——— ممتاز! مقصود آگیا ہے! خدا کرے، سمجھوتہ ہوجائے۔

ممتاز۔ (کاغذ ان کو دے کر) یہ دیکھئے۔

عزت۔ (سر کھجا کر) یہ کیا؟

ممتاز۔ یہ میرے چودہ[1] نکات ہیں!

عزت۔ چودہ نکات! یعنی چہ؟ (سر زور زور سے کھجاتے ہیں)

ممتاز۔ یہ راضی نامہ کی شرائط ہیں۔ اگر فریق ثانی کو یہ منظور ہیں، تو میں سسرال جاسکتی ہوں۔ ورنہ ——— ورنہ مفاہمت کی بجائے آپ طلاق کی گفتگو شروع کرسکتے ہیں۔

عزت۔ کیا غضب ہے ممتاز! ایسی چیزوں سے صلح صفائی تھوڑی ہوتی ہے۔ اس سے تو بات اور بڑھ جائے گی۔ تجھے کیا ہوگیا ہے ممتاز، کیوں اپنی عاقبت خراب کرتی ہے؟

ممتاز۔ تو پھر لائیے۔ میں اسے چاک کئے دیتی ہوں۔ پھر مجھے الزام نہ دینا، میں نے بات چیت نہ ہونے دی۔

عزت۔ نہیں نہیں! ممتاز! تین روز کا بھوکا پیاسا سمجھوتہ کے واسطے آیا ہے۔ بات چیت تو بہر حال ہوگی۔ لیکن یہ چودہ نکات؟ ——— یا اللہ! میں کیا کروں؟

ممتاز۔ اس سے کم پر میں راضی نہیں۔ یہ میرا قطعی فیصلہ ہے۔ میں نے یہ چودہ نکات بہت سوچ بچار کرکے مرتب کئے ہیں۔ ان میں اب کوئی ترمیم نہیں ہوسکتی۔ یہ بات ان پر واضح کردیجئے۔ آپ میرے والد ہیں۔ میری بھلائی چاہتے ہیں ——— مجھے کچھ اور کہنا نہیں ہے میں اب جاتی ہوں (دروازہ کھول کر اندر جاتی ہے)

عزت۔ (ہاتھ سر پر رکھے دروازے کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھتے ہیں۔ پھر ٹہلنے لگتے ہیں) عجیب لڑکی! ——— (کاغذ ہلا کر) یہ چودہ نکات! ———

---

[1] چودہ نکات کے اس خیال کے لئے میں برادرم سید بادشاہ حسین صاحب کا ممنون ہوں۔

خدایا! میری آبرو رکھیے! (کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے) آیئے -
(کاغذ کوٹ کی جیب میں رکھ لیتا ہے)
(دلیل احمد داخل ہوتے ہیں۔ پست قد۔ توند کسی قدر نکلی ہوئی
عمر تقریباً ۴۵ سال۔ آدمی خوش مزاج ہیں۔ ناگوار صورت حال میں
بھی ہنسنے ہنسانے سے نہیں چوکتے۔ اس لحاظ سے عزت حسن
اور اُن کے مزاج میں بہت فرق ہے۔)

عزت۔ مقصود کہاں ہیں؟

دلیل۔ ارے بھئی! وہ نامہ نگار جونک کی طرح لپٹ گئے ہیں۔ آپ کا یہاں
آنے سے مقصد کیا ہے؟ کیا گفت و شنید صلح ہونے والی ہے؟
اس کے امکانات کیا ہیں؟ کیا آپ شرائط صلح کی نسبت پیش قیاسی
کر سکتے ہیں؟ —— لاحول ولاقوۃ! بیچارے کو پریشان کر دیا۔ اور
یہ نامہ نگار ہی نہیں جن کی وجہ سے زندگی دوبھر ہو گئی ہے۔ محلہ والے
دوست، دوستوں کے دوست، فوٹو گرافر، وکلاء، موکل، عدالتوں
کے اہلکار، چپڑاسی، —— غرض کیا کہوں ایک ہنگامہ ہے تین
دن سے بھوک ہڑتال نہ ہوئی، بن پیسے کا تماشا ہو گیا۔ کوئی مزاج
پرسی کو آرہا ہے۔ کوئی ہمت دلا رہا ہے —— تو جناب والا! یہ
ہے شوہر کی بھوک ہڑتال پہلے ہماری آپ کی بیویاں لڑ جھگڑ کر کھانا
پینا چھوڑ دیتی تھیں۔ اب بھوک ہڑتال شوہر کرتے ہیں۔ زمانہ الٹا ہے

عزت۔ غلط۔ زمانہ ترقی کر رہا ہے دلیل صاحب!

دلیل۔ اچھی ترقی ہے کہ شریف آدمی کی عزت و آبرو خطرہ میں پڑ جائے -
میں نے مقصود سے کہا۔ میاں! تم نے میرے نام کو نقطہ لگا دیا —
اچھا یہ ممتاز کہاں ہے؟ اُسے میرا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ میں نے
کتنی مشکل سے مقصود کو یہاں آنے پر مجبور کیا ہے —— کہاں
ہے وہ؟

عزت۔ اندر ہے۔ مجھے گفت و شنید میں مختار بنا دیا ہے! (تلخی سے ہنستا
ہے) عموماً ماں باپ شادی کے وقت لڑکی کی طرف سے گفتگو
کرتے ہیں۔ مگر میں —— دلیل صاحب! دیکھئے میں بھی ایک باپ
ہوں! (کوئی دروازہ کھٹکھٹاتا ہے۔ عزت دروازہ کھولتا ہے)

مقصود۔ آداب عرض ہے! کیا میں آسکتا ہوں؟

عزت۔ آؤ مقصود! آؤ۔ یہ تمہارا ہی گھر تو ہے۔ خیریت کیسی؟ آؤ آؤ۔
(مقصود داخل ہوتا ہے۔ عمر تقریباً تیس سال۔ اونچا پورا۔ سانولا
رنگ۔ ڈاڑھی مونچھ غائب۔ آنکھوں کے گرد حلقے پڑنے
لگے ہیں۔ گال کسی قدر پچک گئے ہیں۔ آواز دھیمی ہو گئی ہے
حرکات و سکنات سے کمزوری ظاہر ہے)

عزت۔ بیٹھو مقصود! یہاں بیٹھو۔

مقصود۔ آداب عرض ہے! (بیٹھ جاتا ہے)

عزت۔ جیتے رہو بیٹا!

دلیل۔ آپ یہ کہہ رہے ہیں۔ مگر صاحبزادے تو مرنے پر کمربستہ ہیں۔

عزت۔ کیا حال بنا لیا تم نے مقصود؟ گھر کی بات اخباروں تک پہنچا دی؟
کیا یہی ایک علاج رہ گیا تھا؟ (سر کھجاتا ہے)

مقصود۔ معاف کیجئے۔ میں نے جو کچھ کیا، سوچ سمجھ کر کیا۔ اسی میں مجھے
بھلائی نظر آئی —— تو اب اصل گفت و شنید شروع کریں؟

عزت۔ گفت و شنید کیا ہے؟ بس کہنا یہ ہے کہ تم بھوک ہڑتال ترک کر دو
پھر میں کسی نہ کسی طرح ممتاز کو ——

مقصود۔ جی نہیں، میں اپنے مقصد عظیم سے غداری نہیں کر سکتا۔ میں صرف
ایک شرط پر بھوک ہڑتال ترک کر سکتا ہوں۔

دلیل۔ وہ یہ ہے کہ ممتاز جہاں، جو تمہاری بیوی ہے اور عزت صاحب کی
دختر، معافی مانگ کر تمہارے گھر جانے پر راضی ہو جائے۔

مقصود۔ میں معافی کی قید اُٹھا لینے کو تیار ہوں۔

عزت۔ لیکن ممتاز جہاں ان شرائط پر تمہارے گھر جانے پر راضی ہے۔ اس
نے چودہ نکات مرتب کئے ہیں (جیب سے کاغذ نکالتا ہے اور سر
کھجانے لگتا ہے)

مقصود۔ چودہ نکات! —— دیکھا آپ نے چچا؟ میں نہ کہتا تھا؟ آپ نے
ممتاز جہاں کو ابھی پوری طرح سمجھا کہاں ہے؟

دلیل۔ ارے بھئی یہ چودہ نکات کیا بلا ہیں؟ ذرا میں بھی تو دیکھوں (کاغذ عزت
کے ہاتھ سے لے کر) اللہ اکبر!

مقصود۔ جی ہاں! ابھی سے آپ کو اللہ یاد آنے لگا۔ چچا میں بغیر دیکھے وہ
چودہ نکات گنا سکتا ہوں۔

عزت۔ ہاں دلیل صاحب! پہلے وہ نکات پڑھ کر سنا دیجئے۔ بحث بعد
کو ہوگی۔

دلیل۔ (گلا صاف کرتا ہے) نمبر ۱، فریق ثانی کم از کم چودہ گھنٹے گھر میں رہے۔
(استثنا خاص مجبوری کی بنا پر) نمبر ۲، فریق ثانی رات کے آٹھ بجے

سے پہلے گھر آجایا کرے۔

مقصود۔ دیکھئے دیکھئے۔ یہ تو کرفیو آرڈر ہے۔ یہ کیسے ——؟

دلیل۔ اے میاں پہلے سن تو لو —— نمبر(۳) فریق ثانی سینما تھیٹر فریق اوّل کے بغیر نہ جایا کرے۔ نمبر(۴) دوستوں کو فریق ثانی گھر پر جمع نہ ہونے دے۔

مقصود۔ دیکھئے، میں احتجاج کرتا ہوں۔ یہ تو صاف دفعہ ۱۴۴ ضابطۂ فوجداری ہے کہ دوستوں کا اجتماع ممنوع۔ مجمع خلاف قانون کی تعریف صرف میرے دوستوں پر صادق آتی ہے! خوب!

دلیل۔ توبہ! پھر وہی۔ ذرا خاموش رہو مقصود —— ہاں۔ اس شرط کی مستثنیات، مؤکل اور ہم پیشہ اصحاب۔ نمبر(۵) فریق ثانی (ا) فریق اول کی سہیلیوں کے آنے جانے پر کوئی اعتراض نہ کرے (ب) فریق اوّل کی سہیلیوں سے خوش اخلاقی اور مروّت کے ساتھ پیش آئے۔ (ج) فریق اول کی موجودگی میں یا عدم موجودگی میں کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالے جس سے فریق اول کی سہیلیوں یا خود فریق اول کو دکھ پہنچے۔ نمبر(۶) فریق ثانی کی حد تک موٹر کے پٹرول کا ماہانہ خرچ زیادہ سے زیادہ ۱۰ روپے ہو۔

مقصود۔ دیکھئے دیکھئے۔ یہاں میری نقل و حرکت پر پابندیاں عائد کی جا رہی ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، میری حیثیت شوہر کی ہے یا لیڈر کی؟

دلیل۔ عجب بے صبر بندے ہو! سنو۔ نمبر(۷) فریق ثانی ایسی پارٹیوں یا دعوتوں میں شرکت سے معذوری ظاہر کرے جن میں فریق اوّل مدعو نہ ہو۔ نمبر(۸) فریق ثانی ایسے دوستوں کی دوستی فوراً ترک کر دے۔ جن سے اس کی نیک نامی کو خطرہ لاحق ہو جائے یا جن کے متعلق فریق اوّل کی رائے اچھی نہ ہو۔ نمبر(۹) فریق ثانی فریق اوّل کی نسبت (از راہِ مذاق ہی سہی) ایسے کلمات زبان سے نہ نکالے جن سے فریق اوّل کی حیثیت عرفی کے متاثر ہونے کا امکان ہو۔

مقصود۔ ہونہہ! پھر بھی جمہوریت کے اس دور میں آزادیٔ تقریر کے چرچے ہیں!

دلیل۔ نمبر(۱۰) فریق ثانی فریق اوّل کے دوستوں اور اُن کی بیویوں یا سہیلیوں اور اُن کے شوہروں یا اُن کے ارکان خاندان کے ساتھ خوشگوار تعلقات برقرار رکھے۔ نمبر(۱۱) فریق ثانی فضول خرچی چھوڑ دے۔ (تشریح۔ فریق ثانی روزانہ ایک ڈبیا سگریٹ سے زیادہ نہ پیا کرے)

مقصود۔ یہ کس قسم کا معاہدہ ہو رہا ہے؟ (کھڑے ہو کر) میں اعلان کرتا ہوں کہ گفت و شنید ٹوٹ گئی! —— واہ! یہ بھی کوئی بات ہے! ایسی ذلت آمیز شرائط!

دلیل۔ بیٹھو مقصود بیٹھو۔ بیوقوفی کی باتیں نہ کرو۔ پہلے سن تو لو۔ اب صرف ۳ شرائط رہ گئی ہیں۔ ہاں۔ نمبر(۱۲) فریق ثانی ہر دوسرے تیسرے مہینے کم از کم ایک ساڑھی اور ایک جوڑا شوز فریق اول کے لئے خریدا کرے نمبر(۱۳) فریق ثانی اپنے پیشہ کے فرائض توجہ، محنت اور دلبستگی سے انجام دے اور نصب العین جج کا عہدہ ہو۔ آخری شرط ہے۔ فریق ثانی اتنے مقدمات میں پیروی کرے کہ جن سے ماہانہ آمدنی کم از کم چار سو روپے ہو۔

مقصود۔ گویا یہ میرے ہاتھ میں ہے۔ لوگ صلح جُو اور امن پسند ہو جائیں۔ اور مقدمہ بازی ترک کرنے لگیں، تب؟ تب بھی معاہدے کی خلاف ورزی کا الزام میرے ہی سر تھوپا جائے گا! —— میں —— میں —— یہ معاہدہ بالکل یک طرفہ ہے۔ میں اس پر دستخط کرنے کو تیار نہیں۔ بھوک ہڑتال کرتے ہوتے مر جاؤں گا۔ مگر ——

عزّت۔ ایسی باتیں نہ کرو مقصود! خدا کے لئے —— ! تم نہیں جانتے، مجھے کتنا رنج ہوتا ہے۔ تم پڑھے لکھے آدمی ہو۔ سمجھ دار ہو۔ تمہاری نیکی اور شرافت میں کلام نہیں۔ کیا تم اتنے ایثار سے کام نہیں لے سکتے، محض رفع شر کی خاطر؟

مقصود۔ ایثار! وہ بھی کوئی ایثار ہے جو زن مریدی کی حد تک پہنچے؟ آپ حضرات بھی مرد ہیں۔ سینہ میں دل رکھتے ہیں۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیے، آپ میری جگہ ہوتے، تو کیا ایسے ایثار کا مظاہرہ کرتے؟

عزّت۔ مقصود! سوال یہ نہیں۔ سوال تو اب یہ ہے کہ تم کو کیا کرنا چاہیئے (سر کھجاتے ہیں)

مقصود۔ میرا جواب آپ نے سن لیا۔ میں اپنے قتل نامہ پر دستخط کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہوں۔ آپ مجھے رجعت پسند کہئے۔ تنگ نظر کہئے۔ بے حس کہئے۔ مگر میں ——

عزّت۔ (عاجز آکر) دلیل صاحب! آپ ہی انہیں سمجھائیے۔

دلیل۔ بھئی! نوجوان نسل کو سمجھانا ہمارے آپ کے بس کی بات نہیں۔ آپ ممتاز کو سمجھا نہ سکے۔ میں مقصود کو کیا خاک سمجھا سکتا ہوں! —— اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ آپ ہم ہجرت کر جائیں۔

عزّت۔ جان عذاب میں ہے! —— تو آخر اس کا کیا حشر ہوگا۔

دلیل ۔ عزّت صاحب! آپ ممتاز کو سمجھانے کی پھر کوشش کیجئے کلید کامیابی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

عزّت۔ (اُٹھ کر) صبر کا پیمانہ چھلک رہا ہے۔ ضبط کا یارا نہیں رہا آخر خود سری کی ایک حد ہے، اب تک طرح دیتا رہا، اور یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ لیکن اب —— ٹھہریئے میں ابھی آیا۔ ذرا ممتاز سے —— نکات والا کاغذ لے کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اندر جاتے ہیں)

دلیل ۔ ارے مان جاؤ نا میاں! بلا سر سے ٹلتی ہے تو ہاں کہہ دینے میں کیا مضائقہ؟ بعد میں معاہدہ توڑ ڈالو۔ پوچھنے کون آتا ہے! دنیا میں یہی تو ہوتا آیا ہے۔

مقصود۔ چچا آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں؟ میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہوں۔ لیکن آپ چاہتے ہیں کہ میں خطا در خطا کا مرتکب ہو جاؤں۔

دلیل ۔ خطا در خطا؟ میں نہیں سمجھا۔

مقصود۔ اس مضحکہ خیز عہد نامہ پر دستخط کروں۔ یہ پہلی خطا۔ پھر عہد نامہ کی خلاف ورزی کروں۔ یہ دوسری خطا۔

دلیل ۔ بھئی تم اب قانون چھانٹنے لگے۔ ارے بابا! کسی کو یہ کہتے بھی سنا کہ گھریلو زندگی میں قانون دان کی ضرورت ہوتی ہے۔

مقصود۔ خیر آپ سمجھتے نہیں —— ذرا باہر جا کر دیکھئے وہ نامہ نگار ہیں یا چلے گئے؟

دلیل ۔ خدانخواستہ کاہے کو جانے لگے۔ قرض خواہ تنگ آ کر پھر بھی چلا جائے گا۔ لیکن یہ نامہ نگار! خدا ان سے سمجھے اَبے بُلائے آتے ہیں اور دھکے دینے پر بھی دفع نہیں ہوتے۔ دوسروں کے معاملات میں دخل در معقولات اس صفائی سے دیتے ہیں کہ باید و شاید۔ تمہارا ہی قصہ سامنے ہے۔ اخبارات کے کالم کے کالم سیاہ ہوگئے ہیں۔ لعنت ہے! یہ بھی کوئی شرافت ہے!

مقصود۔ خیر آپ ذرا دیکھ آئیے۔

دلیل ۔ جاتا تو ہوں۔ (اُٹھتا ہے) مگر وہ مجھے لپٹ جائیں گے۔ صلح کی گفت و شنید کی کیا رفتار ہے؟ امید افزا ہے یا حوصلہ فرسا؟ —— خدا دشمن کو اس بلا سے ——

مقصود۔ مگر چچا یہ دیکھئے۔ وہ چودہ نکات۔ خدا کے لئے ان نکات کا ذکر نہ کیجئے۔ لے اُڑیں گے اور بات کا بتنگڑ بنا ڈالیں گے۔

دلیل ۔ ہاں ہاں۔ میں اتنا بے وقوف نہیں۔ تم اطمینان رکھو (باہر جاتا ہے مقصود آپ ہی آپ مسکرانے، پھر صوفہ پر آرام سے لیٹ کر ہنسنے لگتا ہے پھر اخبار اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ اتنے میں عزّت صاحب اندر سے آتے ہیں مقصود سنبھل کر بیٹھ جاتا ہے)

عزّت۔ میں نے اُس کی خوب خبر لی راہ راست پر آ رہی ہے۔ تم سے بات چیت اب خود وہ کرے گی۔ —— یہ دلیل صاحب کہاں چلے گئے؟ (سر کھجانے لگتا ہے)

مقصود۔ جی وہ نامہ نگاروں کی خبر لینے گئے ہیں۔

دلیل ۔ اچھا تو میں بھی —— تم بیٹھو۔ تم بیٹھو۔ وہ اب آیا ہی چاہتی ہے (باہر چلے جاتے ہیں)

(مقصود پھر آرام سے لیٹ جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور ممتاز نظر آتی ہے۔ مقصود کنکھیوں سے دیکھتا ہے۔ مگر انجان بنا رہتا ہے۔ ممتاز کمرے میں آ کر دروازہ زور سے بند کرتی ہے۔ مقصود سر اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ پھر لیٹ جاتا ہے۔ اور تمہید کے طور پر کھانستا ہے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہتی ہے۔ یہ گفتگو کشیدگی کی فضا میں ہوتی ہے)

ممتاز۔ آپ کا مزاج تو اچھا ہے؟

مقصود۔ آپ کی دعا سے اچھا ہوں!

ممتاز۔ آپ مجھ سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں؟

مقصود۔ آپ کے والد صاحب ابھی ابھی فرما رہے تھے، آپ مجھ سے بات چیت کرنے تشریف لا رہی ہیں (ممتاز دوسرے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

عزّت۔ آپ نے میرے چودہ نکات دیکھے؟

مقصود۔ دیکھے تو نہیں، البتہ سننے کی عزّت حاصل ہوئی۔

ممتاز۔ کیا خیال ہے؟

مقصود۔ اکثر بیویاں اس قسم کے نکات کے سہارے حکومت کرتی ہیں۔ لیکن یہاں فرق اتنا ہے، کہ آپ نے باضابطہ طور پر ان کو مرتب بھی فرما لیا۔ بلاشبہ یہ گرانقدر خدمت ہے۔

(ممتاز کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، معلوم نہیں غصہ سے یا ہنسی کو روکنے کی کوشش میں)

ممتاز ۔ جب اکثر شوہر اس قسم کے نکات کی پابندی کرتے ہیں، تو پھر آپ کو اعتراض کیوں ہے؟

مقصود ۔ میں نہ تو اتنا جاہل ہوں نہ اتنا مہذب ۔ میں تو ایک نیم مہذب شوہر ہوں ۔

ممتاز ۔ تہذیب پر چوٹ کرنے کی عادت آپ نے اب تک نہیں چھوڑی ۔

مقصود ۔ اس عادت کے چھوڑنے میں کونسی رکاوٹ ہے؟ اس کا جواب مجھ سے بہتر آپ دے سکتی ہیں ۔

ممتاز ۔ کہتے ہیں، جو شخص بھوک ہڑتال کرتا ہے، اس کی روحانی قوت اتنی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے دل میں دوسروں کے خلاف نفرت و حقارت جگہ نہیں پا سکتی ۔ آج معلوم ہوا یہ نظریہ اتنا صحیح نہیں ۔

مقصود ۔ بھوک ہڑتال انسانوں ہی سے سرزد ہوتی ہے اور انسانوں میں مرد، اور مردوں میں شوہر دنیا کی بدترین ہستی ہے ۔ گاندھی جی کی اور بات ہے ۔ وہ شوہر کم ہیں اور لیڈر زیادہ ۔

ممتاز ۔ میں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ شوہر دنیا کی بدترین ہستی ہے ۔

مقصود ۔ میں یہی نتیجہ اخذ کرتا آیا ۔

ممتاز ۔ ایسے نتیجے اخذ کرنا آپ جیسے وکیل کے شایاں نہیں ۔

مقصود ۔ وکیل جھوٹ بہت بولا کرتا ہے ۔ سمجھ لیجئے ۔ میں اس وقت جھوٹ بول رہا ہوں ۔

ممتاز ۔ معاف کیجئے ۔ آپ اتنے ناکام وکیل ہیں کہ جھوٹ بھی ٹھیک طرح نہیں بول سکتے ۔

مقصود ۔ جی ہاں، مجھے اعتراف ہے ۔ جھوٹ سلیقے سے بولنا کم از کم مجھے تو نہیں آتا ۔ (تلخی سے ہنستا ہے)

ممتاز ۔ (جھٹ موضوع بدل کر) اچھا میں نے سنا ہے، گاندھی جی نے ہمدردی کا تار آپ کے نام بھیجا ہے (لہجہ میں طنز نمایاں ہے)

مقصود ۔ یہ قسمت کہاں ہے؟ غلطی سراسر میری ۔ بھوک ہڑتال شوہر کی حیثیت میں شروع کی ۔

ممتاز ۔ آپ کو لیڈر بننے کی بڑی آرزو معلوم ہوتی ہے ۔

مقصود ۔ گھر میں لیڈر نہ بن سکے تو قوم کی کیا خاک لیڈری کر سکیں گے؟

ممتاز ۔ مگر ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جو گھر میں لیڈر نہ بن سکے ۔ وہ آگے چل کر قوم کے بڑے اچھے لیڈر ثابت ہوئے ۔ یہاں تک کہ جیل خانے بھی گئے ۔

مقصود ۔ فرق کیا ہوا؟ ایک جیل خانہ سے نکل کر دوسرے جیل خانے میں گئے ۔

ممتاز ۔ آپ کی اس معصومیت کی کافی داد نہیں دی جا سکتی ۔ آپ فرماتے ہیں ۔ گھر شوہر کے لئے جیل خانہ ہے ۔ کیا خوب !

مقصود ۔ جی ہاں ۔ گھر جیل خانہ ہے ۔ میاں کے لئے بھی اور بیوی کے لئے بھی ۔ لیکن ایک قیدی ہے اور ایک جیلر ۔

ممتاز ۔ یہ خیالات لے کر آپ صلح کی گفت و شنید کرنے آئے ہیں!

مقصود ۔ (جوش سے) صلح کون روسیاہ چاہتا ہے! مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے اسی طرح مر جانے دیں ۔

(اس نوبت پر مزاحمت کا بند ٹوٹ جاتا ہے اور ممتاز یکایک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے ۔ مقصود ہکا بکا رہ جاتا ہے ۔)

ممتاز ۔ (ہچکیوں کے درمیان) پہلے تو میرا دل توڑ دیا —— اور اب —— اس کو —— اس ٹوٹے ہوئے دل کو بھی ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالنا چاہتے ہیں —— آپ سے مجھے محبت تھی اور ہے —— لیکن اس محبت کے ٹھکرانے میں آپ کو ہمیشہ لطف آتا رہا —— آپ کو میری ہنسی، زہر معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن آپ مجھے روتا ہوا دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ آپ ——

مقصود ۔ (اٹھ کر اُس کے پاس جاتے ہوئے) ممتاز! ممتاز! تم میرے سینے پر نشتر چلا رہی ہو ۔ میں کسی عورت کو روتا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتا چہ جائیکہ اپنی بیوی کو! —— ممتاز! تم محسوس نہیں کر سکتیں، تمہاری ضد نے میری محبت کو کیسی سخت آزمائش میں ڈالا ۔ محبت کا جا و بیجا اظہار ۔ میری عادت نہیں ۔ لیکن تم جذبات ہی کو اہمیت دینے پر مائل تھیں، اور اس لئے میری نسبت غلط فہمی میں مبتلا ہو گئیں مگر اس غلط فہمی نے میرا کیا حال کیا، یہ میرے دل سے پوچھو ۔ جہنم کی حسرت نہ رہی —— میں نے جان لیا، جہنم سے لوگوں کو کیوں ڈرایا جاتا ہے ۔

ممتاز ۔ لیکن آپ مجھے پہلے کی طرح چاہتے تھے، تو مجھے تاریکی میں کیوں رکھا؟ کیوں نہیں مجھے —— ؟

مقصود ۔ میں چاہتا تھا، تمہارا دل بھی اس آگ کا مزا چکھے ۔ میں چاہتا تھا ۔ مجھ کو دور سمجھ کر تم مجھ سے اور قریب ہو جاؤ ۔

ممتاز ۔ (اٹھ کر) مقصود! کیا یہ صحیح ہے؟

(ممتاز کے رویہ میں تبدیلی دیکھ کر مقصود پھر خوش طبعی پر اتر آتا ہے)

مقصود۔ تم ابھی ابھی کہہ چکی ہو، میں ایک ناکام وکیل ہوں (مسکراتا ہے)۔۔۔۔ ممتاز! اس کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی۔

ممتاز۔ اچھا وہ کیا؟

مقصود۔ تم کو یاد ہے، گاندھی جی نے ۳ ماہ قبل راجکوٹ میں برت رکھا تھا۔

ممتاز۔ ہاں ہاں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اور اس وقت کی گفتگو بھی یاد ہے

مقصود۔ ہاں۔ میں نے مذاق سے کہا تھا، کاش کوئی ایسا موقع آئے کہ میں بھی برت رکھ سکوں، تاکہ ملک میں میرا نام ہو۔

ممتاز۔ اور اس پر میں نے کہا تھا، اگر میں کبھی تم سے خفا ہو کر چلی جاؤں۔ تو تم بھوک ہڑتال کر دینا نہ صرف تمہاری شہرت ہوگی بلکہ میرا بھی نام ہوگا۔

مقصود۔ تم خفا ہو کر چلی گئیں، اور میں نے بھوک ہڑتال کر دی!۔۔۔۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔

ممتاز۔ واللہ؛ واللہ؛ (حیرت سے اس کو گھورتی ہے)

مقصود۔ اور نہیں تو کیا؛۔۔۔۔ اور پھر میں دیکھ رہا تھا، میری وکالت نہیں چل رہی ہے۔ دفتر میں دھول اُڑ رہی ہے۔ میں نے سوچا اگر میں بھوک ہڑتال کر دوں۔ تو شاید اسی سے کچھ بھلا ہو جائے۔ شہرت ہی آج کل سب کچھ ہے۔ میری چشمِ تصور نے دیکھا کہ بھوک ہڑتال کے بعد مؤکل جوق در جوق چلے آرہے ہیں اور اپنی بھوک ہڑتال کے ۳ دن میں میں نے جو کچھ دیکھا، اس سے میرا اندازہ غلط ثابت نہ ہوا۔۔۔۔ اب تم حساب لگاؤ کہ میں نے ایک کام اور کتنے کاج کئے۔ بھوک ہڑتال کی۔ نام پیدا کیا۔ شوہروں کو ایک نسخہ بتا دیا۔ بیویوں کو سہما دیا اور وکالت کی ترقی کا یقین حاصل کر لیا۔۔۔۔ یاد رکھو۔ مظلوم و مصیبت رسیدہ شوہر کی بھوک ہڑتال رائیگاں نہیں جاتی۔ تشہیرِ تجارت کا ہی نہیں، وکالت کی کامیابی کا بھی بہترین ذریعہ ہے۔

ممتاز۔ مقصود! کالج کے زمانہ میں ایک پامسٹ نے میرا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا، کہ تم ایک دن شہرت پاؤ گی۔ اس کی پیشین گوئی صحیح نکلی۔ اگر میں میکے نہ بیٹھ رہتی تو شاید صحیح ثابت نہ ہوتی۔ لڑ جھگڑ کر میکے چلے آنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ دیکھوں وہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوتی ہے یا نہیں اور تم اپنی اور میری شہرت حاصل کرنے کے زریں موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہو یا نہیں۔۔۔۔ شکر ہے تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔

مقصود۔ شاباش! صحیح معنوں میں تم میری بیوی ہو۔

ممتاز۔ ہاں مقصود! آج کھلا، کہ ہم دونوں کا خیال و رجحان ایک ہے۔ ہماری ازدواجی زندگی اب کامیاب بن سکتی ہے۔

مقصود۔ ہاں۔ تم سچ کہتی ہو۔ آج ہی سے میں جھوٹ سلیقے سے بولنے لگوں گا۔ تہذیب پر چوٹ کرنے کی عادت چھوڑ دوں گا۔ اور تم چاہو تو تمہارے ان چودہ نکات پر بھی عمل شروع کر دوں گا۔ کہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہم دونوں میں فکر و عمل کی یگانگی اور کامل ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ ہم اب تک ایک پُرفریب زندگی بسر کرتے آئے۔ لیکن آج سے ہماری کتابِ زندگی کا ایک نیا باب کُھل رہا ہے۔۔۔۔

ممتاز۔ جس میں ان چودہ نکات کو کوئی دخل نہ ہوگا۔۔۔۔ مجھے اب شرم محسوس ہوتی ہے، میں نے کیسی شرانگیز حرکت کی! ابا کیا کہتے ہوں گے؛ تمہارے چچا نے کیا رائے قائم کی ہوگی؛ اس کی خبر ان نامہ نگاروں کو لگ گئی تو غضب ہو جائے گا۔

مقصود۔ نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ میں نے اس کا انتظام کر دیا ہے۔۔۔۔ مگر بیچارے نامہ نگاروں نے ہماری اسکیم کو کامیاب بنانے میں نادانستہ بہت مدد کی، اور۔۔۔۔

ممتاز۔ اور کافی معاوضہ بھی پایا۔

مقصود۔ اچھا تو تم نے بھی ان کو کچھ دیا۔

ممتاز۔ اصولِ صحافت سے بھلا میں کیسے بے خبر رہتی!۔۔۔۔ اچھا اب باہر چلو۔ نامہ نگار کھڑے سُوکھ رہے ہوں گے۔ ہم دونوں کو تصویر کھچوانا ہے۔ مشترکہ بیان دینا ہے کہ مفاہمت ہو گئی۔ باعزت سمجھوتہ ہو گیا۔ بھوک ہڑتال ختم ہو گئی۔

مقصود۔ ابھی کہاں ختم ہوئی؛ پہلے کچھ کھلاؤ۔ بڑی بھوک لگی ہے۔

ممتاز۔ ڈنر تیار تو ہے۔ مگر نامہ نگاروں کو رخصت کرنے کے بعد اطمینان سے ہوگا۔ ہم ایک دوسرے کا جامِ صحت نوش کریں گے۔۔۔۔ مگر فی الحال اندر آؤ۔

(دونوں اندر جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے لئے اسٹیج خالی رہتا ہے۔ اندر سے ہنسی کی آواز آتی ہے پھر ممتاز کی آواز آتی ہے "چھوڑو! ارے! ابھی سے ستانے لگے!" پھر دونوں ہنستے ہوئے کمرے میں آتے ہیں۔ مقصود کے ہاتھ میں انگور کا خوشہ ہے)

مقصود۔ اور نامہ نگاران خصوصی یہ اطلاع دیں گے کہ مسٹر مقصود احمد بی اے ایل ایل بی وکیل ہائیکورٹ نے انگور کھا کر بھوک ہڑتال ختم کی۔ میاں بیوی کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور پبلک حلقوں میں یہ احساس عام ہے کہ سمجھوتہ نہایت۔۔۔۔ (دونوں باہر نکل جاتے ہیں پردہ)

ناکارہ

آہنگِ فنا

کیفِ مئے عیش و کامرانی دیکھا! دیکھا؟ کیوں رنگِ بزمِ فانی دیکھا؟
اک تودۂ خاک پر فنا کہتی ہے غافل! انجامِ زندگانی دیکھا؟

اے شہرِ خموشاں سے گذرنے والے انجام کی کچھ فکر نہ کرنے والے
سُن لے، سُن، ذرا ٹھہر جا، سُن لے تجھ سے کچھ کہہ رہے ہیں مرنے والے

یہ کبر و غرور و خود پرستی کب تک! یہ بادۂ بے خودی کی مستی کب تک!
تو موت کو اس طرح رہے گی بھولی کب تک کب تک ذلیل ہستی کب تک!

اے شورِ نشاطِ جاں پرستی، خاموش کب تک تو رہے گا رہنِ مستی، خاموش
لے موت نے نغمۂ فنا چھیڑ دیا بس بس خاموش، سازِ ہستی، خاموش

عباس بیگ محشرؔ

قطعات

برسات

مہین پھوار کے قطرے ہیں برف کے ریزے بھری ہوئی ہیں ہواؤں میں خنکیاں یکسر
فضا ہے بھیگی ہوئی اور جل رہا ہوں میں خدا کی مار سلگتی ہوئی جوانی پر

تاثرِ اوّلین

کسی خیال میں مدہوش جا رہا تھا میں! اندھیری رات تھی، تاریکیوں کی بارش تھی
نکل گئی کوئی دوشیزہ دل کو چھوتی ہوئی یہ میرے سازِ جوانی کی پہلی لرزش تھی

چاندنی رات

سارا جہاں ہے چاند کی کرنوں سے سیم گوں چھایا ہے دہر پر شبِ مہتاب کا فسوں
آنکھیں کھلی ہیں تاروں کی، بیدار ہے فضا ایسے میں بھی جو سوئے ہیں اب اس کو کیا کہوں

تلخئ حیات

وہ دل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی وہ شب کو خون رونے کی عادت نہیں رہی
محسوس کر رہا ہوں میں جینے کی تلخیاں شاید مجھے کسی سے محبت نہیں رہی

بہارِ غم

اُجڑی دنیا کو بسایا ہے ذرا دیکھو تو غم کی محفل کو سجایا ہے ذرا دیکھو تو
چشمِ گریاں، دلِ پُر خوں، جگرِ زخم آلود میں نے اک باغ لگایا ہے ذرا دیکھو تو

اظہارِ محبت

میں نے گھبرا کے کہا "تم سے محبت ہے مجھے" تم نے شرماتے ہوئے مجھ کو جواب اِس کا دیا
آہ لیکن دلِ ناشاد (یہ غارت ہو جائے) اِس قدر زور سے دھڑکا کہ میں کچھ سُن نہ سکا

اختر انصاری

عہدِ محمد قلی قطب شاہ میں عیدِ میلادُ النبی

سلاطینِ قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ امن وامان اور راحت وآرام سے گذرا اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش وعشرت اور بہجت وکامرانی میں گذار دی۔ مغل مورخوں نے قطب شاہوں کی آخری یادگار ابوالحسن تاناشاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تاناشاہ کو بڑا عیاش اور رندِ مست مشہور کر رکھا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقعے حاصل ہوئے تاناشاہ کو ان کا عشرِ عشیر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز ونعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگ متی والا قصہ صحیح ہے (جس کی رد سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود رودِ موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرأت کی پاداش میں محل سرا میں نظر بند کر دیا گیا اور وہاں ملک ملک کی حسین وشنیزادیں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور رقاصۂ چہلم کا خیال اس کے دل سے دور کر دیں) تو ظاہر ہے کہ عنفوانِ شباب کے ساتھ ہی وہ مہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا جن میں سے ہر ایک اس پر جان و دل فدا کرنے کو تیار تھی۔

اس حسین ورنگین ماحول کے ثبوت خود محمد قلی کے کلام سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر تقریب میں اس کے اطراف خوبرویوں کا جمگھٹا رہتا اور رمضان اور محرم کے مہینوں کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہوں گے جب شاہد وشراب ونغمہ اس سے دور رہتے ہوں۔ اتنا ضرور ہے کہ رمضان اور محرم میں وہ شراب قطعاً ترک کر دیتا تھا اور عیش وعشرت چھوڑ کر ایسا زاہدِ مرتاض اور متقی وپرہیز گار بن جاتا تھا کہ اس کے رندِ شاہد باز ہونے پر شاید شبہ ہونے لگتا۔ یہ اس کی طبیعت کا استقلال اور تربیت کی خوبی تھی۔

محمد قلی قطب شاہ عیدِ میلاد النبی کی بزم آرائی اور آئین بندی فضائے دلکشائے میدانِ دادمحل میں کیا کرتا تھا۔ یہ میدان محل کی جانب جنوب نہایت وسیع مربع مستطیل تھا۔ اس کے تینوں طرف جواہر ونفائس کی دوکانیں تھیں اور اس کے مشرقی اور مغربی پہلوؤں میں دو رفیع چہار منزلہ عمارتیں ایک دوسرے کے مقابل بنائی گئی تھیں جن میں سے ایک جوڑی تھا نہ اور دوسری کو نوال خانہ کہلاتی تھی۔ ان دونوں کے آگے نہایت بلند منڈوے یا دالان بنائے گئے تھے اور ہر ایک میں خاص نشیمن یا نشست گاہیں بھی ترتیب دی گئی تھیں۔ ان دونوں عمارتوں کو نیچے سے اوپر تک، اور میدان کے اطراف کی دوکانوں کو بھی، بڑے تکلف سے سجایا جاتا تھا۔ اور میدان کے بیچ میں دادمحل کے عین سامنے چالیس ستونوں اور چار سو طنابوں کا ایک خیمہ کھڑا کیا جاتا تھا۔ اس کا وسطی حصہ مخمل واطلس سے اور اطراف کا زردوزی نقش ونگار سے مزین ہوتا تھا۔

عیدِ میلاد النبی کی آمد سے بہت قبل ہی صناع، ہنرمند، اور استادانِ صنعت وحرفت ان دونوں عمارتوں کے سامنے اپنے عجیب وغریب کمالات کی پیش کش میں مشغول ہو جاتے تھے اور آخر کار جب روزِ مولود یعنی ربیع الاول کی سترھویں تاریخ[1] آجاتی تو کوسوں تک دماموں، نقاروں، نفیریوں، اور قرناؤں کی آوازوں سے میدان دادمحل گونج اٹھتا تمام شہر اور اطراف کے لوگ اس میدان میں جمع ہوتے اور صنعت وحرفت کے کرشموں کا تماشا دیکھتے۔ اور ان دو دلکشا قصروں کی تصویروں کی سیر کرتے۔ ان دونوں قصروں کی دیواروں پر تصویریں اتاری گئی تھیں۔

---

[1] محمد قلی قطب شاہ نے ۱۷ ربیع الاول کو صحیح ترین تاریخِ پیدائشِ آنحضرت صلعم قرار دیا تھا۔

درمیان میں خود قطب شاہ کے دربار کی تصویر تھی جس میں مقربان سریر، نزدیکان تخت، مجلسیان عظام، بزرگان رفیع، اور امراؤ وزرا کو اپنی اپنی جگہ بتایا گیا تھا۔ اس کی دائیں طرف خسرو ایران کے دربار اور بائیں طرف شہنشاہ مغلیہ کے دربار کی تصویریں بھی اسی اہتمام سے بنائی گئی تھیں۔ ان عظیم الشان تصویروں کے علاوہ مذہبی اور تاریخی واقعات کو بھی بذریعۂ رنگ کاری پیش کیا گیا تھا۔ ان تصویروں کی خصوصیتیں اور مناظر کی تفصیل حدیقۃ السلاطین میں درج ہے اور اگرچہ یہ تاریخ سلطان عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں لکھی گئی لیکن جشن میلاد النبیؐ کے احیا کا تذکرہ ۱۰۳۶ھ کے واقعات کے ساتھ درج ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصویریں سلطان محمد قلی ہی کی بنوائی ہوئی تھیں کیونکہ اس وقت سلطان عبداللہ کی عمر صرف پندرہ سال کی تھی اور اس کو تخت نشین ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے اور یہ عرصہ ان عظیم الشان تصویروں کی تیاری کے لئے ناکافی تھا۔ اس کے علاوہ سلطان محمد (جانشین محمد قلی) جیسے زاہد سے تو اس کی توقع ہی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ محلوں کی دیواروں پر تصویریں اترواے گا۔ اس لئے یہ تصویریں سلطان محمد قلی ہی کی بنوائی ہوئی ہوں گی۔ البتہ سلطان عبداللہ نے اس میں ضرور ضرور اضافہ کیا ہوگا جس طرح حیدرآباد کے بادشاہی عاشور خانہ کے نقش ونگار میں اضافہ کیا تھا جس کے ثبوت اب تک موجود ہیں۔

اس قصر مصوّر کی چھت پر بھی طرح طرح کے نقوش بنائے گئے تھے۔ جن میں فرشتوں کی صورتیں اور طبقہ ہائے نور کی دلفریبیاں قابل ذکر ہیں۔ اس قصر کے ستونوں کو طلائی اور لاجوردی نقاشی سے مرصّع کیا گیا تھا اور خود عمارت میں جگہ جگہ تمام روئے زمین کے بادشاہوں کی محفلوں اور مجلسوں کو ان ہی کے خاص لباسوں اور مخصوص رسم ورواج کے مطابق سجایا گیا تھا۔ اور قطب شاہی بادشاہ کی سواری کے نقشے بھی اتارے گئے تھے جن میں بادشاہ کہیں ہاتھی پر اور کہیں عربی گھوڑے پر اپنے خیل و حشم ولشکر و خدّام کے ساتھ جاتا دکھائی دیتا تھا۔

ایک جگہ شکارگاہ کا منظر تھا شیروں، ہرنوں، چرندوں، پرندوں اور سواروں اور پیادہ شکاریوں اور دوڑتے ہوئے اور گرتے ہوئے شکار کی تصویریں بھی کھینچی گئی تھیں۔ غرض یہ عجیب وغریب تصویریں نقوش اجنٹا سے کم قابل قدر نہ تھیں اور بہترین صنّاعی کا نمونہ تھیں۔ ہم یہاں باقی ماندہ تصویروں کی فہرست بھی اصل قطب شاہی تاریخ سے نقل کر دیتے ہیں۔

۱۔ مجلس سلیمان ومجمع دیوان وآدمیان ووحوش وطیور۔

۲۔ معراج حضرت نبی جلیل وصعود براق وجبریل وافواج ملائک۔

۳۔ مجلس زلیخا با زنان مصر وطشت وآفتابہ در دست یوسف و بریدن زنان ترنج با کف دست۔

۴۔ شیریں با زنان درمیان آب۔ ورسیدن خسرو پرویز۔ وآوردا درمیان آب دیدن۔

۵۔ مجنوں درصحراہا مون۔ والفت او با آہوان مطبوع وموزوں و آمدن لیلیٰ بدیدن او۔

۶۔ جنگ رستم با دیو سفید، در غار، و با اشکبوس درمعرکۂ کارزار۔

اس کے بعد مورّخ لکھتا ہے کہ[۱]

"وامثال ذالک بے حدونہایت در ایں دو عمارت تصویر نمودہ اند
وہیاکل عظیمہ وصور جسیمہ فیل وشیر وآدم واسپ وچنیں صور
مختلفۃ الہیات در ہر ضلع از اضلاع آں ابداع واختراع نمودہ اند"

(ص۵۲)

عید مولود نبیؐ میں عوام ان تمام تصویروں کو دیکھنے جمع ہوتے تھے۔ ان مصوّر ومنقوش قصروں کے سامنے، میدان میں، اس تقریب سعید کے لئے جو خیمہ کھڑا کیا جاتا تھا، اس کے وسط میں ایک شامیانہ باندھا جاتا جس میں تخت شاہی رکھا جاتا تھا جو تمام وکمال سونے کا تھا اور قیمتی جواہر سے مرصّع، اس کے اطراف شاہی تجمّل ولوازم کے مناسب زیب وزینت کی جاتی اور اسی طرح مذکورہ بالا دونوں مصوّر ومنقوش عبارتوں کے ایوانوں میں بھی صفۂ بادشاہی آراستہ کئے جاتے اور گانے اور ناچنے والیاں اطراف سلطنت سے جمع ہوکر اپنا اپنا کمال فن دکھاتیں۔ ان دونوں ایوانوں اور خیمہ کے صُفہ ہائے شاہی کے سامنے کوئی ایک ہزار رقاصائیں اور حسینان نغمہ طراز اپنے اپنے گانوں اور ناچ سے مجلس عشرت وانبساط کو گرم کرتی رہتیں۔ ان صاحبان حسن وجمال کے علاوہ تمام ملک کے دوسرے صاحبان کمال مثلاً بازی گر، ریسمان باز، لعبت باز، حقہ باز، مقلد، اہل نیرنگ وسحر،

[۱] حیدرآباد کی یہی تصویریں تھیں جن کی تقلید میں بعد کو سلطان حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اپنے قصر دریا ردولت باغ کی دیواروں کو تصویروں سے آراستہ کیا تھا اور اب مہاراجہ میسور اپنے محل کو مصور بنا کر ٹیپو سلطان کی تقلید کر رہے ہیں۔

اور سب بازو غیرہ اس موقع پر حیدرآباد میں جمع ہو جاتے تھے۔ اور میدانِ وسیع الفضا و دلکشائے داد محل میں اپنے اپنے کرتب دکھلاتے رہتے، جن کے حیرت انگیز کرشموں کو دیکھنے کے لئے شہر کی تمام مخلوق رات اور دن اس میدان میں جمع رہتی۔ حیدرآباد میں رنگ اور ناچ کے جو جلسے عہدِ سلطان العلوم آصف جاہ سابع کے آغاز تک محرم میں ہوا کرتے تھے۔ وہ دراصل عہدِ قطب شاہی کے ان ہی عید میلاد النبی کے جلسوں اور رنگ رلیوں کی یادگار تھے۔

میدانِ دلکشائے داد محل کے علاوہ عید میلاد النبی کی خوشی میں میدانِ عالم پناہ دروازۂ شیر علی (یعنی میدان چار کمان) میں بھی آسمان کی طرح بلند اطلسی خیمہ کھڑا کیا جاتا تھا اور چبوترے پر مسند ترتیب دے کر بڑے بڑے عہدے دار بیٹھتے تھے اور یہاں بھی رقص و سرود کی محفلیں سجائی جاتیں۔

اسی طرح محلِ خاص، ہشت محل، چہار صفہ، لعل محل، کنگن محل، چندن محل، صدر صفہ، اور سجن محل وغیرہ میں بھی ڈیرے اور شامیانے لگائے جاتے۔ پر تکلف مسندیں بچھائی جاتیں اور ہر جگہ بڑے بڑے سلحدار اور حوالدار مجلس آرائیاں کرتے۔ ان تمام خیموں، محلوں، اور صفّوں میں زعفران، صندل اور مشک وغیرہ کو طلائی و نقرئی بادیوں میں بھر کر، ہر روز ایک طبق پان خاصہ کے ساتھ تقسیم کرتے تھے، جو ہر محل میں سو ہزار سے زیادہ صرف ہوتے۔ ساتھ ہی ہر روز قسم قسم کے کھانوں کے دسترخوان بچھائے جاتے اور تمام خاص و عام کو شاہی کندوری سے فیض یاب ہونے کا موقع ملتا۔

یہ تو بیرونی محلّات اور خیموں کی مجلس آرائیاں تھیں۔ خاص محلِ شاہی میں مخصوص اور منتخب مہ جمال رقاصائیں اور استادانِ خوانندہ و سازندۂ ملکِ ایران و ہندوستان ہی بار پا سکتے تھے۔

اس ماہ جشن میزبانی کے آخر میں بادشاہ کی سواری نکلتی تھی تاکہ دونوں میدانوں اور ان کے اطراف کی عمارتوں کی آئین بندی اور آرائش و زیبائش کی سیر کی جائے۔ اس موقع کے لئے مخصوص فیلبان پانچ گز کے خاص شاہی ہاتھی کو زعفران اور صندل سے دھو کر طلائی زنجیروں موتیوں کی جھول، مرصّع کلغی، اور دوسرے زیوروں سے آراستہ کرکے لے آتے تھے۔ عصر کے وقت بادشاہ اس ہاتھی پر سوار ہو کر میدان کی طرف نکلتا اور جملہ ارکانِ دولت، مقربانِ تخت، سردارانِ عالی شان، وزیرانِ رفیع مکان، حوالدار، سلحدار، لشکری اور ہر طبقے کے بے شمار ملازمین اس شاہی ہاتھی کے اطراف پیادہ چلتے۔ اندرونی و بیرونی محلوں کی طوائفیں اور سب گانے بجانے والے ایک خاص سرخ لباس پہن کر جو اس تقریب میں بادشاہ کی طرف سے ان تمام کو عطا کیا جاتا تھا شاہی ہاتھی کے آگے آگے رقص کرتے اور گاتے ہوئے نکلتے تھے۔

اس سواری کی دھوم دھام اور بادشاہ کو دیکھنے کے لئے تمام شہر و اطراف کی مخلوق جمع ہو جاتی اور بازاروں دکانوں مکانوں اور چھتوں پر سوائے انسانی سروں کے اور کچھ نظر نہ آتا۔ خاص کر میدان میں ایک عظیم الشان مجمع رہتا۔ جب لوگوں کی نگاہیں بادشاہ پر پڑتیں تو وہ بے ساختہ دعائیں دینے لگتے اور تعریف کرتے۔ اس طرح میدان چار کمان سے نکل کر یہ سواری چار مینار سے ہوتی ہوئی دادِ محل کے میدان دلکشا میں پہنچتی تھی۔ جہاں چاوڑی تھانہ و کوتوال خانہ کے پاس تھوڑی دیر کے لئے شاہی ہاتھی ٹھہر جاتا۔ اس وقت عہدہ دار زر و جواہر کے طبق بادشاہ پر سے نثار کرتے اور نذر گزرانتے تھے۔ میدان کے اطراف و اکناف کے سوداگر اور تجار بھی (جو اس موقعے پر اپنی اپنی حیثیت کے شایانِ شان اپنی دکانوں کو آراستہ و پیراستہ کرتے تھے) بادشاہ کی بارگاہ میں اچھے اچھے تحفے پیش کرکے تشریف و انعام سے سرفراز ہوتے تھے۔

اس تقریب کی آخری رات میں میدانِ داد محل ایک تناول خانۂ عام کی صورت میں منتقل کر دیا جاتا تھا اور گروہ در گروہ لوگ ان دسترخوانوں پر کھانا کھاتے تھے۔ اس وقت میدان میں چاروں طرف چراغاں کئے جاتے اور دولت خانۂ شاہی کے اندر اور باہر بے حد آتش بازی جلائی جاتی۔ غرض صبح تک کھانے، گانے بجانے، اور تماشا کرنے کا سلسلہ جاری رہتا۔ میلاد النبیؐ کی خوشی کا یہ جشن بارہ روز تک دن اور رات جاری رہتا تھا۔ اور اس میں تیس ہزار ہون خرچ ہوتے تھے۔ (تفصیل کے لئے دیکھو حدیقۃ السلاطین قطب شاہی صفحات ۴۹ تا ۵۶)

یہ تو تاریخوں کا بیان تھا۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ خود سلطان محمد قلی ان کے بارے میں کیا معلومات چھوڑ گیا ہے۔ اُس کے اردو کلام میں چھ نظمیں ایسی ملی ہیں جو اسی عید کے موقعے پر لکھی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک عالی شان اردو قصیدہ اس تقریب سے متعلق موجود ہے۔ اس طرح گویا سات سال کی عید میلاد کے متعلق اس کے خیالات معلوم

ہو سکتے ہیں ۔ اس عید کی تقریب میں اس نے ہر سال ایک نہ ایک نظم ضرور لکھی اس طرح جملہ تینتیس نظمیں لکھی ہوں گی ۔ افسوس ہے کہ بقیہ نظمیں دستیاب نہ ہو سکیں جو نظمیں ملی ہیں اُن کے خلاصے یہاں درج کئے جاتے ہیں تا کہ معلوم ہو کہ وہ خود اس عید کو کیا سمجھتا تھا اور اس میں کس طرح مصروف رہتا تھا ۔ عید میلاد النبی کی ایک نظم میں وہ لکھتا ہے ۔

"آنحضرتؐ کی ولادت کی خوشی میں عرش و کرسی کو سنوارا جاتا ہے ، اور فرشتے ساتوں جنتوں کو ستاروں سے سجاتے ہیں ۔ عرش پر عشرت کے طبل بجنے لگتے ہیں ، اور تمام دنیا والے اپنی اپنی مرادیں پانے کے لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں ۔ دنیا خوشی کے مارے اپنے پیرہن میں نہیں سماتی ۔ اور تینوں جگ اپنا تن من آنحضرت پر نثار کرتے ہیں ۔ چونکہ محمد قلی قطب شاہ نہایت اہتمام سے مولود کرتا ہے ۔ اس لئے لوگ صف در صف جمع ہو کر اُس کی عمر و دولت کی ترقی کے لئے دعائیں کرتے ہیں ۔ اور فرشتے اور جن بھی صدقِ دل سے دعا کرنے کے علاوہ اعتراف کرتے ہیں کہ ایسا بادشاہ دین اور دنیا میں بھی نہیں ہے ۔ اس خلوص کی وجہ سے بادشاہ نے اپنا نام دونوں دنیاؤں میں بلند کر دیا ہے اور حوریں نور کے طبق لے کر بادشاہ پر نثار کرتی ہیں ۔ چونکہ نبیؐ کے صدقے میں محمد قلی قطب شاہ نے آج دعوت کی ہے اس لئے علیؑ کے صدقے میں اُس کے ستارے دونوں عالموں میں بلند ہیں ۔"

ثابت ہوا کہ وہ وسیع پیمانے پر دعوتِ عام کرتا تھا اور لوگ صف در صف جمع ہو کر اُس کے لئے دعائیں مانگتے تھے ۔ یہ ظاہر ہے کہ جب ہر روز ہزار آدمی سے کم نہ ہوتے تو اس دعوتِ عام میں کتنے لوگ جمع ہوتے ہوں گے ، اس لئے اُس کو فرشتوں اور جنوں کے شریک ہونے کا بھی خیال پیدا ہوا ہوگا ۔ بادشاہ ایک دوسری نظم میں حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے ۔

"ہر گھڑی خوشی اور رونق ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا پر چاروں طرف سے خوشی و خرمی کے بادل چھائے ہوئے ہیں ۔ روشنی سے تمام ملک جگمگانے لگتا ہے اور ہر طرف شادی و خوشی کا غل سنائی دیتا ہے چونکہ آج گنہگاروں کے بخشانے والے کی پیدائش کا دن ہے اس لئے فقیر اور بادشاہ سب مل کر اپنی بخشائش کی دعا کرتے ہیں ۔ لوگ دوسری عیدوں میں بھی خوشیاں مناتے ہیں لیکن اس عید کی خوشی کے برابر کوئی خوشی نہیں ۔"

خود بادشاہ اس عید کی دعوت کے اہتمام کا یوں ذکر کرتا ہے کہ

"جب ہمایوں محمد قلی قطب شاہ ترکمان عید مولود النبیؐ مناتا ہے تو تمام زمین جنت کی طرح سجائی جاتی ہے ۔ بازار قصر اور محل سب دلہن بن جاتے ہیں ، اور خوبصورت عورتیں بن سنور کر حوروں کی طرح ہر طرف سے جمع ہونے لگتی ہیں شاہ کی نازنینیں شرابِ محبت کی متوالی ہو کر لاکھوں عشوہ و انداز کے ساتھ شامیانے کے نیچے ، ہوا کی طرح سبک رفتار چلی آتی ہیں ۔ اُن کے جوبن سونے کے ایسے گڑھ دکھائی دیتے ہیں جن کو دیکھ کر لوگ حیران ہو جائیں ۔ ان ہنس مکھ سہیلیوں کی چال ڈھال اور بات چیت پر ہنس اور کوئلیں اپنے دلوں کو بطور تحفہ پیش کر دیں تو کوئی تعجب نہیں ۔ جب بادشاہ اس تقریبِ میلاد میں آسمان کی طرح سُرمائی چترؐ کے نیچے بیٹھتا ہے تو اس کے آگے آگے بڑے بڑے مدبرینِ وقت اور ہیرے اور لال جڑے ہوئے ملوک زمین بوس ہوتے ہیں ۔ جب بادشاہ ان ملوکوں کے ساتھ مجلس آرائی کرتے ہیں تو راستے کے دونوں طرف چھوٹے راجا ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہوتے ہیں ۔ جب حوض خانے میں لعلِ بدخشاں کے رنگ کی شراب بھری جاتی ہے تو اُس کی روشنی سے جام اور شیشے درخشاں نظر آتے ہیں عجب نہیں جو شراب کا نام سن کر آسمان کا جی للچائے اور مستوں کو مے پیتا دیکھ کر وہ بھی پیالے پینے لگے ۔ شاہ کی اس بزم کا تماشا دیکھنے کے لئے آسمان سے لاکھوں فرشتے خوشی خوشی چلے آئیں اور شاہ کے عیش و عشرت کو دیکھ کر کہیں کہ اے قطب شاہ تمہارے دن اور رات اس طرح چین سے گذریں اور نبیؐ کی مہربانی سے قیامت تک تم نبیؐ کے لاکھوں مولود کراؤ ۔"

معلوم ہوتا ہے کہ دعوتِ عام کے علاوہ دربارِ عام بھی کیا جاتا تھا

ؐ قطب شاہوں کا شاہی رنگ آسمانی تھا ۔

جس میں دوسرے ملکوں کے نمائندے اور کبھی کبھی بیجاپور اور احمدنگر کے سلاطین اور اطراف کے ہندو راجا بھی شریک ہوتے تھے جس طرح گولکنڈہ کا شاہی رنگ آسمانی تھا ۔ بیجاپور کا سبز اور احمدنگر کا سرخ تھا ۔ اس نظم کے آغاز میں وہ اس کی طرف بھی اشارہ کر دیتا ہے کہ وہ ہر سال عید مناتا اور اس سے متعلق نظمیں لکھتا ہے اس کا بیان ہے ۔

آب کے پھر نبیؐ کی عیدِ ولادت اپنے ساتھ عیش اور آنند لئے آئی ہے ۔ اس یومِ مسعود کی وجہ سے تمام عالم میں پھر عیش و عشرت کا دور دورہ ہو گیا ۔ گھر گھر میں تیاری اور اس کاج کے لئے زیبائش و آرائش ہو رہی ہے ۔ آج کے دن کے لئے بہت ہی سجاوٹ کی ضرورت ہے کیونکہ دنیا پر چاروں طرف عیش و آرام بادل بن کر چھا گیا ہے ۔ اس تقریب میں خود خوشی و مسرت خوش ہیں ۔ عیش متوالا ہو گیا ہے اور عشرت بھی آنند کے الاپ سن کر ناچنے لگی ہے ۔

ہم جس طرح کا آرام و راحت چاہتے تھے پروردگار نے ہم کو اس سے لاکھ درجہ بڑھ کر مسرت و عیش عنایت کیا ۔

"چمن کے تمام درخت آج خوشی میں ہمارے شریک ہو کر مستی سے جھوم رہے ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عید کی خوشی نے ان کو لالوں کے پیالے بھر بھر کر ہوا کی شراب پلا دی ہے ۔

"تیرے من کی مرادیں اور مقصود کے غنچے مولودِ نبیؐ کی وجہ سے کھل کر پھول بن گئے ہیں ۔ کیونکہ اس عید کی مسرت نے امیدوں کی برسات کی جھڑی لگا دی ہے ۔

"ہماری قسمتوں کے بنانے والے نے جس روز ہر ایک کا حصہ تقسیم کیا اُسی دن سے قطب شاہ تمہاری قسمت میں یہ عیش اور آنند بھی آ گیا ۔"

سیّد محی الدین قادری زورؔ

نوحہ

اب کہاں وہ ذوق و شوق ؟

اب کہاں وہ زندگی ؟ چل بسی فصلِ بہار
زرد ہے پھولوں کا رنگ ماتمی اِن کا نکھار
زندگانی کا سرور اور جوانی کی بہار
ہو چکا بے رنگ و بو ہو چکی بے برگ و بار
اب کہاں زندہ ہوں میں غم نصیب و کشتہ جاں
اب دلِ بے کیف میں وہ تمنّائیں کہاں ؟
بے حجاب و ناشکیب !

اب کہاں وہ دلبری ؟

اب کہاں وہ شوخیاں ؟ حسن کی رعنائیاں
بن چکی ہیں داستاں ! عشق کی رسوائیاں
اک پرانی بات ہیں !

کس قدر بے کیف ہے نغمہ زارِ زندگی !
کس قدر بے آب ہے جوئبارِ زندگی !
خاطرِ ناشاد پر یورشِ آلام ہے
تلخیوں سے آشنا میری صبح و شام ہے
ہر نفس غمناک ہے ہر نظر ناکام ہے
مجھ کو سب معلوم ہے جو مرا انجام ہے
اور میری اِنتہا !

نذیر مرغوب

معرفت سرجنان
مقبول کیمیکل ورکس بمبئی نمبر ۳
کی
سو فی صدی کامیاب دوائیں
جن کے لئے نمایشوں میں سونے چاندی کے تمغے اور یورپ کے میڈیکل آفیسروں کی طرف سے سرٹیفکیٹ ملے ہیں
اعجاز
ہیضہ۔ تلی۔ درد شکم۔ بدہضمی۔ اسہال پیچش اور بچوں کی بیماریوں کے لئے پہلی ہی خوراک اس دوا کی پیغام شفا ہے۔ کھانسی۔ بخار۔ نزلہ۔ درد سر۔ دانت کے درد اور کان کے درد کو فوراً دور کرتی ہے۔ بھڑ بچھو وغیرہ زہریلے جانوروں کا زہر دور کرنے کیلئے اکسیر ہے۔ حقیقتاً یہ دوا ہر قسم کی بیماریوں کا فوری اور حکمی علاج ہے۔ ہر گھر میں اس دوا کی ایک شیشی ہونا ضروری ہے۔ قیمت فی شیشی چھ آنے (۶/) پوسٹیج علیحدہ۔
سوزول
سوزاک اور پیشاب کی دیگر خطرناک بیماریوں کے لئے تیر بہدف ہے پہلی ہی خوراک اس دوا کی سوزش اور ٹیس بند کر دیتی ہے اور بتدریج مواد کو صاف کر کے صحت کلی حاصل ہو جاتی ہے۔ ہزاروں مایوس العلاج اس سے شفایاب ہو چکے ہیں۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں نے اس کا تجربہ کر کے پسند کیا ہے۔ قیمت فی شیشی ایک روپیہ آٹھ آنہ (عـ۱) پوسٹیج علیحدہ
زندک
یہ مشہور جادو اثر مرہم تعریف کا محتاج نہیں۔ اس کی شہرت ہندوستان کے باہر بھی اطراف عالم میں ہو چکی ہے۔ بڑے بڑے میڈیکل آفیسروں نے اس کے متعلق سرٹیفکیٹ عطا فرمائے ہیں اور نمایشوں میں سونے چاندی کے تمغے ملے ہیں۔ ہر قسم کے زخم۔ چوٹ۔ موچ جلے ہوئے کٹے ہوئے ناسور پھوڑا پھنسی اور جلدی امراض کیلئے اکسیر ہے۔ نہرو کو گلا دیتا ہے۔ ورم کو دور کرتا ہے زہریلے جانوروں کے زہر کا اثر نابود کرتا ہے۔ قیمت فی ڈبیہ ۱/
یونیورسل بام
بام بہت سے نکل پڑے ہیں۔ ان حشرات الارض سے ہمارے بام کو کوئی نسبت نہیں ہے۔ یونیورسل بام کی ایک شیشی طلب فرما کر بہتر سے بہتر بام سے اس کا مقابلہ کیجئے۔ یقیناً قیمت اور فائدہ کے لحاظ سے یونیورسل بام بہتر ثابت ہوگا۔ درد سر۔ جوڑوں کا درد اور سینہ کا درد غرض ہر قسم کے دردوں کو دور کرتا ہے۔ زخم چوٹ۔ موچ۔ کھانسی اور بچھو کے زہر کا اثر دور کرنے کے لئے اکسیر ہے۔ قیمت فی شیشی ۱/ پوسٹیج علیحدہ
مقبول آئی ڈراپ
آنکھ کی بیماریوں کے لئے بے نظیر دوا ہے۔ ہزاروں خاندانوں میں اس دوا کا استعمال ہوتا ہے خالص دیسی ادویات کا مرکب ہے بہت سے لوگوں نے اسکی نقلیں کیں مگر ناکام رہے۔ آنکھوں کی سرخی ورم خواہ سردی سے ہو یا گرمی سے سوزش پانی اور پیپ نکلنے کو یہ دوا فوراً روکتی ہے۔ اور ایک دو روز میں آنکھیں بالکل اچھی ہو جاتی ہیں۔ قیمت فی شیشی چھ آنہ (۶/) پوسٹیج علیحدہ
تفصیل اور دیگر ادویات کے لئے فہرست مفت طلب کیجئے۔
سول ایجنٹ
دی مقبول ایجنسی ۵ محمد علی روڈ بمبئی نمبر ۳
قائم شدہ ۱۹۰۶ء
تار کا پتہ:- ایجنسی بمبئی — ٹیلیفون نمبر ۲۴۴۷۲

جاپان میں براڈکاسٹنگ

گرمی میں جہاں مکھیاں اور مچھر ستاتے ہیں ریڈیو بھی کان کھانے میں کمی نہیں کرتا۔ چاروں طرف سے آوازیں چلی آتی ہیں۔ ہوا کے لئے گھر کے تمام دروازے اور کھڑکیاں چوپٹ کھلی ہوتی ہیں۔ پڑوس کے گھروں کو چھوڑ کر دور دور سے بھنبھناہٹ کی آواز چلی آتی ہے۔ کسی شہر میں ریڈیو سے مفر نہیں۔ مگر ٹوکیو کو طرۂ امتیاز حاصل ہے کہ یہاں ہر تین گھروں میں سے دو میں ریڈیو موجود ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ تیرہ برس کے اندر اندر یہ اتنا مقبول ہو گیا ہے تو حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور جاپانیوں کی ترقی پذیری پر زبان سے واہ واہ ہی نکلتی ہے۔

۲۳ء میں حکومت نے براڈکاسٹنگ جاری کرنے کے مسئلے پر غور کرنا شروع کیا۔ اگلے سال یوکوہاما اور ٹوکیو میں زلزلے اور آتشزدگی سے عام تباہی ہونے پر حکومت اور پبلک دونو نے براڈکاسٹنگ کی شدید ضرورت محسوس کی۔ چنانچہ اسی سال ٹوکیو براڈکاسٹنگ اسٹیشن کا تعمیری کام شروع ہو گیا اور اوائل ۲۵ء میں اس نے ۲۲۰ واٹ کی قوت سے براڈکاسٹنگ شروع کر دی۔ اسی سال اوسا اور ناگویہ میں بھی اسٹیشن بن گئے اور وہاں بھی کام ہونے لگا۔ اگلے سال جاپانی براڈکاسٹنگ کارپوریشن قائم ہوئی۔ حکومت نے اس کو ٹھیکہ دے دیا اور تینوں اسٹیشن اس کی تفویض میں آ گئے۔ فی الوقت جاپان میں ۳۱ اسٹیشن ہیں جن میں سے سات دس دس کلوواٹ کی قوت رکھتے ہیں اور مرکزی اسٹیشن کہلاتے ہیں۔ ٹوکیو میں پچاس کلوواٹ کا جدید اسٹیشن تعمیر ہوا ہے۔

براڈکاسٹنگ کی ابتدا پر ۲۵ء میں سامعین کی تعداد ساڑھے پانچ ہزار تھی۔ اگست ۲۶ء میں کارپوریشن کے قیام پر یہ تعداد ساڑھے تین لاکھ ہو گئی تھی اور فروری ۳۲ء میں دس لاکھ تک پہنچ گئی۔ گویا دس لاکھ سامعین مہیا ہونے میں سات برس لگے۔ بعد ازاں رفتار ترقی بہت تیز رہی۔ تین برس میں یعنی اپریل ۳۵ء تک بیس لاکھ سامعین ہو گئے تھے اور اب تیس لاکھ ہیں۔

پروگرام ہر ملک میں ریڈیو کے سامعین کے لئے پروگرام مرتب کرنا مشکل کام ہوتا ہے۔ مگر جاپان میں خاص مشکلات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے کیونکہ یہاں مغربی و مشرقی دونوں تہذیبوں کا دور دورہ ہے اور ہر مذاق کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اسی وجہ سے یہاں کے پروگرام میں بہت تنوع ہوتا ہے۔ جو شاید دوسرے ملکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ کارپوریشن کو اس امر کی خاص احتیاط کرنی پڑتی ہے کہ کسی فرد واحد کا یا کسی پبلک ادارے کا اشتہار یا پروپیگنڈا پروگرام میں ہرگز جگہ نہ پا سکے۔

دیگر ممالک میں ریڈیو کو زیادہ تر آلۂ تفریح سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہاں کے لوگ اسے بیشتر حصول علم اور عام معلومات بڑھانے کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ کارپوریشن کا فرض ہے کہ اہل ملک کے علم و تمدن کا معیار بلند کرے۔ پروگرام کے تفریحی حصے میں بھی لحاظ رکھا جاتا ہے کہ عوام الناس کا مذاق بلند کیا جائے۔ اسی غرض سے براڈکاسٹ کرنے والوں کا انتخاب بڑی چھان بین سے کیا جاتا ہے۔ صرف انہی لوگوں کو موقع دیا جاتا ہے جن کی علمی قابلیت مستند ہو اور اخلاقی پایہ بلند ہو۔ پروگرام کی پالیسی یہ ہے کہ اہل ملک کی روزانہ زندگی کی اس طرح رہنمائی کی جائے کہ لوگوں کی عقل میں اضافہ ہو اور ان کے جذبات کی تربیت ہو تاکہ قومی معاشرت مالا مال ہو جائے۔

روزانہ پروگرام کے دو اجزا ہوتے ہیں۔ ایک قومی دوسرا مقامی۔ قومی پروگرام سامعین کی اکثر تعداد کے لئے مرتب کیا جاتا ہے۔ اور ایک مرکزی اسٹیشن سے نافذ کر کے بقیہ تیس اسٹیشنوں تک پہنچا دیا جاتا ہے ۳۶ء کے سال بھر کے پروگراموں کے حساب سے قومی پروگرام کا اوسط نکالا جائے تو ۸۵ فیصدی بیٹھتا ہے جس سے اس کی اہمیت ظاہر ہے اسی وجہ سے قومی پروگرام مرتب کرنے میں خاص احتیاط برتی جاتی ہے اور پوری توجہ سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ کام ایک خاص مجلس کے تفویض ہے جس کے اراکین میں کارپوریشن کے اعلیٰ عہدیداروں کے علاوہ باہر سے مختلف فنون کے ماہرین شامل کئے جاتے ہیں۔ یہ مجلس صدر کارپوریشن

کی صدارت میں ہر مہینے جلسہ کرتی ہے اور ماہ آئندہ کا پروگرام مرتب کرتی ہے۔ مقامی مرکزی اسٹیشنوں سے جو تجاویز وصول ہوتی رہتی ہیں۔ ان میں سے بھی مناسب اجزا چُن کر پروگرام میں شامل کر لیتی ہے۔

مقامی پروگرام کی ترتیب ہر مقامی اسٹیشن کے ڈائرکٹر کے اختیار میں ہے جو مقامی حالات اور رسم و رواج کا لحاظ کر کے پروگرام بناتا ہے

قومی پروگرام میں جو جزو تعلیم کے لئے مخصوص ہے اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے کئی حصے ہیں۔ ایک حصے کا مقصد عام سوسائٹی کا علمی معیار بلند کرنا ہے۔ دوسرا حصہ ان نوجوانوں کے استفادے کے لئے ہے جو ابتدائی تعلیم ختم کر کے کسی کارخانے میں یا کہیں اور ملازم ہو جاتے ہیں۔ تیسرا حصہ بچوں کے لئے ہے۔ چوتھا حصہ ابتدائی مدارس کے طلبہ کے لئے ہے۔ پانچواں حصہ ابتدائی مدارس کے مدرسین کے لئے ہے۔ چھٹا حصہ عورتوں کی معلومات بڑھانے کے لئے ہے۔

اوقات۔ سال میں سات مہینے یکم اپریل سے ۳۱ اکتوبر تک پروگرام کی ابتدا صبح چھ بجے سے ہوتی ہے اور بقیہ پانچ مہینے ساڑھے چھ بجے سے۔ رات کا آخری اعلان نو بج کر پچاس منٹ پر کیا جاتا ہے۔ ہر براڈکاسٹنگ اسٹیشن میں روزانہ پروگرام کی مدت مقامی حالات پر منحصر ہوتی ہے۔ مگر روزانہ اوسط دس گھنٹے ہے۔

سال بھر کے پروگرام کے اوقات کے مطالعے سے بعض دلچسپ اعداد فراہم ہوئے ہیں جو ذیل کے نقشے میں درج ہیں۔ اس نقشے میں ہر مد کا سال بھر کا وقت جمع کر کے اس کا مقابلہ جملہ پروگرام کے وقت سے کیا گیا ہے۔ یہ نقشہ سات بڑے بڑے اسٹیشنوں کے سنہ ۳۶ء کے اعداد سے مرتب کیا گیا ہے۔

شمار	مد پروگرام	نسبت پروگرام فیصدی
۱	اطلاعات	۲۵
۲	تقاریر و اسباق	۲۶
۳	بچوں کا وقت	۴
۴	مدارس کے لئے	۴
۵	بین الاقوامی	۱
۶	بیرونی براڈکاسٹنگ	۱۲
۷	موسیقی	۱۰
۸	تفریحی	۸
۹	متفرق	۱۰
	میزان	۱۰۰

اطلاعات اس مد میں کئی قسم کے اعلانات شامل ہیں۔ مثلاً عام خبریں، موسم کا تخمینہ، بازار کی رپورٹ، اشیا کا بھاؤ، صنعتی خبریں، حکومت کے اعلانات، وقت کا اعلان، اسٹیشن کے اعلانات، وغیرہ۔ ان سب میں عام خبروں کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ صحت، جامعیت اور زود رفتاری کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مشکلات کے وقت کارپوریشن کی خدمات سے ملک میں امن و امان قائم رکھنے میں بڑی مدد ملی ہے۔

قومی پروگرام کی خبریں ٹوکیو کے اسٹیشن سے دن میں چار وقت یعنی دوپہر کو، سہ پہر کو، شام کو اور رات کو مشتہر کی جاتی ہیں۔ انہی کے سلسلے میں ہر مقامی اسٹیشن مقامی خبروں کا اعلان چار مرتبہ کرتا ہے شام کے وقت پانچ منٹ تک انگریزی میں خبریں سنائی جاتی ہیں تاکہ جو جاپانی نوجوان انگریزی بولنا سیکھ رہے ہیں وہ اس سے فائدہ اٹھائیں اور غیر ملکی باشندے بھی مستفید ہو سکیں۔

روزانہ شام کو ہر مقامی اسٹیشن روزگار ایجنسی کے اعلانات آدھ گھنٹے تک سناتا ہے۔ یہ اعلانات ہر مقام کی پبلک اور خانگی ایجنسیاں فراہم کرتی ہیں کہ روزگار کے کون کون سے میدان کھلے ہوئے ہیں۔ اس ذریعہ سے بے روزگاروں کو تلاشِ معاش میں بہت مدد ملتی ہے۔

تعلیمی پروگرام۔ جاپانی من حیث القوم نہایت علم دوست ہیں۔ ان کی علم پروری کا اندازہ اخبارات، رسالہ جات اور کتب کی تعداد سے ہو سکتا ہے۔ جو ہر سال جاپان میں شائع ہوتی ہیں۔ اشاعت کتب کی تعداد کے لحاظ سے جاپان کا درجہ انگلستان اور امریکہ سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ ٹوکیو کے ہر بازار میں مستعمل کتب کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ جمبو چو بازار میں کم از کم پچاس دکانیں صرف مستعمل کتب کی موجود ہیں جن میں ہر وقت گاہکوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ میلوں میں بھی پرانی کتابوں کی دکانیں نظر آتی ہیں۔ بڑوں کے ساتھ بچے بھی کتابوں کی جانچ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

جاپان کے براڈکاسٹنگ پروگرام میں بھی علمی شوق غالب ہے۔ دیگر اقوام کے پروگرام سے مقابلہ کیا جائے تو جاپانیوں کی علمی پیاس سب سے بڑھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس بارے میں جاپانی دنیا میں سب سے افضل ہیں۔ ذیل کے نقشے میں تقاریر و اطلاعات الگ الگ درج کی گئی ہیں۔ اطلاعات کے ضمن میں روما اور پیرس ٹوکیو کے لگ بھگ ہیں۔ مگر تقاریر کے ضمن میں کوئی قوم ٹوکیو کا پاسنگ بھی نہیں۔ اس نقشے میں

تمام اسٹیشنوں کا سال بھر کا وقت مدار جمع کر کے جملہ پروگرام کی میزان کے مقابلے میں فی صدی ظاہر کیا گیا ہے۔

اسٹیشن	موسیقی	تفریحات	تقاریر	اطلاعات	متفرق	میزان
ٹوکیو	۱۳	۱۲	۲۷	۳۲	۱۶	۱۰۰
لندن	۶۹	۳	۵	۱۷	۶	۱۰۰
نیویارک	۶۵	۱۳	۷	۷	۸	۱۰۰
برلن	۷۳	۳	۱۰	۱۱	۳	۱۰۰
پیرس	۳۸	۱۰	۶	۳۱	۱۵	۱۰۰
رُوما	۴۱	۳	۱	۳۱	۲۴	۱۰۰

بچوں کے لئے۔ عام طور سے تعلیم دینے کے تین طریقے ہیں۔ گھر میں، مدرسے میں، اور سوسائٹی میں۔ گھر سے تعلیم شروع ہوتی ہے اور آئندہ تعلیم کا انحصار اسی پر ہوتا ہے۔ یہیں بچوں کی دماغی اور جسمانی نشوونما اور تربیت پر خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ آگے چل کر مدرسے میں باقاعدہ تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے جو ہر قسم کی تعلیم کی مستحکم بنیاد ہوتی ہے۔ سوشل تعلیم کا مقصد پبلک کے مذاق کی تہذیب ہوتا ہے اور یہ خانگی اور مدرسے کی تعلیم کا ضمیمہ ہوتی ہے۔

جاپان میں ہمیشہ سے بچوں کی خانگی تعلیم و تربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ زمانہ حال میں یہ فریضہ نہ تو باپ پوری تندہی سے ادا کر سکتا ہے اور نہ ماں۔ اس کی وجہ تو یہ ہے کہ کثرت کار کی وجہ سے دونو کو اتنی فرصت ہی نہیں ملتی کہ بچوں کو کماحقہٗ تعلیم دے سکیں۔ دوم کبھی کبھی خود ماں باپ کی ناقص تعلیم و تربیت بھی حائل ہو جاتی ہے۔ ان نقائص کو دور کرنے کے لئے کوئی تدارک بیرونِ خانہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کئی سہولتیں مہیا بھی ہیں مثلاً کنڈرگارٹن مدارس، دارالاطفال، انجمن ہائے مادران، مجالس نسواں، اور کتابیں سنانے کے ادارے۔ مگر ان کا دائرۂ عمل محدود ہے۔ پبلک کا ایک نہایت قلیل حصہ ہی ان سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے۔

خانگی تعلیم کی اس کمی کو یہاں ریڈیو سے پورا کیا جاتا ہے اور بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔ ایک جانب بچوں کی دماغی نشوونما اور ان کے جذبات کی تربیت کے لئے کہانیاں، گیت اور دوسری دلچسپ چیزیں براڈ کاسٹ کی جاتی ہیں۔ دوسری جانب والدین کے استفادے کے لئے اور خصوصاً ماؤں کے لئے تقریریں سنائی جاتی ہیں جن میں بچوں کو پالنے اور تربیت کرنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ ان کی بری عادتیں چھڑانے اور نیک عادتیں ڈالنے کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ روزانہ دو ایک مرتبہ ایسی تقریریں ہوتی ہیں۔ بعض تقریریں مشکل ہوتی ہیں۔ انہیں پہلے سے ہی چھپوا کر تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ کہ سامعین پڑھ کر مشکلات حل کر سکیں۔

بچوں کے لئے روزانہ آدھ گھنٹہ مقرر ہے۔ اسی میں پانچ منٹ بچوں کا اخبار سنایا جاتا ہے۔ جو مدات بچوں میں نہایت مقبول ثابت ہوئی ہیں وہ کہانیاں، موسیقی اور ڈرامہ ہیں۔ جاپان میں داستان گوئی کا فن زندہ ہے۔ بچوں کے داستان گو بھی ہوتے ہیں۔ براڈ کاسٹنگ کارپوریشن نے تیس مشہور داستان گویوں کی انجمن اپنی امداد کے لئے بنا رکھی ہے جو بچوں کی کہانیوں کی تحقیق کر کے ریڈیو کے لئے تجویز کرتی ہے۔

روزانہ پروگرام کے علاوہ مہینے میں ایک مرتبہ بچوں کی شام منائی جاتی ہے۔ اس کا پروگرام باری باری سے ٹوکیو اور اوساکا کے مرکز مقرر کرتے ہیں جس کی میعاد تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہوتی ہے۔

طلباء کے لئے۔ مدارس کی غایت یہ ہوتی ہے کہ مدرسے کے اندر ہی تعلیم مکمل کر دی جائے۔ مگر عملاً تکمیل کے لئے بیرونی امداد کی ضرورت واقع ہوتی ہے خصوصاً ابتدائی مدارس میں جہاں مدرسین کی قابلیت عموماً محدود ہوتی ہے اور آلات تعلیم کم و بیش ناقص۔ جن مدارس میں یہ دونوں مقررہ معیار پر پورے اُترتے ہیں۔ وہاں بھی بندھے ٹکے اسباق اور وہی پرانے اُستاد بچوں کے دل پر تعلیم کا پورا اثر پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ تعلیم میں تنوع اور تازگی پیدا کرنے کے کئی ذرائع ہیں جن میں ریڈیو بھی شامل ہے۔

مدارس کی براڈ کاسٹنگ کے کئی مقاصد ہیں۔ اول یہ کہ ان کے تعلیمی نقائص کو پورا کیا جائے کیونکہ ہر مدرسے میں بہترین استاد اور بہترین سامان فراہم کرنا ناممکن ہے بلکہ بہترین مدرسین کے لئے بھی ناممکن ہے کہ تمام تعلیمی مواد پوری طرح ہضم کر کے کامل طور سے بچوں کے ذہن میں اُتار دیں۔

دوم یہ کہ بچوں کی روزانہ زندگی کی تربیت کی جائے کیونکہ مدرسے کا صرف یہ مقصد نہیں ہے کہ بچوں کو علم سے آراستہ کر دیا جائے بلکہ یہ بھی ہے کہ اُن کے مذاق کی تربیت کی جائے اور سوسائٹی کے ساتھ ساتھ ترقی کرنے کا اہل بنا دیا جائے۔

سوئم یہ کہ ٹکسالی قومی زبان کی اشاعت کی جائے۔ جاپان کی خوش قسمتی ہے کہ یہاں ایک ہی قوم آباد ہے اور ایک ہی زبان بولتی ہے۔ پھر بھی مقامی اثرات سے زبان کی کئی شاخیں پیدا ہو گئی ہیں اور لہجے تلفظ اور محاورے میں جگہ جگہ فرق ہے۔ ریڈیو کے ذریعے سے یہ فرق دور کر کے یکسانیت پیدا

کی جارہی ہے۔

چہارم یہ کہ نشر تمدن کا فائدہ جاپان کے ہر بچے کو پہنچایا جائے۔ یہاں فی الوقت ایک کروڑ تیس لاکھ خاندان ہیں اور کنڈر گارٹن و پرائمری تعلیم کی عمر کے بچوں کی تعداد بھی ایک کروڑ تیس لاکھ ہے۔ گویا ہر خاندان میں ایک بچہ ہے مگر تمام جاپان میں صرف تیس لاکھ گھروں میں ریڈیو ہے۔ یعنی تیس لاکھ بچے تو ریڈیو سے مستفید ہوتے ہیں مگر ایک کروڑ بچے محروم رہتے ہیں۔ مدارس میں ریڈیو کے قیام سے بقیہ بچوں کو بھی مستفید کرنا مقصود ہے۔

درسی براڈکاسٹنگ کی تین قسمیں ہیں۔ اول پرائمری مدارس کے طلبہ کے لئے، دوم پرائمری مدارس کے مدرسین کے لئے۔ سوم مدارس الجوانان کے لئے۔ پرائمری طلبہ کے کئی حصے ہیں۔ ایک حصہ تمام طلبہ کے لئے عام ہے۔ جس میں ورزش، کہانی اور موسیقی شامل ہے۔ روزانہ صبح کو مدرسہ کھلنے سے پہلے تمام طلبہ میدان میں جمع ہوتے ہیں اور دس منٹ تک ریڈیو کے مطابق ڈرل کرتے ہیں۔ مہینے میں دو مرتبہ کوئی مشہور آدمی کہانی سناتا ہے۔ روزانہ دوپہر کو آدھ گھنٹے موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ہر جماعت کے لئے استعداد کے مطابق جماعت وار پروگرام ہوتا ہے چھوٹے بچوں کے لئے گانے اور اخلاقی کہانیاں ہوتی ہیں۔ پھر اوپر کی جماعتوں میں جیسے جیسے سائنس، جغرافیہ اور تاریخ کے مضامین آتے ہیں ویسے ہی کہانیوں میں ان کا مواد شامل کر دیا جاتا ہے۔ بالائے پرائمری جماعتوں میں پیشوں کے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہے اور ان کی بابت مشورہ دیا جاتا ہے۔ اس امر کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے کہ جو سبق طلبا پڑھ رہے ہیں انہی کے متعلق براڈکاسٹنگ ہوتی ہے۔ جاپان میں اس کا انتظام آسان ہے۔ یہاں پرائمری مدارس میں صرف محکمہ تعلیم کی شائع کردہ کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ دیگر مصنفین کی کتابیں پڑھانی ممنوع ہیں۔ اس وجہ سے تمام جاپان میں ایک وقت میں ایک ہی سبق پڑھایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق براڈکاسٹ کرنے میں بڑی سہولت ہوتی ہے۔

درسی کتب کے متعلقہ براڈکاسٹ کے علاوہ قومی تقریبوں اور قابلِ یادگار واقعات کے متعلق بھی براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔ نیز اعلیٰ پرائمری جماعتوں کے طلبہ اور طالبات ہر مہینے اپنی کوئی تحریر پڑھتی ہیں یا کوئی نظم سناتی ہیں۔ سات مرکزی اسٹیشنوں سے ایک ایک بچے کو براڈکاسٹ کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔

مدرسین کے لئے۔ پرائمری مدارس کے جملہ ڈھائی لاکھ مدرسین کے استفادے کے لئے ہفتے میں تین مرتبہ براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔ ایک دن تعلیمی نظریوں پر بحث ہوتی ہے۔ دوسرے دن تعلیمی حقائق پر تقریر ہوتی ہے اور تیسرے دن ان کی عام معلومات بڑھانے اور مذاق میں نفاست پیدا کرنے پر تقریر ہوتی ہے۔

جوانوں کے مدارس کے لئے۔ بہت سے لڑکے پرائمری تعلیم ختم کر کے پرائمری کے بعد دو سال تعلیم حاصل کر کے کوئی پیشہ اختیار کر لیتے ہیں۔ اور عموماً کسی کارخانے میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ ان کی عام تعلیمی استعداد کے اضافے کے لئے اور خصوصاً ان کے پیشے کی معلومات بڑھانے کے لئے شبینہ مدارس قائم ہیں جو پرائمری مدارس کی عمارتوں میں منعقد ہوتے ہیں۔ ان کی تعلیم اس قدر مقبول ہے کہ جاپان میں اس قسم کے بیس ہزار شبینہ مدارس موجود ہیں۔ جن میں پچیس لاکھ طلبہ مزدوری سے فراغت پا کر روزانہ شام کو تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان کے استفادے کے لئے روزانہ رات کو آدھ گھنٹے تک براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔ یہ اس قدر مقبول ہوا ہے کہ شبینہ مدارس کے علاوہ انجمن ہائے نوجوانان، انجمن ہائے امداد باہمی اور انجمن ہائے صنعت بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔

عورتوں کے لئے۔ جاپان میں ریڈیو کی کثرت کی وجہ سے براڈکاسٹنگ کارپوریشن کو سامعین کی عملی زندگی سے تعلق پیدا کرنے میں بڑی سہولت ہو گئی ہے۔ وہ خانگی زندگی کا معیار بلند کرنے کی اور اس میں شائستگی اور نفاست پیدا کرنے کی اور علمی تحقیقات کی رو سے اسے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ خانگی علوم کے سلسلے میں لباس کی سائنس، خوراک کی سائنس اور مکان کی سائنس پر تقریریں ہوتی ہیں۔ خانگی نباتات کے سلسلے میں پھولوں پھلوں اور ترکاریوں پر بحث کی جاتی ہے۔ حفظانِ صحت اور تیمارداری پر لکچر دیئے جاتے ہیں۔ گھر کے آمد و خرچ میں توازن کے طریقے بتائے جاتے ہیں۔ کھانا پکانے کی ترکیب، کپڑے دھونے اور رنگنے کی ترکیب، ہر موسم کی حفاظتی تدابیر اور موسمی کھانے اور اچار چٹنیاں، سامان خانہ داری کا علم اور اس کا استعمال، مہمان کا استقبال اور اس کی تواضع، گھر میں اور گھر کے باہر اپنوں اور غیروں سے برتاؤ، شادی اور اس کے متعلقات پر طبی قانونی اور اقتصادی پہلوؤں سے تبصرہ، غرضکہ ہر بات جو عورت کے لئے مفید ہو سکتی ہے اس سے اسے آگاہ کیا جاتا ہے۔ مگر ہر معاملے میں صرف ماہرین فن کی رائے پیش کی جاتی ہے۔ اکثر موضوعوں پر تقریر کا سلسلہ کئی کئی دن چلتا ہے۔ عام طور سے مضمون کے دس حصے کر کے اسے ایک مہینے

کے اندر اندر ختم کر دیا جاتا ہے۔ تمدّن کے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا جاتا ہے کہ عورتوں میں غور و خوض کا مادہ ترقی کرے اور اُن کے مذاق میں نفاست پیدا ہو۔

عمومی مضامین کے علاوہ وقتی مضامین پر بھی بحث کی جاتی ہے۔ مثلاً پارلیمنٹ میں بچوّں اور ماؤں کی حفاظت کا قانون پیش ہُوا تو ریڈیو میں اس موضوع پر بحث کی گئی۔ ایک مرتبہ ایک عورت نے بہت قبیح جرم کیا تو عورت اور جرم کے موضوع پر تقریر کی گئی۔ کوئی وبائی مرض نمودار ہو تو اس کی بابت حفاظتی تدابیر پر معلومات پیش کی جاتی ہیں۔ غیر ممالک سے مشہور خواتین جاپان میں آتی ہیں۔ تو ان سے ریڈیو پر تقریریں کرائی جاتی ہیں۔ کسی نہ کسی مشہور جاپانی خاتون سے ہر مہینے اس کے مقصدِ زندگی اور اس کے خیالات پر تقریر کرائی جاتی ہے۔

ماؤں کے لئے ہر قسم کی مفید معلومات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ استقرارِ حمل سے لے کر وضعِ حمل تک ہر قسم کی احتیاطی تدابیر اور روزانہ زندگی بسر کرنے کا طریقہ، ایامِ رضاعت میں دودھ پلانے کپڑے پہنانے اور نہلانے کی بابت ہدایات، پھر بچپن میں مدرسے جانے تک بچے کی دماغی اور جسمانی نشو و نما کی نگرانی، اُسے بیماری سے محفوظ رکھنے کی تدابیر اور بیماری میں تیمارداری، اُس کے اخلاق کی تربیت اور اُسے اوقات کا پابند بنانا۔ ان تمام موضوعات پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی جاتی ہے۔ مگر صرف ماہرین کی تقریریں ہوتی ہیں۔ ان میں ماہرینِ فنِ تعلیم، محققینِ روحانیات، مشہور ڈاکٹر، بچوں کے محققین اور مشہور تجربہ کار اشخاص شامل ہیں۔

باورچی خانے پر خاص طور سے توجہ کی جاتی ہے۔ اول تو ہر مہینے محکمہ غذا کی تحقیقات کی رُو سے جن اشیاء میں اچھی غذائیت ثابت ہوتی ہے ان کا حال وقتاً فوقتاً سنایا جاتا ہے۔ پھر صبح شام کا کھانا پکانے کی ترکیب روزانہ بتائی جاتی ہے پہلے مینو بتایا جاتا ہے پھر کھانے کا نسخہ اور تیار کرنے کی ترکیب۔ ترکیب میں یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ غذا کے مفید اجزا ضائع نہ ہونے پائیں اور ہر شے سے پورا فائدہ حاصل کیا جائے۔ ان باتوں میں تین امور کا خاص طور سے لحاظ رکھا جاتا ہے۔ اول کفایت، دوئم وقت کی بچت اور سوئم محنت کی کمی۔ روزانہ مینو میں گوشت مچھلی ترکاری اور دیگر اشیاء ایسی ہی تجویز کی جاتی ہیں جو ہر جگہ آسانی سے اور سستی مل سکتی ہیں۔ باورچی خانے کا پروگرام عورتوں میں بہت مقبول ہے۔

شہریوں اور دیہاتیوں کی تعلیم۔ تعلیمی پروگرام میں شہری حقوق اور ذمہ واریوں کی تعلیم بھی شامل ہے۔ ضابطہ حکومت اور قانون، پارلیمنٹ اور حقوق رائے دہندگی اور انتخابات، میونسپلٹی اور پبلک، نوجوانوں کی انجمنیں، مالیات کے مختلف ادارے مثلاً بنک وغیرہ، مزدور اور مزدوروں کی بین الاقوامی کانفرنس، بین الاقوامی عدالت، سیاسیات، اقتصادیات، قانون وغیرہ بہت سے موضوعات پر تقریریں کی جاتی ہیں کہ پبلک کی معلومات کا دائرہ وسیع ہو اور شہری و قومی و بین الاقوامی معاملات میں اپنی ذمہ داری کا احساس پیدا ہو کر ان میں حصہ لینے کی قابلیت پیدا ہو جائے۔

اسی طرح دیہاتی معاملات میں دیہاتیوں کی دلچسپی اور فائدے کے کاموں پر تقریریں کی جاتی ہیں۔ ان میں کسانوں کے ایام کاشت کے اور ایام فرصت کے مشاغل سے بحث کی جاتی ہے۔ موسمی لکچر بھی ہوتے ہیں اور متفرق امور بھی۔ کاشتکاری کی سائنس اور ہر شے کی کاشت کے جدید طریقے فرصت کے ایام کی چھوٹی موٹی صنعتیں، ریشم کے کیڑے کی کاشت اور بہترین ریشم حاصل کرنے کا طریقہ، گاؤں کے نوجوانوں کی انجمنیں، دیہاتی پیداوار کی بازار میں قیمت، پھلوں اور ترکاریوں کی کاشت جدید اصولوں پر، دیہات کی تفریحات یہ اور اسی قسم کے بہت سے موضوع ہیں جن پر بحث کر کے دیہاتی آبادی کو فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔

غیر زبانیں۔ غیر زبانیں سیکھنے کے لئے بھی پروگرام میں انتظام کیا جاتا ہے سب سے زیادہ وقت انگریزی کو دیا جاتا ہے۔ جرمن اور فرانسیسی زبانیں باری باری سے سکھائی جاتی ہے۔ ان کے بعد چینی کو اور اسپینی زبانوں پر توجہ کی جاتی ہے انگریزی زبان کے دو کورس ہیں۔ ایک ابتدائی دوسرا اعلیٰ ابتدائی کورس کا پروگرام ہفتے میں تین دن ہوتا ہے۔ بقیہ تین دن ایک سال جرمن کو دیئے جاتے ہیں اور دوسرے سال فرانسیسی کو انگریزی زبان کی مقبولیت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ کورس کی کتابیں ایک وقت میں چالیس ہزار تک شائع کی جاتی ہیں۔ اعلیٰ کورس سے ہائی اسکول کے طلباء و مدرسین، دیگر مدرسین و طلباء، ملازمت پیشہ اصحاب، سپاہی اور انجینئر وغیرہ بھی مستفید ہوتے ہیں۔

بیرونی براڈ کاسٹنگ۔ چند سال سے کارپوریشن نے اسٹوڈیو کے باہر سے بھی براڈ کاسٹنگ کا انتظام کیا ہے۔ جب کبھی کوئی قومی تقریب منائی جاتی ہے یا شہر یا دیہات میں کوئی عجیب رسم ادا کی جاتی ہے تو وہیں سے چشم دید حالات سنائے جاتے ہیں۔ نیز جنگل سے پرندوں کی بولیاں سنائی

جاتی ہیں۔ اس پروگرام میں کھیلوں کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ بیس بال کے میچ اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے حالات بڑے شوق سے سُنے جاتے ہیں۔ یہی حال تیراکی، رگبی، فٹ بال، جوڈو اور جاپانی پہلوانی کا ہے۔ سنہ ۳۶ء میں برلن میں اولمپک کھیلوں کے موقع پر سولہ مرتبہ وہاں سے براڈکاسٹ پہنچا اور تمام قوم نے بڑی توجہ سے سنا۔

ریڈیو کی ورزش ۔دس سال ہوئے کہ کارپوریشن نے دیگر ممالک کی طرح ریڈیو کی ورزش پروگرام میں شامل کرکے اس کا انتظام کیا۔ اس مدت میں اس تحریک نے ملک میں اس قدر قبولیت حاصل کر لی ہے کہ اب یہ اہل جاپان کی ایک خصوصیت بن گئی ہے۔ ورزش دو طرح کی ہوتی ہے۔ پہلی قسم میں جسم کے مختلف حصص حرکت میں آتے ہیں اور یہ اس قدر سہل ہوتی ہے کہ بوڑھے بچے مرد عورتیں سب کر سکتے ہیں۔ دوسری قسم میں مشکل مشقیں ہوتی ہیں۔ یہ اُن لوگوں کے لئے مفید ہوتی ہیں جو اپنا بدن بنانا چاہتے ہیں۔

پبلک کے لئے روزانہ صبح کو دو مرتبہ ورزش کا براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔ پہلے چھ بجے اور پھر سوا سات بجے۔ دونو وقت بیس بیس منٹ کا پروگرام ہوتا ہے۔ پرائمری مدارس کے طلبا کے لئے پونے آٹھ بجے براڈکاسٹ کیا جاتا ہے۔ ورزش کو دلچسپ بنانے کے لئے ساتھ ساتھ پیانو بجایا جاتا ہے براڈکاسٹنگ کا کام دس سال سے ایک صاحب ایگی نامی کر رہے ہیں۔ انہوں نے پابندیٔ وقت کا ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے کہ دوسرے کے لئے تقلید کرنی مشکل ہے۔ آج تک کبھی ایک دن ناغہ نہیں کیا اور کبھی ایک منٹ کی دیر نہیں ہوئی۔ ایسی اونچی اور زوردار کڑاکے کی آواز ہے کہ خواہ مخواہ اس آواز پر ورزش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ گھر والے موسیقی کی آواز سنتے ہی تیار ہو جاتے ہیں اور ایگی صاحب کے احکام پر ورزش کرنے لگتے ہیں کارپوریشن کی جانب سے ورزش کے نقشے مفت تقسیم کئے جاتے ہیں ہر سال ان کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ اسی سے قبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس پروگرام کے مطابق گھروں کے علاوہ کارخانوں میں، کانوں میں، دکانوں میں، حکومت کے دفاتر میں، جیل خانوں میں، شفاخانوں میں اور جگہ جگہ ورزش کی جاتی ہے۔

تمام جاپان کو ریڈیو پر ورزش کرتے دیکھنا ہو تو اس کے لئے اگست کا مہینہ مخصوص ہے۔ پہلی بار اگست سنہ ۳۱ء میں کھُلے میدان میں ورزش کرنے کا تجربہ کیا گیا۔ ایک مہینے کا پروگرام تھا۔ ٹوکیو اور مضافات میں اس قدر کامیابی ہوئی کہ تین سو مقامات پر لوگ ورزش کرنے جمع ہوتے تھے۔ ایک مہینہ میں پینتیس لاکھ آدمیوں نے اس انتظام سے فائدہ اُٹھایا۔ اس کامیابی کو دیکھ کر دوسرے سال تمام جاپان میں کھُلے میدانوں میں ورزش کرنے کا انتظام کیا گیا اور جب سے برابر جاری ہے۔

ٹوکیو اور مضافات میں ۲۱ جولائی سے ۲۰ اگست تک ایک مہینے کا پروگرام ہوتا ہے۔ مگر دوسرے اضلاع میں عموماً اگست کے بیس دن انتظام رہتا ہے۔ ورزش کے لئے پرائمری مدارس، ثانوی مدارس، مندر، درگاہ، دفتر میونسپلٹی وغیرہ کے میدانوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ بوڑھے بچے مرد عورتیں لڑکے لڑکیاں سب قطاروں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کہ مائیں ننھے بچوں کو پیٹھ پر باندھے ہوئے بھی آموجود ہوتی ہیں۔ پچھلے سال تمام جاپان میں دس ہزار میدانوں میں ورزش ہوئی اور کل موسم میں دس کروڑ اشخاص شریک ہوئے۔

نورالحسن برلاس

شرابی

سکوتِ شب ہے کنارِ دریا ہے چاندنی کا حسیں سماں ہے
رموزِ فطرت کی بیکلی روئے بزمِ آفاق سے عیاں ہے

حیات کے غم سے مضطرب ہو کے آبِ گلفام پی رہا ہوں
وہ لطف پینے میں آ رہا ہے کہ جام پر جام پی رہا ہوں

نشے کی موجوں میں ہو کے گم عمر کے سفینے کو کھے رہا ہوں
نظامِ دورِ جہاں سے ہٹ کر حیات کے سانس لے رہا ہوں

فسردگیِ حیات رنگیں نشے کے سانچے میں ڈھل رہی ہے
لہو کی موجیں ہیں یا مسرّت کی رَو رگوں میں مچل رہی ہے

وہ عالمِ بے خودی ہے دل آشنائے سوزِ نہاں نہیں ہے
فریبِ سود و زیاں نہیں ہے، طلسمِ وہم و گماں نہیں ہے

وہ بے کلی ہے کہ روح نے چاک کر دیا ہے نقابِ ہستی
وہ بے خودی ہے کہ اٹھ رہے ہیں دل و نظر سے حجابِ ہستی

نشے میں پرواز کر رہا ہوں حدودِ کون و مکاں سے آگے
مقام کچھ اور بھی توجہ نواز ہیں آسماں سے آگے

اجل کے اسرار کھل رہے ہیں رموزِ ہستی بکھر رہے ہیں
نئے معانی ابھر رہے ہیں، نئے مطالب نکھر رہے ہیں

وہ دَور ہے گردشِ جہاں کا نظام قدموں پہ جھک رہا ہے
مری نگاہوں کی تیز گامی سے وقت کا گام رک رہا ہے

دراز و دشوار تر مراحل لطیف و آسان ہو رہے ہیں
مری رسائی کو دیکھ کر حادثات حیران ہو رہے ہیں

میں اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی حدّ پہ راز بن گیا ہوں
یہ راز بینی کی انتہا ہے کہ خود بھی اک راز بن گیا ہوں!

باقی صدّیقی

یہ بھی ..... وہ بھی

بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ دادر سے کلبا دیوی ٹریم میں بیٹھ کر جائیں تو دونوں طرف چار منزلہ مکانوں کے فلیٹس نظر آتے ہیں۔ ہر ایک فلیٹ کے باہر ایک چھجا ہے۔ چھجوں کے جنگلوں پر جھکے ہوئے چہرے ہیں ۔ پیلے زرد چہرے ـــــ عورتیں، بچے، جوان، بوڑھے، یہ نیچے سڑک پر بہتے ہوئے زندگی کے طوفان کو غور سے دیکھا کرتے ہیں۔ ان کی سیر بھی یہی ہے سینما بھی یہی۔ ان کی دماغی خوراک بھی یہی ہے اور جسمانی بھی یہی۔ یہاں آپ کو سب قسم کے لوگ ملیں گے۔ مرہٹے، پنجابی، مدراسی، بنگالی۔ کمروں کے اندر آپ کو سنبھلے ہوئے برتنوں کی قطاریں بھی نظر آئیں گی اور دو ایک چارپائیاں بھی۔ بمبئی میں غریبوں کے پاس ایک سے زیادہ کمرے ہونا گناہ سمجھا جاتا ہے۔ اُن سے یہ پوچھنا کہ اُن کے مکان میں کمرے کتنے ہیں اُنہیں بھی شرمسار کرنا ہے اور اپنی بھی ناواقفیت کا اظہار کرنا۔ مگر دادر اور کلبا دیوی کے درمیان، درمیانی طبقے کے لوگ رہتے ہیں۔ اس لئے اُن کے پاس دو دو کمروں والے فلیٹ ہیں۔ انہیں فلیٹوں میں سے پچھلے اتوار ایک نوجوان سڑک پر گر پڑا تھا۔ وہ مرا نہیں۔ چوٹیں کافی آئی ہیں۔ اب ہسپتال میں ہے۔ لوگوں نے اس واقعے کی مختلف توجیہات شروع کر دی ہیں۔ اُس کا سر چکرا گیا تھا، اُسے کسی لڑکی سے محبت تھی، اُس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی اصل بات کسی کو معلوم نہیں۔ اس کہانی کے لکھنے والے کو بھی نہیں معلوم۔ لیکن ممکن ہے کہ اِس واقعہ کا اُسی اتوار کی صبح کی باتوں سے کچھ تعلق ہو۔

اُس صبح بھی حسبِ معمول کیشو راؤ آپٹے کی آنکھ چھ بجے کھُلی تھی۔ نیند کے خمار کو دُور کرنے کے لئے اُس نے دو تین کروٹیں لیں۔ پھر اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ حسبِ معمول اُس کا دل اپنے غیر یقینی مستقبل کے خیال سے ڈر رہا تھا۔ اُس نے اس سال آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان تیسری بار دیا تھا یہ اُس کا آخری موقعہ تھا۔ تین برس ہُوئے جب اُس نے ایم اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تھا۔ تب سے اب تک وہ چھ بار مقابلہ کے امتحانوں میں بیٹھ چکا تھا۔ پر ایک بار بھی اُس کی محنت، اُس کی قابلیت اور اُس کی قسمت نے اُس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ بمبئی پریذیڈنسی کی سول سروس کا امتحان دیتے وقت اُسے اپنی کامیابی کا پختہ یقین تھا۔ وہ تو پہلے ہی سے صوبہ بھر میں اپنی قابلیت کی وجہ سے ایک مانا ہوا طالب علم تھا۔ اُسے کوئی اُمیدوار ایسا نہیں دکھائی دیتا تھا جو اس سے بڑھ سکے۔ لیکن امتحان ہوُا۔ نتیجہ بھی نکلا۔ اور آپٹے کامیاب نہ ہوُا۔ پٹیل، جس کا کندذہنی کی وجہ سے ساری کلاس میں مذاق اُڑایا جاتا تھا، اوّل رہا۔ گوکھلے بھی یُونہی پاس ہو گیا۔ کالے جو اتنا خردماغ تھا کہ کیشو آپٹے نے اُس سے کبھی بات تک نہ کی تھی، انٹرویو کے بل پر آ گیا۔ اور مسلمان۔ اُس کے جتنے بھی دوست تھے یا تو ویسے ہی پاس ہو گئے یا انتخاب میں آ گئے۔ صرف اُسی کو سب جگہ ناکامیابی کا مُنہ دیکھنا پڑا۔ صوبے کی سول سروس میں فنانس کے امتحان میں، آئی۔ سی۔ ایس میں ہر بار کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہو جاتی۔ ایک بار تو وہ صرف دو نمبروں کی کمی کی وجہ سے کامیاب ہوتا ہوتا رہ گیا۔ ایک بار تاریخ نے، جسے وہ اپنا خاص مضمون سمجھتا تھا، اُسے دھوکا دیا۔ اور پچھلی بار تو وہ فقط انٹرویو کی وجہ سے پچھاڑا گیا۔ وہ کیشو آپٹے جس کو اپنی شخصیت پر ناز تھا، قابلیت پر فخر تھا، اپنے سپورٹس ریکارڈ پر گمان تھا، اپنے ممتحنوں پر اثر نہ ڈال سکا۔ اور اس بار اُس کا آخری موقعہ تھا۔ دو ماہ میں وہ پچیس سال کا ہو جائے گا۔ پھر سب سرکاری ملازمتوں کا دروازہ اُس کے لئے بند ہو جائے گا۔ خیر اس بار تو اُس کی کامیابی میں کوئی شک ہی نہیں۔ لیکن، لیکن ۔ ۔ یک بارگی کیشو کے جسم میں ایک ٹھنڈی سنسنی سی پھیل کر رہ گئی۔ وہ پھر لیٹ گیا۔ اور اُس نے چادر کو اپنے اُوپر کھینچ لیا۔ نہیں، یہ نہیں ہو گا۔ ابھی تو اُسے کامیابی کے بعد بہت کچھ کرنا ہے۔ کیشو فطرتاً باہمت ہے اُس کا دل اُمنگوں سے بھرا ہوا ہے مگر وہ اپنی اُمنگوں کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتا۔ وہ اُمنگ ہی کیا ہوئی جس کے پورا ہونے سے پہلے ہی لوگوں کو پتہ چل جائے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ چُپ چاپ کام کرنے والوں میں سے ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو، دنیا کو، یکبارگی ہی حیران و ششدر کر دینا چاہتا ہے اور اُس کے بارے میں لوگ چاہے کچھ ہی سمجھیں۔ لیکن اُسے اپنے پر پورا بھروسہ ہے کہ اُس کے لئے کوئی کام بھی

ناممکن نہیں ہے۔ موقعہ آنے پر وہ تیر کر سمندر بھی پار کر سکے گا۔ برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑ کی چوٹی پر بھی جا پہنچے گا۔ لوگوں کو کیا معلوم کہ کیشو کے دل میں کیا ہے۔ لوگ بیوقوف ہیں، اندھے ہیں۔ اُنہیں بیوقوف اور اندھا ہی بنا رہنے دو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کیشو میں قابلیت نہیں ہے، حوصلہ نہیں ہے۔ اُسے اپنے پر بھروسہ نہیں ہے۔ اُنہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ کیشو پڑھائی میں دل نہیں لگاتا، غور سے نہیں پڑھتا۔ بھلا محنت کا پھل بھی کبھی ضائع ہوا ہے۔ پچھلے سال آئی۔ سی۔ ایس کے امتحان کے نتیجہ کے بعد جب اُس کے ملنے والے اُس کی ڈھارس بندھانے آئے تھے۔ تو وہ بھی کچھ چبھتے ہوئے فقرے کہے بغیر نہ رہے تھے۔ یہ مقابلہ والے امتحان کوئی یونیورسٹی کے امتحان نہیں ہیں کہ چار درسی کتابیں پڑھیں۔ اور صوبہ بھر میں اوّل آ گئے۔ ان میں تو وہی پاس ہوتے ہیں جو دل لگا کر پڑھیں۔ ایسے امتحانوں کے لئے بہت وسیع علم چاہیئے۔ یہ مقابلہ والے امتحان کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہیں۔ کیشو، معاف کرنا، لیکن ان کے لئے خون پسینہ ایک کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے لڑکے وشو بندھو نے جب امتحان دیا تھا تو کئی کئی دن گھر سے باہر ہی نہیں نکلا کرتا تھا۔ کنڈی لگا کر چوبیس چوبیس گھنٹے پڑھنے میں مشغول رہتا۔ منتیں کر کے اُسے تھوڑا بہت کھانے پینے پر مجبور کیا کرتے تھے۔ نہیں تو اُسے کھانے پینے کی فرصت بھی کہاں تھی۔

کیشو کے دل میں ایک اُبال اُٹھ رہا تھا۔ لوگ اُسے سمجھتے ہی نہیں۔ خوب! خون پسینہ ایک کرنے کی ضرورت ہے! کیوں کوئی اُسے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا؟ یہ جو میرے چہرے کی رونق مفقود ہو گئی ہے یہ کس بات کی نشانی ہے۔ یہ جو میں ساری ساری رات جاگا کرتا ہوں۔ یہ کس بات کا آئینہ ہے۔ خیر۔ نہیں سمجھتے تو نہ سمجھیں۔ کیشو دانت پیسنے لگا۔ غصے سے اُس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اگلی بار سہی۔ وہ یونہی ذرا مسکرایا۔ کامیاب اُمیدواروں کی فہرست سب سے اُوپر میرا نام ہوگا۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہیگی۔ جو آج مجھے طعنے دے رہے ہیں۔ دل میں جل بھن جائیں گے۔ آدمی کی کامیابی دُور کے لوگوں کے لئے خوشی کا باعث ہوتی ہے نزدیکی رشتہ داروں کے لئے نہیں۔ لیکن اُوپر سے اُس کے سگے کہیں گے کیشو تم تو چھپے رستم نکلے۔ کیشو پہلے کچھ نہیں کہے گا۔ پھر ایک پھیکی سی مسکراہٹ مُنہ پر آئے گا اور بولے گا۔ یہ مقابلہ کے امتحان کسی کی لیاقت کا ثبوت نہیں ہیں۔ یہ تو قسمت کا کھیل ہے۔ ہماری جماعت میں ہی دیکھئے سب سے قابل لڑکے منموہن داترے اور منسکھ مراٹھے تھے لیکن پاس نہیں ہو سکے۔

کیشو کا سارا جسم خوشی سے کانپ اُٹھا۔ سردی کی ایک لہر سی آئی اور اُس نے چادر کھینچ کر اپنے سر کو بھی چھپا لیا۔ نتیجے کی نقل برج موہن کے ہاں بھی پہنچے گی۔ سُشما بھی پڑھے گی۔ سُشما! جب میں برج کے گھر افسوس کرنے جاؤں گا کہ بھائی یہ کیا ہو گیا۔ خیر اگلی بار کامیاب ہو جاؤ گے۔ تو کیا سُشما کنکھیوں سے تمنّا اور محبت بھرے دل کے ساتھ میری طرف نہ دیکھے گی؟ دیکھنے میں کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے! وہ مسکراہٹ، وہ آنکھیں! سُشما! اگر کبھی اُس کی ناک اتنی چپٹی نہ ہوتی تو شاید مجھے اُس سے محبت ہی ہو جاتی۔ خوب۔ خوب! کیا بیوقوفی کی باتیں ہیں! پر سُشما ہے خوبصورت! اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ خیر میں چاہے اُس سے محبت نہ کروں اُسے تو مجھ پر مرنا ہی چاہیئے۔ اُسے ایک آئی۔ سی۔ ایس سے محبت ہے اسی سے وہ پھولی نہ سمائے گی۔ لیکن میری بڑائی اسی میں ہے کہ میں اس عشق و عاشقی کے بکھیڑے سے دور رہوں۔ اس سے لڑکیوں کے دل میں میرے لئے اور بھی عزت بڑھے گی۔ بھولی بھالی سُندر لڑکیوں کا مجھے چوری چوری کنکھیوں سے دیکھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اُن نگاہوں میں مستی ہوتی ہے۔ میں بھی جھومنے لگتا ہوں۔ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ جب میری بہن کی کوئی سہیلی اُسے ملنے آتی ہے تو میں بھی اُن کے پاس ہی اِدھر اُدھر کہیں منڈلایا کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اپنی بہن کی سہیلیوں کو دیکھنے کی خواہش ہے۔ بلکہ اس لئے کہ میری بہن مجھے بہت قابل اور لائق سمجھتی ہے۔ اُس کو مجھ پر غرور ہے۔ وہ اپنی سکھیوں کو میرے کارنامے سُنایا کرتی ہے۔ ہمارے کیشو نے بی اے میں وظیفہ لیا تھا۔ ایم اے میں اوّل رہا تھا۔ ٹینس کی ٹیم کا کپتان تھا۔ تیرنے میں سب سے اعلےٰ ہے اور میری بہن کی سکھی کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔ چوری چوری کنکھیوں سے دیکھ کر وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے سراہتی ہے۔ بس یہی مجھ میں کمزوری ہے۔ مجھے لڑکیوں کی تعریفی نگاہیں بہت بھاتی ہیں۔ شاید یہ میرا وہم ہی ہو۔ لیکن اسی بات کا تصوّر کہ وہ میری طرف چوری چوری دیکھ رہی ہوں۔ میرے لئے کافی ہے میرا خیال ہے وہ نگاہیں محبت بھری نگاہیں ہوتی ہیں۔ میرا سینہ خوشی سے پھول جاتا ہے۔ لیکن میری شان اسی میں ہے کہ مسکین بنا رہا ہوں۔

محبت کی اُٹھتی ہوئی ترنگوں کا کوئی جواب نہ دوں۔ اب تو آئی۔ سی۔ ایس بن جاؤں گا۔ میرین ڈاک پر سیر کو نکلوں گا، تو لڑکیاں ایک دوسری کو آنکھ کے اشاروں سے بتائیں گی کہ اسی کا نام کیشو ہے، یہی اس سال آئی۔ سی۔ ایس بنا ہے۔ سبھی کنکھیوں سے میری طرف دیکھیں گی۔ کس ہندو لڑکی کو آئی۔ سی۔ ایس کی بیوی بننے کا شوق نہیں ہے۔ میں سب کچھ سمجھوں گا مگر اُن کی محبت کا جواب نہیں دونگا۔ سیدھا چلتا جاؤں گا جیسے مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے کتنا لطف ہے لڑکیوں کی محبت کو اس طرح اُکسانے میں اور اپنے کو اُن سے دور رکھنے میں، چاند کی طرح دور، کتنی طاقت ہے اس دوری میں!

کچھ دیر تک کیشو راؤ آپٹے آنکھیں بند کئے اسی خیالی محبت کا آنند لوٹتا رہا۔ پھر اُس نے آنکھیں کھولیں۔ چادر کو سر سے ہٹایا اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔ پانچ دس منٹ تک یونہی تکتا رہا۔ چھت پر نوجوان لڑکیوں کی قطاروں کی قطاریں اُس کی طرف تمنا بھری آنکھوں سے دیکھتی گزرتی جارہی تھیں۔ پھر وہ اُٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور ٹھوڑی کو گھٹنوں پر رکھ کر ٹانگوں کو بازوؤں میں جکڑے ہوئے سوچنے لگا۔ آج گھر معمول سے کچھ زیادہ چُپ چاپ لگتا ہے۔ دو چار دن میں ہی یہ سب ویرانی جاتی رہے گی۔ گھر پر باجے بجیں گے۔ ہَون ہوگا۔ بتاشے بانٹے جائیں گے۔ نہیں بتاشے نہیں۔ بی اے کے بعد بھی بتاشے بانٹے تھے۔ بتاشے بڑی معنی سی چیز ہے۔ خیر حلوائی تو گھر پر بٹھانا ہی پڑے گا۔ نتیجہ ایک دو دن میں نکلا ہی چاہیئے۔ آئی۔ سی۔ ایس میں پاس ہو کر اس کامیابی کی خوشی میں اچھی چیز تو بانٹنی ہی پڑے گی۔ میں ان ڈھکوسلوں کو نہ بھی مانوں لیکن ماتا جی کب ٹلنے والی ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ وہ اُس پیر کی قبر پر بھی جو سڑک کے اُس طرف ہے۔ ایک آدھ روپیہ چڑھا ہی آئیں گی۔ ان عورتوں کے دماغ پر بھی کیا پتھر پڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ہم مردوں کی عقل بھی کہاں ٹھکانے ہوتی ہے۔ نہیں تو سوشیلا کی کبھی کی شادی نہ ہو گئی ہوتی۔ اچھی بھلی ہے۔ اس سال بی اے بھی پاس کر لیا ہے۔ لیکن لڑکے بھاگتے ہیں انہیں کوئی بڑا سسرا چاہیئے۔ کوئی کیبنٹ کا منسٹر ہو۔ کوئی چیف انجینئر ہو۔ آج کل کی شرافت تو پیسے میں ہے۔ خیر اب میرے آئی۔ سی۔ ایس میں ہونے کی وجہ سے سوشیلا کی شادی میں آسانی ہو جائے گی۔ اب تو ہم بڑے بھاری جہیز کا لالچ بھی دے سکتے ہیں۔ ایک موٹر بھی دے دیں گے۔ شورلیٹ ڈی لکس ماڈل کی قیمت بھی چار ہزار سے کم ہے۔ شاید موریس ایٹ ہی سے کام بن جائے۔ رام سروپ نے اٹھائیس سَو میں خریدی ہے اُس کے ذریعے خریدیں گے۔ وہ موٹر کے سب دوکانداروں کو جانتا ہے اب ہم کم سے کم دس ہزار تو اُس کی شادی پر لگا سکتے ہیں۔ مگر ایک بات ہے۔ سر پر قرضہ پہلے ہی ڈیڑھ ہزار ہو چلا ہے۔ اس پر دس ہزار کا یہ بوجھ اور پڑ جائے گا۔ لیکن ایسا کئے بغیر گزارہ بھی کیسے چل سکتا ہے۔ سوشیلا کو گھر میں ساری عمر کنوارے تھوڑی بٹھا رکھیں گے۔ اوروں کی طرح یہ جوان لڑکی ہے۔ اسے بھی تو نوجوانوں کے ساتھ بات چیت کرنے کی خواہش ہوتی ہی ہوگی۔ نہیں نہیں۔ کیشو ایک دم بڑبڑا سا اُٹھا۔ چارپائی سے نیچے پاؤں لٹکا کر اُن سے جوتا ٹٹولنے لگا۔ آج گھر میں عجیب خاموشی سی طاری ہے۔ کیا سبھی پُوجا کرنے گئے ہیں۔ آج کونسا تیوہار آ پہنچا۔ ان سب کو ہمیشہ اپنے دھرم کرم کی ہی پڑی رہتی ہے۔ ایسے خدا کا نام جپنے سے تو جوان لڑکیوں کی شادی ہو چکی۔ لڑکی کے نئے ہندو گھرانے میں پیدا ہونا ہی پریشانی کا باعث ہے۔ پر مسلمانوں کی حالت کون سی بہتر ہوتی ہے۔ وہاں بھی اچھے لڑکے کہاں ملتے ہیں۔ ہندوستانی ہونا ہی گناہ ہے انگلینڈ کو دیکھو خود لڑکے لڑکیاں اپنی زندگی کا ساتھی تلاش کر لیا کرتے ہیں۔

کیشو نے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ یہ کمرہ کوئی بہت بڑا نہیں۔ لیکن اس میں چار آدمی سوتے ہیں۔ کیشو، اُس کا باپ اور دو بھائی۔ اُس کا باپ ایک بیمہ کمپنی میں نوکر ہے اور ایک سو پانچ روپے تنخواہ پاتا ہے۔ ان میں سے پینتیس تو کرائے میں ہی نکل جاتے ہیں۔ ایک بھائی کی عمر نو سال کی ہے دوسرے کی پانچ سال۔ دونوں ایک ساتھ زمین پر سوتے ہیں۔ چارپائی کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ ہوتے بھی تو رکھنے کے لئے جگہ نہیں ہے۔ ساتھ کا کمرا بھی بھرا پڑا ہے۔ وہی کچن کا کام دیتا ہے اور وہی عورتوں کے سونے کا کمرہ بھی ہے۔ کیشو کی ماں اور تینوں بہنیں وہیں سوتی ہیں۔ سبھی فرش پر۔ یہ ٹھیک ہے کہ انہیں رات کو جُوں بہت تنگ کرتے ہیں کھٹمل خون چُوس لیتے ہیں۔ مچھر نیند نہیں آنے دیتے۔ مگر ہاں امیروں کی طرح انہیں بے خوابی کی شکایت نہیں رہتی۔ دن بھر چاروں عورتیں کولہو میں جُتی رہتی ہیں۔ رات کو ٹاٹ بچھا کر جب سب اُس پر اپنی اپنی میلی دلائیاں بچھاتی ہیں۔ تو اُن کی آنکھیں نیند سے بند ہوئی جاتی ہیں۔ انہیں نیند آجاتی ہے وہ سو جاتی ہیں۔ یوں ہی ایک دو گھنٹے گزر جاتے ہیں۔ تب تک دن بھر کی تھکان تھوڑی تھوڑی اُترنے لگتی ہے۔ اُس بے ہوشی کا جو سارا دن کام کرنے کی وجہ سے اُن پر طاری ہو گئی تھی خمار کچھ کچھ کم ہونے لگتا ہے۔ انہیں محسوس

ہونے لگتا ہے کہ اُن کی پھٹی چادروں پر چُوہے دوڑ رہے ہیں۔ مچھروں کی بھنبھناہٹ سے بچنے کے لئے وہ بار بار اپنے جسم اور سر کو چادر میں چھپا لیتی ہیں۔ کھٹملوں کے کاٹنے سے اُن کا سارا جسم لال ہو جاتا ہے۔ اُسی نیم بیہوشی کی حالت میں وہ اپنے جسموں کو لگاتار کھجاتی رہتی ہیں۔ بمبئی میں نیچے کے درمیانی طبقہ کے لوگ ایسی حالت کو ہی "گہری نیند" کہا کرتے ہیں۔ چاروں مینڈک کی طرح سمٹ کر پڑی رہتی ہیں۔ اس طرح کم جگہ میں گزارہ ہو جاتا ہے اور کچن کے گیلا ہونے سے جو گنٹھیا کا ڈر رہتا ہے۔ اُس کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

کیشو آپٹے یہ سب کچھ جانتا ہے، اور اُس کا باپ بھی۔ لیکن چارہ ہی کیا ہے۔ کیشو چارپائی پر سوتا ہے۔ اُسے مچھردانی بھی ملی ہے۔ اُسی کے مستقبل پر تو سارے خاندان کے مستقبل کا انحصار ہے۔ باپ نے فاقے کر کے، فالتو وقت میں کام کر کے، ماں نے اوروں کے کپڑے سی سی کر، بڑی بہن سوشیلا نے لوگوں کے بچوں کو پڑھا پڑھا کر کیشو کے مقابلہ والے امتحانوں کی بڑی بڑی فیسیں تین سال تک دی ہیں۔ اسی عرصہ میں کیشو کے باپ پر ڈیڑھ ہزار کا قرض بھی چڑھ گیا ہے۔ جب کبھی اُس کے باپ کو اس ڈیڑھ ہزار کا خیال آتا ہے۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔ اگر وہ کھڑا ہو تو گرتے گرتے بچتا ہے۔ بیٹھا ہو تو اُس کا سر اُس کی چھاتی پر جُھک جاتا ہے اور چُپ چاپ وہ کتنی دیر تک اسی حالت میں بیٹھا رہتا ہے۔ اُن سب کی اُمیدیں آنکھیں اُٹھائے کیشو کو دیکھ رہی ہیں۔ اُس کے آرام کے لئے اُسے مچھردانی بھی ملی ہے۔ گھر میں پر کسی اور کے حصے میں نہیں آئی۔ کیشو کی پڑھائی میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ اُسے مچھر نہ ستائیں۔ اُن سب کو کیشو کی قابلیت پر پورا بھروسہ ہے۔ اُن سب کو اُس کا مستقبل پُرنور دکھائی دیتا ہے۔ اُسے مچھردانی ملنے کی وجہ سے اُس کمرے کے باقی سونے والوں کو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ مچھر مچھردانی سے ٹکرا کر لوٹتے ہیں۔ اور اُن سے بدلہ لیتے ہیں۔ لیکن خیر!

باپ کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ شاید وہ بھی پوجا کے لئے گیا ہو۔ مگر دونوں بھائی ابھی پڑے فرش پر سو رہے تھے۔ کچھ دیر تک کیشو اُنہیں غور سے دیکھتا رہا۔ بڑی محبت بھری نگاہ سے۔ پھر وہ مسکرانے لگا۔ چند دنوں میں اُن کا مستقبل بھی شاندار ہو جائے گا اور وہ میونسپلٹی کے سکول میں نہیں جائیں گے۔ آج کل بڑے بھائی کا ہفتہ وار جیب خرچ ایک آنہ ہے اور چھوٹے بھائی کا دو پیسہ۔ چھوٹا تو اپنا حصہ کبھی کبھی خرچ کر لیا کرتا ہے۔ مگر بڑا ہمیشہ ہفتہ کے اختتام پر اپنا حصہ واپس لا کر ماں کو دے دیا کرتا ہے اور کہتا ہے "ماں مجھے اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔" دوسرے لڑکے جب خوانچے والے کے گرد گھیرا ڈال لیتے ہیں تو یہ نو سال کا بچہ کتاب لے کر دور ایک درخت کے نیچے جا بیٹھتا ہے۔ وہاں اسے خوانچے والے کی دلکش چیزیں دکھائی نہیں دیتیں۔ اُس کی للچا دینے والی پکار "چٹ پٹا چنا۔ ایک پیسے میں پڑیا" بھی سنائی نہیں دیتی۔ باقی بچے اپنی اپنی جیب سے پیسہ نکالتے بھی نہیں دکھائی دیتے۔ حساس بچہ ہے۔ گھر کی باتوں باتوں میں ہی اُسے پتہ چل گیا ہے کہ سوشیلا کا بیاہ اس لئے رُکا ہوا ہے کہ ہمارے پاس جہیز کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ سوشیلا سے اُسے بڑا پیار ہے۔ وہ ہر ہفتے اپنے حصے کی اکنّی بچا کر اُس کے جہیز کے لئے روپیہ اکٹھا کر رہا ہے! کیشو محبت سے پھول اُٹھا۔ اُس کی آنکھوں میں خود بخود ہی آنسو آ گئے۔ وہ اُٹھا اور آہستہ سے اُن کے پاس گیا۔ وہ جُھکا۔ اُس نے آہستہ سے دونوں بچوں کے ماتھوں کو چُوم لیا۔

حسب معمول نہا دھو کر کیشو چائے پینے بیٹھا۔ اُس وقت تک گھر کے باقی لوگ بھی پوجا سے واپس آ گئے تھے۔ حسب معمول اُس نے چائے پینا شروع کیا اور ساتھ ہی ساتھ اُس روز کا اخبار بھی پڑھنے لگا۔

اُس دن اخبار میں آئی۔ سی۔ ایس کا نتیجہ بھی نکلا تھا۔

کیشو کی نظر نتیجہ پر پڑی۔ اُس کا دل دھڑکنے لگا۔ پانچ نام تھے۔ کالیلکر کا نام بھی تھا۔ لیکن اُسے اپنا نام کہیں نہ ملا۔ اُس نے چائے کا پیالہ کانپتے ہاتھوں سے زمین پر رکھ دیا۔ پھر سے نتیجے کو پڑھا۔ شاید اُس سے غلطی ہوئی۔ نہیں، اُس کا نام نہیں تھا۔ احاطۂ بمبئی میں سے صرف اُس کا دوست کالیلکر ہی پاس ہوا تھا۔ معمولی طالب علم تھا۔ باقی دو مدراس کے تھے۔ ایک بنگال کا اور ایک پنجاب کا۔ اُس کا دل بیٹھنے لگا۔ اُس کو اپنے گلے میں کوئی چیز رُکتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اُس کے چہرے کی رونق تو پہلے ہی سے مقابلہ والے امتحانوں کی نذر ہو چکی تھی۔ اب اُس کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ ماں اور بہنیں اُس پر اُمید لگائے بیٹھی تھیں۔ وہ اُن کی رہی ہوئی آرزوؤں کا سہارا تھا۔ ماں نے کیشو کو چائے کا پیالہ بغیر پئے ہی زمین پر رکھتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے اُس کے چہرے کا رنگ بھی بدلتے ہوئے دیکھا۔ اُس نے آہستہ سے پوچھا "کیشو کیا بات ہے؟" لیکن اب کیشو سنبھل چکا تھا "کچھ نہیں"۔ اُس نے کہا "یہ دیکھو۔ آئی۔ سی۔ ایس کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ میں نے کہا نہ تھا کہ کالیلکر پاس ہو جائے گا۔ اُس کے کامیاب ہونے کی اُمید بھی تھی۔" کیشو نے ایک قہقہہ لگایا جس سے اُس کی ماں اور بہنوں کا کلیجہ دھک

دھک کرنے لگا۔ کیشو کہتا گیا "جو پڑھیں گے وہی پاس ہونگے۔ میں نے
تو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میرے آنے کی اُمید نہیں ہے۔ قسمت والے آیا
کرتے ہیں۔ جو کام کرے گا۔ وہی کامیاب ہوگا ۔ ۔ ۔ " اور کیشو کالیلکر
کو مبارک باد دینے کے بہانے گھر سے نکل بھاگا۔

کالیلکر کے نام شام کو ہی شملے سے تار پہنچ گیا تھا کہ تم پاس ہو
گئے ہو۔ گویا کل اخباروں میں نتیجہ نکل جائے گا۔ سب جان جائیں گے کہ
شاہو ناتھ کالیلکر اب طالب علم نہیں رہا! بمبئی سے دہلی اور دہلی سے
بمبئی کے چکر لگانے والا نوجوان نہیں رہا۔ اب وہ ہندوستان کی سب
سے اچھی ملازمت میں ہے۔ جہاں دولت ہوگی، طاقت ہوگی، رعب
ہوگا۔ لیکن یہ سب باتیں تو آہستہ آہستہ ہوتی رہیں گی۔ پہلا کام تو یہ
ہے کہ مجھے ناچ سیکھنا ہوگا۔ یہ ضروری ہے اگر ولایت میں جا کر سیکھا
تو یُونہی بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جائے گا۔ اور میں نے سُنا ہے کہ
جہاز پر بھی رات کا کھانا کھانے کے بعد روزانہ ناچ ہوا کرتا ہے۔ کیا وہاں
بُوڑھوں کی طرح کُرسی پر بیٹھ کر اُن سب کو چُپ چاپ دیکھا کروں گا۔ پہلے
ہی ان انگریزوں کے دل میں ہمارے لئے کوئی عزّت نہیں ہے۔ اور
ہو بھی کیسے سکتی ہے۔ ہم اِن سے ملتے جلتے ہی کب ہیں۔ دُور سے
ہی انہیں دیکھ کر ان کے بارے میں اپنی رائے قائم کر لیا کرتے ہیں۔
اِن کو ہم نے کتنا بدچلن سمجھ رکھا ہے۔ جب شام کو اِن کی عورتیں شبانہ
لباس پہن کر نکلتی ہیں جن سے اُن کے جسم کا آدھے سے زیادہ حصہ
دکھائی دیتا ہے۔ تو ہم کہتے ہیں کہ ایسے کپڑے پہن کر بھی کسی کا چال
چلن ٹھیک رہا ہے گویا لوگوں کا چال چلن اُن کے کپڑوں میں ہی چھپا بیٹھا
ہے! جب انگریز عورتیں اور مرد اکٹھے بیٹھ کر شراب پیتے ہیں تو ہم سوچتے
ہیں کہ کیا ان کے خیالات پراگندہ نہ ہوتے ہونگے۔ یہ سب ہماری ناواقفیت
کا نتیجہ ہے کہ ہم ان کے بارے میں ایسے اُلٹے سیدھے خیالات رکھتے
ہیں۔ مجھے تو اب پختہ یقین ہو چلا ہے کہ ابھی تک ہم بھول ہی رہے
ہیں۔ اِن کے ہاں تو رواج ہی ایسا ہے۔ ولایت میں اتنی سردی
پڑتی ہے۔ شراب تو پینی ہی پڑے گی۔ تھوڑی بہت پی بھی لی تو اُس سے
کون سی بُرائی آ جائے گی۔ لندن کی سردی میں صرف دُودھ پینے سے تھوڑا
ہی جسم کی صحت قائم رہے گی۔ دو ہی باتیں ہیں۔ یا تو لندن جا کر بھی لحاف
اوڑھ کر اپنے کمرے میں پڑا رہوں۔ نہ کسی سے بات کروں نہ کسی سے
ملوں۔ تب تو نہ برانڈی کی ضرورت محسوس ہوگی نہ سگرٹ کی۔ لیکن سرکار
ہمیں اس لئے تو ولایت نہیں بھیجتی کہ ہم وہاں جا کر بھی کوئیں کے مینڈک
ہی بنے رہیں! اُس کا منشا تو یہی ہوتا ہے کہ ہم انگریزوں سے مل جُل کر
اچھی سوسائٹی میں اُٹھنا بیٹھنا سیکھ جائیں۔ جب مجھ سے کوئی دوست
آ کر کہے گا "چلو آج ناچ کی دعوت ہے" تو کیا میں اُسے کہوں گا۔
"مجھے ناچ نہیں آتا"۔ یہ کہتے ہوئے شرم سے مر نہ جاؤں گا۔ آئی۔ سی
ایس اور انگریزی ناچ کے علم سے بے بہرہ؟ مجھے کوئی جانوروں
پر حکومت نہیں کرنی۔ انگریزوں کی سوسائٹی میں ملنا جُلنا ہے۔ کسی
دوسرے کی بیوی کو، کسی نوجوان لڑکی کو محض اپنے بازوؤں میں تھام
کر ناچ گھر میں ناچنے سے تو مجھ میں کوئی برائی نہیں آ جائے گی۔ اور نہ
اُن کی نیت میں کوئی فتور ہوگا۔ یہ تو سب ہندوستانی گنواروں کی باتیں
ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ہمارا دھرم بگڑتا ہے۔ ذرا ذرا سی بات پر ہماری
حیوانیت بھڑکتی ہے۔ ہم بھی اچھے آدمی ہیں! ہم سب کو دُور جنگل میں لے
جا کر گپھاؤں میں بند کر دینا چاہیئے۔ وہاں ہم نہ کسی سے ملیں نہ جُلیں
آنکھیں بند کئے خدا کا نام جپتے رہیں۔ ہمارے ملک میں بھی تو پرانے
زمانے میں ناچنا علم کا ایک ضروری جزو سمجھا جاتا تھا۔ اس سے جسمانی
صحت بڑھتی ہے۔ سارے جسم میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑنے لگتی
ہے۔ خدا کا شکر ہے ہندوستانیوں نے پھر سے ناچنے میں دلچسپی لینی
شروع کر دی ہے۔ بیس سال پہلے اُودے شنکر اور مینا کا اور سادھنا
بوس کی ہنسی اُڑائی جاتی تھی اب اُن ہی کی قدر ہوتی ہے۔ اصل میں ناچ
تو ورزش کا ایک اچھا خاصہ ذریعہ ہے۔ تھوڑی سی دلچسپی بھی ہو
جاتی ہے۔ وقت بھی کٹ جاتا ہے اور ورزش بھی ہو جاتی ہے۔ کوئی
حرج نہیں۔ بمبئی تو ناچ سکھانے والے سکولوں سے بھرا پڑا ہے۔
ریگل ہے، ایکسیلسیر ہے۔ ہیڈن انسٹیٹیوٹ ہے۔ کسی میں سیکھ آؤں
گا۔ کسی کو بتانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔ یہاں کے لوگ خواہ مخواہ شک
کرنے لگتے ہیں۔ انگریز تو ایسی باتوں میں رسم و رواج کے بڑے پابند
ہوتے ہیں۔ ان میں وہی چُست سمجھا جاتا ہے جو سماج کی رسموں کا پورا
پورا عامل ہو۔ اُن کی سوسائٹی، کلبوں کی رونق ہی اُن کی دوست باشی
اور زندہ دلی ہے۔ شراب پینے سے کیسے انکار کروں گا۔ پیش کئے
ہوئے سگریٹ کو کیسے نہ لُوں گا۔ ساری پارٹی کی چہل پہل میں فرق آئے
گا۔ سبھی آنکھیں اُٹھا اُٹھا کر دیکھیں گے۔ اپنے لئے نہ سہی۔ سوسائٹی
کے لئے تو مجھے اِن باتوں میں حصہ لینا ہی پڑے گا۔

کاتیلکر کو بھلا نیند کہاں ؟ اُس نے کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔
اب مجھے اپنی سماجی بول چال اور اُٹھنے بیٹھنے کے طریقے میں بہت تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔ سبھی ایک جیسے ہیں۔ سبھی سے مل کر بیٹھنا چاہیئے۔ بڑی نوکری سے تو کوئی بڑا نہیں بن جاتا۔ یہ سب باتیں اب پرانی ہو گئی ہیں لیکن سب لوگوں سے گُھل مل گیا تو افسری کہاں رہی۔ بدقسمتی سے مجھے سب سے ہنس کر بولنے کی عادت ہے۔ اس عادت کو ہٹانا پڑے گا۔ دو تین بار مجھے جمخانہ کلب جانے کا اتفاق ہوا ہے۔ کبھی میں نے وہاں کسی آئی سی۔ ایس کو ہنستے دیکھا ہے؟ کبھی اُنہیں اُونچے قہقہے لگاتے سنا ہے؟ کبھی ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے پایا ہے؟ ان سب باتوں سے انسان کے وقار کو صدمہ پہنچتا ہے۔ کیسے چُپ چاپ اپنے سامنے شراب کا ایک ایک گلاس رکھے بیٹھے رہتے ہیں! آئی سی ایس والے کلب میں بھی الگ تھلگ ہی رہتے ہیں۔ اُن کی تہذیب، اُن کا سوچنے کا طریقہ، اُن کا ایک دوسرے سے بول چال کا ڈھنگ، سب سے علیحدہ ہے۔ کلب میں پانچ سات آئی سی ایس ہیں۔ وہ ایک پارٹی بنا کر علیحدہ ہی بیٹھتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بھی زیادہ بات چیت نہیں کرتے کبھی کبھی بغیر کسی کو مخاطب کئے اُن میں سے ایک کہہ اُٹھتا ہے۔ "اسلم کی ناسک تبدیلی ہو گئی ہے۔ اُس کی جگہ رابرٹس آرہا ہے۔" کوئی جواب نہیں دیتا۔ سبھی چُپ رہتے ہیں۔ شراب پیتے رہتے ہیں۔ سگرٹ کے کش لگاتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر کوئی کہہ اُٹھتا ہے۔" میں بیس تاریخ کو دَورے پر جا رہا ہوں۔ بڑی گندی سڑکیں ہیں۔" اپنے پر کتنا ضبط ہے! کتنا قابو! اُن کی ہر بات میں کتنا رعب ہے! مجھے تو سب سے اُچھل اُچھل کر باتیں کرنے کی عادت ہے کتنا گنوار لگوں گا۔ مجھے اپنی عادات سُدھارنی پڑیں گی۔

یہ جو دو سال ہوئے میری منگنی ہو گئی تھی۔ اس کو بھی اب توڑنا ہی پڑے گا۔ ایک تو وہ لڑکی زیادہ پڑھی لکھی نہیں اور دوسرے وہ معمولی درمیانہ طبقے کے خاندان کی ہے۔ اُس سے شادی کرنے سے تو اخبار میں فوٹو بھی نہیں نکلے گا۔ اب تو کوئی "سوسائٹی ویڈنگ" کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے مجھے جلدی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تو میرا نام بھی سوائے میرے چند دوستوں کے کسی کو معلوم نہیں۔ ولایت سے ہو آؤں۔ تب تک امیر نوجوان لڑکیوں کے والدین کو بھی میری بابت کچھ معلوم ہو جائے گا۔ حیرانی کی بات ہے کہ کیسے اور کتنی جلدی کنواری لڑکیوں کے ماں باپ کو اچھے، قابلِ رشتہ لڑکوں کی بابت پتا چل جاتا ہے۔ شاید وہ ہر مقابلہ والے امتحان کے نتیجے کی فہرست غور سے دیکھا کرتے ہیں۔ جب واپس آؤں گا تو بہت سے لوگ مجھے پہچانیں گے ۔ اپنی لڑکیوں، بہنوں، سالیوں بھانجیوں کے لئے سفارشیں کریں گے اور دوسروں سے بھی کہلوائیں گے اچھی لڑکی کے انتخاب میں کافی آسانی ہو جائے گی۔ اُن لڑکیوں کو کلب میں لالا کر اُن کا مجھ سے تعارف کرائیں گے۔ مجھے چائے اور کھانے کی دعوتوں پر بُلا بُلا کر اُنہیں مجھے دکھائیں گے۔ یہ اُس کا کاڑھا ہوا میز پوش ہے۔ یہ اُس کی پینٹ کی ہوئی تصویر ہے۔ وہ کونے میں پڑی ہوئی ہارمونیم کی پیٹی اور وائلن بھی اُسی کی ہے۔ اُسے گانے کا بہت شوق ہے۔ وہ نہ ہو تو گھر میں کسی کا دل ہی نہ لگے۔ سردیوں میں سبھی گھر والوں کے لئے سوئٹر بُنتی ہے۔ اب مسٹر چودھری کی ڈانس کلاس میں داخل ہوئی ہے . . .

لیکن یہ تو دور کی باتیں ہیں! کاتیلکر نے پھر کروٹ بدلتے ہوئے سوچا۔ پہلے تو مجھے کل کا انتظام کرنا پڑے گا۔ کل صبح اخبار سے سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں آئی سی ایس بن گیا ہوں۔ رشتہ داروں کی تو کوئی بات نہیں ہے۔ اُن سے نبٹ لُوں گا۔ وہ مبارک باد دیں گے۔ میں چُپ چاپ ذرا سا مسکرا دوں گا۔ وہ کہیں گے۔ شاہو! خاندان کا نام روشن کر دیا! میں سر نیچا کر کے کہوں گا۔ آپ ہی کی دعا ہے! ماتا جی نے تو ابھی سے بینڈ والوں کو کل صبح آنے کے لئے کہہ دیا ہے۔ پتا جی آج رات کو ہی گھر گھر جا کر میری کامیابی کے بارے میں بتاتے پھر رہے ہیں۔ بہنیں خوشی کے مارے پھولی نہیں سماتیں۔ چھوٹی بہن تو خوشی سے اتنی دیر روتی رہی ہے کہ میں بھی گھبرا گیا ہوں۔

لیکن مشکل دوستوں سے پیچھا چھڑانے میں ہوگی۔ مجھے ہر ایک بات سوچ سمجھ کر کرنی پڑے گی۔ نپی تُلی۔ جس سے نہ تو میرا گنوار پن ظاہر ہو اور نہ میں اپنی کامیابی پر اتنی خوشی دکھاؤں کہ اُن کا دل دُکھے۔ بے چارے کے پاس اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ ابھی کیشو آپٹے کا نہیں پتہ چلا کہ وہ پاس ہوا ہے یا نہیں۔ اُس نے تو بہت محنت کی تھی۔ قابل بھی بہت ہے۔ خدا کرے وہ کامیاب ہو جائے۔ نہیں تو اُس کی ساری زندگی ہی بے مصرف ہو جائے گی اور گو پلے خیر اگر گو پلے پاس نہ بھی ہو سکا تو وہ اس صدمے کو سہہ لے گا۔ کافی امیر گھر کا لڑکا ہے

شاہو ناتھ کاتیلکر بہت سویرے اُٹھا۔ سات بجتے نہا دھو کر فارغ ہو گیا۔ اور دسویں بار اخبار میں اپنے نام کو دیکھنے لگا۔ سارے احاطۂ بمبئی

میں سے صرف وہی اس سال کامیاب ہوا تھا۔ اُس کے سبھی دوست رہ گئے تھے۔ کیشو آپٹے کا نام نہیں تھا۔ رنگ تانبے کا بھی نہیں۔ اُس کا سینہ غرور سے پھولنے لگا۔ صوبے بھر میں صرف ایک اُمیدوار کامیاب اور وہ شاہُوناتھ کالیلکر!

وہ سوچنے لگا مجھے لوگوں کی مبارک باد کیسے لینی چاہیئے۔ وہ اور اُس کے ماں باپ اُوپر کی منزل میں رہتے ہیں لیکن اُن کا ڈرائنگ رُوم نیچے ہے۔ شاہُو نیچے بیٹھک میں آبیٹھا۔ کون بار بار اُٹھ کر اُوپر سے نیچے آئے گا۔ کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ اُسے اپنا وہاں بیٹھنا عجیب سا لگنے لگا۔ جو آئے گا سوچے گا مبارک باد لینے کے لئے نیچے ہی آبیٹھا ہے! وہ ڈرائنگ رُوم کو کھُلا چھوڑ پھر اُوپر چلا گیا۔ تھوڑی دیر اخبار کے صفحے اُلٹتا پلٹتا رہا۔ اُسے اپنا اُوپر بیٹھے رہنا بھی مناسب معلوم نہ دیا۔ لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ مغرور ہو گیا ہے۔ آوازیں دے دے کر اوپر سے بُلانا پڑتا ہے۔ وہ پھر نیچے آگیا۔ اُس نے سُوٹ اور بُوٹ پہنا ہوا تھا۔ کچھ دیر سوچنے پر اُس نے اُوپر جا کر یہ کپڑے اُتار دیئے۔ نکٹائی لگی رہنے دی۔ پاجامہ اور چپل پہن کر نیچے آبیٹھا رات کو ہی بیٹھک کی صفائی کر دی گئی تھی اور کتابیں قرینے سے چُن دی گئی تھیں۔ اُس نے دو تین کتابیں میز پر اِدھر اُدھر بکھیر کر رکھ دیں۔ ایک کو کھول کر رکھ دیا۔ اور آپ آرام کرسی پر بیٹھ، ٹانگیں سامنے میز پر رکھ کر اخبار پڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔

سیٹھنا سیدھا ڈرائنگ رُوم میں چلا آیا۔ اُس نے بھی اِس بار امتحان دیا تھا مگر پاس نہ ہو سکا۔ ابھی عمر میں وہ چھوٹا ہے۔ وہ دوبارہ امتحان میں بیٹھ سکتا ہے۔ اس لئے ابھی اُس کا حوصلہ نہیں ٹوٹا۔ اُس کی آواز میں ابھی نا اُمیدی کی کمزوری نہیں آئی۔ وہ آتے ہی شاہُوناتھ کی پیٹھ پر تھپکی دے کر بولا۔ مان گئے بھئی ہم تمہیں! نہیں تو کہاں تم اور کہاں آئی۔ سی۔ ایس؟ قسمت والے ہو۔ پانسہ سیدھا پڑ گیا ہے۔"

شاہو اس بات کی سچائی سے تو انکار نہیں کر سکتا تھا پر اُس کو اپنے دوست کے بھدّے پن پر غصہ آیا۔ اپنے کو سمجھتا کیا ہے۔ کوئی زیادہ پڑھنے سے تھوڑی کامیابی ہوتی ہے۔ خدا نے دماغ دیا ہے۔ بھُوسا نہیں بھرا۔ ظاہراً بولا "ہاں بھئی۔ قسمت کے دھنی نکلے۔ نہیں تو ہم جیسوں کا کیا کام؟ کچھ پیو گے؟"

سیٹھنا بولا "آج تمہارے سر سے نہ پئیں تو کب پئیں گے۔ پر ضیافت کب دے رہے ہو؟" "جب چاہو۔" "لیکن دیکھو" سیٹھنا نے کچھ طنز سے اور کچھ سنجیدہ ہو کر کہا" اب یہ پائجامہ وغیرہ پہننا چھوڑ دو ہمیشہ گھر پر بھی پتلون پہن کر بیٹھا کرو۔ میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔ اب تک تو تم تھرڈ کلاس میں سفر کرنے کے حمایتی رہے ہو کیونکہ اصلی ہندوستان کی زندگی کی کشمکش تمہیں یہیں دکھائی دیتی ہے۔ اب کیسے اپنے اس شغل کو جاری رکھ سکو گے؟"

کالیلکر نے سوچتے ہُوئے جواب دیا "بات تو ٹھیک ہے۔ پر کیا مجھے اب اُسی کلاس میں سفر کرنا چاہیئے۔ مجھے چھوٹی بڑائی پر کوئی بھروسہ نہیں۔ لیکن پھر بھی ۔ ۔ ۔"

"یہی تو میں بھی کہتا ہوں" سیٹھنا نے طنز بھرے لہجہ میں کہا۔ "تم گنواروں میں مل کر اپنی عزت گنوا بیٹھو گے۔ تمہیں اپنی پوزیشن، اپنے سوشل درجے کا دھیان رکھنا ہے۔ کوئی ریلوے سٹیشن پر ہی مل جاتا ہے کسی انگریز اور اُس کی بیوی نے تمہیں آئی، سی، ایس ہوتے ہُوئے بھی تھرڈ کلاس میں دیکھ لیا تو اپنے سب سُنہری سپنوں کا خاتمہ سمجھو۔ ساری عمر اسسٹنٹ کلکٹر ہی بنے ایڑیاں رگڑتے رہو گے۔"

شاہوناتھ کالیلکر کو بھی یہ بات صحیح معلوم ہوئی۔

سیٹھنا کہتا گیا "اور پھر اگر اُسی گاڑی میں تمہارے محکمے کا کوئی چھوٹا موٹا آدمی بھی بیٹھا ہوا ہو تو سارے محکمے میں تمہاری کوئی عزت نہ رہے گی یہ آج کل کی سوسائٹی لیڈیز کے خیالات بھی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے تمہیں انٹر یا تھرڈ کلاس میں دیکھ لیا۔ تو کلب میں تم سے کوئی سیدھے مُنہ بات بھی نہیں کرے گی۔ اور تمہاری بیوی کی بھی طعنوں سے گت بنائی جایا کرے گی۔"

شاہُوناتھ غور سے سنتا رہا۔

سیٹھنا نے کہا "اب تو تمہیں کچھ ڈانسنگ وغیرہ بھی سیکھنا چاہیئے"

شاہوناتھ کالیلکر بولا "میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔ میری صلاح امپیریل انسٹیٹیوٹ سے تھوڑے سے ڈانسنگ سبق لینے کی ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے۔"

سیٹھنا نے سر ہلا کر کہا "نیکی اور پھر پُوچھ پُوچھ!"

سیٹھنا کو گئے ہوئے بہت دیر نہیں ہوئی تھی کہ شاہو سے کچھ نصیحت لینے گوپال آپہنچا۔

گوپال نے اسی سال بی اے کا امتحان دیا ہے۔ زندگی کے اگلے تین چار سال وہ مقابلہ والے امتحانوں میں صرف کرے گا۔ چونکہ شاہوناتھ کالیلکر

امتحان میں کامیاب ہوگیا ہے۔ اس لئے اُس کی رائے کی وقعت ایک دم بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ جو کہہ دے گا۔ اُسی پر عمل کرنے سے اور لوگ بھی کامیاب ہونگے۔ یہی دنیا کا طریقہ ہے۔ اسی کو ہم قابلیت کی قدر کہتے ہیں۔ جو پاس ہوگیا وہ قابل۔ جو رہ گیا وہ خر دماغ۔ اسی بات نے کہ اب اُس کی رائے کی بھی قدر ہونے لگی ہے۔ شاہو ناتھ کو ایک اور ہی آدمی بنا دیا ہے۔ اپنے آپ پر اُس کا اعتماد بڑھ گیا ہے۔ وہ گوپال کو نہیں جانتا۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ شاہو کا اپنی باتوں کے ہمیشہ ٹھیک ہونے پر یقین بڑھتا جاتا ہے۔ یہ آنے والی طاقت کی پہلی نشانی ہے۔ یہ سرکار مزاجی کی پہلی قسط ہے۔

"نہیں۔ بہت زیادہ پڑھنے سے امتحان میں کامیابی نصیب نہیں ہوتی۔" وہ گوپال کو بتا رہا ہے۔ "میں نے خود کبھی دن میں چھ گھنٹے سے زیادہ نہیں پڑھا۔ لیکن میرے کئی دوست ہیں۔ کیشو آپٹے ہے۔ چوبیس چوبیس گھنٹے پڑھتا رہتا ہے۔ لائق بھی غضب کا ہے۔ مگر بیچارہ نہیں آیا۔ بہت پڑھنے سے دماغ کند ہو جاتا ہے۔ میری رائے تو ہمیشہ یہ رہی ہے۔ کہ جب تم پڑھتے پڑھتے تھک جاؤ تو فوراً کتابوں کو چھوڑ دو۔ باہر گھومنے چلے جاؤ۔ سینما دیکھنے چلے جاؤ۔ تم نے شاید ابھی کوئی بڑا امتحان نہیں دیا۔ لوگ نہیں سمجھ سکتے کہ امتحان میں ایک تر و تازہ دماغ کی کتنی اہمیت ہوتی ہے ہاں باقاعدہ کام کرو۔ کبھی ہمت سے زیادہ کام کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ مجھے ڈر ہے بیچارہ کیشو اسی غلطی سے رگڑے میں آگیا ہے۔ میں اُن طالب علموں میں سے نہیں ہوں۔ جو چارپائی چھوڑ کر زمین پر سوتے ہیں۔ تاکہ صبح جلد اُٹھ سکیں۔ جو رات کو تین تین بار کافی پیتے ہیں۔ تاکہ نیند نہ آجائے۔ جو بار بار آنکھوں پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتے ہیں تاکہ جاگتے رہیں۔"

"میں کیا بتاؤں کہ انگریزی کے جواب مضمون کے لئے تمہیں کون کونسی کتابیں پڑھنی چاہئیں۔ جواب مضمون لکھنا تو بہت وسیع اور گہرے علم سے آتا ہے۔ خوب ناول پڑھو۔ ہاں اندازِ بیان کے لئے گالز وردی پڑھ سکتے ہو۔ ٹامس ہارڈی بھی اچھا ہے۔ ان دونوں کے قلم میں زور ہے۔ طاقت ہے۔ تم نے گالز وردی کی کہانی "سیب کا درخت" پڑھی؟ نہیں؟ بڑی حیرانی کی بات ہے۔ کمال کی چیز ہے۔ میں تو اندازِ بیان کے لئے ہر ایک کو اسی کہانی کے پڑھنے کو کہا کرتا ہوں۔"

"نہیں ناؤٹ کی لکھی ہوئی ہسٹری پڑھنے سے تو نمبر آچکے۔ ہاں ٹکمبج کا خلاصہ اچھا ہے۔ لیکن اُس کے سہارے کے لئے تمہیں اچھی اچھی کتابیں پڑھنی پڑیں گی۔ "کیمبرج ہسٹری" میں جو وال پول کی فارن پالیسی پر باب ہے وہ اچھا لکھا ہوا ہے۔ جی این کلارک کی "ہسٹری آف دی لیٹ سٹوارٹس" بھی تمہیں پڑھنی پڑے گی۔ رابرٹس کی "دی ہینوویرینز" خاص اچھی نہیں ہے لیکن بیچ بیچ میں سے پڑھ جاؤ ——— ٹریولین کو ضرور پڑھنا۔ اُس کا لکھنے کا طریقہ بڑا دلچسپ ہے۔"

"انٹرویو کے لئے میں زیادہ کیا کہہ سکتا ہوں۔ مگر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آخر ممتحن بھی تو آدمی ہی ہوتے ہیں۔ تمہیں کھانے سے تو رہے۔ خوب ڈٹ کر اور اپنے پر بھروسہ رکھ کر جواب دو جس سے اُن پر تمہاری شخصیت کا اثر پڑے۔ ہاں دیکھو۔ اُنہیں کبھی دھوکہ دینے کی کوشش نہ کرنا۔ بڑے حضرت ہوتے ہیں۔ جھٹ تاڑ جاتے ہیں۔ اگر کوئی بات نہ آتی ہو تو صاف کہہ دو کہ نہیں آتی۔ ممتحن کو بھی پتہ ہے کہ اُمیدوار انسائیکلوپیڈیا نہیں ہوتے۔"

گوپال بھی چلا گیا۔ کچھ وقت گزر گیا۔ کیشو دروازے پر آکر رُک گیا۔ شاہو ناتھ دروازے کی طرف پیٹھ کئے بیٹھا تھا۔ اُس نے کیشو کو نہیں دیکھا۔ کیشو ایک منٹ تک شاہو کو کھڑا دیکھتا رہا۔ پھر زور سے ہنس کر کہنے لگا۔ "مبارک باد۔ مبارک باد۔" اور آگے بڑھ کر شاہو ناتھ کی پیٹھ پر تھپکی دینے لگا۔ شاہو اُٹھا۔ وہ ہنسا نہیں۔ کیشو کی تھپکی نے اُس کے جسم میں ایک ٹھنڈی سنسنی پھیلا دی تھی۔ اس تھپکی میں اُسے ایک زندگی کی نااُمیدی، ایک جوانی کی بجھتی ہوئی آگ معلوم ہوئی۔ اُس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "آؤ بیٹھو۔" اور کیشو کا ہاتھ پکڑ کر اُسے سامنے کی کرسی پر بٹھا دیا۔ اپنی کرسی کی گدی بھی اُسے پیچھے رکھنے کو دے دی۔

دونو بغیر کچھ کہے کافی دیر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے آہستہ آہستہ دونو کے مُنہ پر مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی۔ دونو کی مسکراہٹ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ شاہو کی مسکراہٹ فتح کی مسکراہٹ تھی۔ خود بخود نکلی پڑتی تھی۔ کیشو کی مسکراہٹ اور طرح کی تھی۔ عورت ناکامیاب ہونے پر رو دیا کرتی ہے۔ مرد ایسی حالتوں میں مسکرایا کرتا ہے۔ لیکن یہ مسکراہٹ عورت کے آنسوؤں سے کہیں زیادہ معنی خیز ہے۔ یہ مسکراہٹ آدمی اپنے خون کو جلا کر پیدا کرتا ہے۔ اس میں زندگی کی حسرتوں کی خاک بھری ہوتی ہے۔

شاہو نے پہلے بات شروع کی۔ "تمہارا نام اخبار میں نہ دیکھ کر میں

تو دنگ رہ گیا۔ کسے خواب میں بھی خیال تھا کہ تم جیسا قابل آدمی بھی رہ جائے گا۔"

کیشو نے کچھ نہیں کہا۔ بیٹھ کرشا ہو کی طرف دیکھتا رہا۔

"اور میری؟ میری کسے اُمید تھی؟ لیکن سچ جانو۔ جب میں پرچے کرکے آیا تھا۔ مجھے تبھی اپنے پاس ہونے کا پورا یقین ہو گیا تھا۔ ایکنومکس کے پرچے کچھ خاص اچھے نہیں ہوئے تھے۔ مگر جو سوال مجھے نہیں بھی آتے آتے تھے۔ اُنہیں بھی میں کئے بغیر نہیں چھوڑ آیا۔ بلکہ اپنے دل سے جواب گھڑ کر جڑ دیئے۔ کئی بار ایسے بھی قسمت لڑ جایا کرتی ہے۔"

"بھئی سچ بات تو یہ ہے کہ زیادہ پڑھنے سے زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ آگے کتاب رکھے رہنے سے کیا فائدہ، جب اعصاب اتنے تن گئے ہوں کہ دماغ میں کوئی بات ٹھہرے ہی نہ؟ تم ہی بتاؤ کہ زیادہ پڑھنے سے تمہاری کیا حالت ہوئی۔ مجھے تم سے دلی ہمدردی ہے۔ یہ ممتحن بالکل گدھے ہوتے ہیں۔ پڑھائی کی قدر کرنا تو جانتے ہی نہیں۔ نہیں تو تمہارا نام فہرست میں سب سے اُوپر ہوتا۔"

"ایسے ہی ہوتا ہے!" کیشوراؤ آپٹے نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"انٹرویو میں بھی میں بہت حوصلے سے گیا تھا۔ میں نے کہا اگر نمبر نہیں دیتے تو جہنم میں جائیں۔ تم جیسے قابل لڑکوں میں ایک بڑا نقص ہوتا ہے کہ تم بہت ڈر ڈر کر بات کرتے ہو۔ اس سے اُن پر کیسے اثر پڑ سکتا ہے معاف کرنا۔ دیکھو تم نے پڑھ پڑھ کر کیا حال بنا لیا ہے کون تمہاری شخصیت کو بارُعب کہے گا۔ خیر مجھے پوری اُمید ہے تم اگلی بار ضرور کامیاب ہو جاؤ گے تمہارا بھی ایک اور موقعہ باقی ہے نہ؟"

"اور موقعہ نہیں ہے؟ اُف۔ تب تو بڑی بُری بات ہے مستقبل بڑا غیر یقینی ہے۔ خاص کر ہندوؤں کے لئے تو ان مقابلہ والے امتحانوں کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے؟ آ گئے تو پانچ سو روپیہ مہینہ سے تنخواہ شروع اور حکومت نہ آئے تو در در خوار ہو کر چالیس روپے کی کلرکی بھی نہیں ملتی۔ یہ ہمارے ایجوکیشنل سسٹم کا قصور ہے۔ ہمارے نوجوانوں کی وقت سے پہلے ہی روح سلب کر لی جاتی ہے۔ وہ وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو جاتے ہیں پچیس سال کی عمر تک تو وہ اندھیرے میں بھٹکتے رہتے ہیں۔ دو چار کو تو روشنی نظر آ جاتی ہے۔ باقی پچیس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے جسمانی اور دماغی کھنڈر بن کر رہ جاتے ہیں۔ اپنے سے اور دنیا سے بیزار۔ اب کیا ارادہ ہے؟"

"دیکھو۔ ابھی تک تو کچھ نہیں سوچا" کیشو نے اپنے دل پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں بھی دھیان رکھوں گا" شاہو ناتھ کا لیلکر نے کیشو کی طرف ہمدردی بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "شاید پتاجی کے دفتر میں ہی کوئی جگہ خالی ہو۔ پوچھوں گا اُن سے۔"

"مہربانی!" کیشو نے کسی نہ کسی طرح جواب دیا۔

کیشوراؤ آپٹے گھر کو واپس چلا۔ جیسی حالت میں کیشو اب تھا۔ اُس کا نقشہ کھینچنے کے لئے مصنف لوگ عام طور پر لکھا کرتے ہیں کہ اُس کے گال پچک گئے تھے۔ آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں۔ اور وہ لڑکھڑا کر چل رہا تھا۔ لیکن دراصل ایسا نہیں تھا۔ جب کیشوراؤ آپٹے اپنے گھر کو واپس جا رہا تھا تو وہ ثابت قدم تھا۔ اُس کے ہوش و حواس قائم دکھائی دیتے تھے۔ آنکھیں بھی اپنی بھلی تھیں۔ گال بھی پچکے ہوئے نہیں تھے۔ ظاہرا وہ بھی اور ہزاروں آدمیوں کی طرح تھا جو اِدھر سے اُدھر اپنے اپنے کام پر آ جا رہے تھے۔ شاید کچھ تھوڑا بہت فرق بھی ہو۔ کیونکہ وہ بار بار اپنے کو قابو میں رکھنے کے لئے اپنے دانتوں کو مضبوطی سے بھینچتا تھا اور بار بار مٹھیوں کو بند کرتا اور کھولتا تھا۔ وہ بالکل سیدھا ایک لائن میں چل رہا تھا۔ دو تین بار اُس کی سامنے سے آتے ہوئے لوگوں سے ٹکر بھی ہوئی۔ شاید اُس کی آنکھیں دیکھتے ہُوئے بھی نہیں دیکھ رہی تھیں۔

گھر پہنچ کر وہ اپنے چھجے پر جا کھڑا ہوا۔ اور نیچے سڑک پر گاڑیوں اور آدمیوں کے بہتے ہوئے دریا کو دیکھنے لگا۔ کتنی ہی دیر ایسے گزر گئی۔ گھر کے سب لوگ باہر اپنے کام پر گئے ہوئے تھے۔ نتیجے کے پتہ چل جانے کے بعد وہ کیشو کے پاس رہ کر اُس کا اور دل دکھانا نہیں چاہتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ تھوڑی دیر رو دھو کر کیشو اپنے دل کا غبار ہلکا کرے گا۔ ماں پھر پوجا کرنے چلی گئی تھی۔ شاید ایشور سے اس صدمے کو سہنے کے لئے طاقت مانگنے گئی ہو۔ ایک بہن باہر بچوں کو پڑھانے گئی ہوئی تھی۔ باقی دونوں سکول میں پڑھنے، دونوں بھائی بھی میونسپل سکول میں پڑھنے گئے تھے۔ باپ دفتر میں کاغذوں پر جھکا بیٹھا تھا۔

کیشوراؤ آپٹے کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا ٹکڑا پکڑا ہوا تھا۔ بغیر جانے ہی وہ اس کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے اُن کی گولیاں بنا کر نیچے پھینک رہا تھا۔ نیچے شور تھا۔ سبھی طرح کا۔ سب قسم کے لوگ تھے۔ مرہٹے، پنجابی، گجراتی، بنگالی۔ موٹریں تھیں۔ لاریاں تھیں۔ بسیں تھیں۔ ٹرامیں تھیں۔ ہر چیز بہے جا رہی تھی۔ زندگی کی کشمکش تھی۔ خدا کی

شان تھی اور اُوپر پیچھے پر کھڑا کیشو کاغذ کے ٹکڑوں کو سل سل کر کے نیچے پھینک رہا تھا۔

کیشو راؤ آپٹے سر کے بل نیچے پتھر کی پٹڑی پر آگرا۔ ایک دم لوگوں کا ایک بڑا گروہ اُس کے گرد اکٹھا ہو گیا۔ ایمبولینس کے لئے ٹیلیفون کیا گیا۔ نیچے کی دوکان والا جو کیشو کے گھر والوں کو تھوڑا بہت جانتا تھا اُس کی ماں کو مندر سے بلانے دوڑا۔ وہاں پوجا ہو رہی تھی۔ مندر کے گھنٹے پورے زور سے بج رہے تھے۔ اور ادھر لوگ کھڑے پوچھ رہے تھے۔ کیوں گرا؟ کیسے گرا؟ سر میں چکر آگیا تھا؟ کسی لڑکی سے محبت تھی؟ خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی؟ کسی کو معلوم نہیں۔ اُس وقت بھی معلوم نہیں تھا۔ اب بھی نہیں معلوم۔ اس کہانی کے لکھنے والے کو بھی نہیں معلوم!

دھرم پرکاش آنند

غزل

نہ ملا چین ہم کو دم بھر بھی ہائے کیا چیز ہے مقدّر بھی

ہو جراحت بقدرِ ذوقِ خلش توڑ دے دل میں نوکِ نشتر بھی

ہائے خوئے وفا کی مجبوری! میں نہ بھولا تجھے بھلا کر بھی

پھونک ڈالے جو کائنات کا دل ہے مری خاک میں وہ اخگر بھی

یہ نرالا ستم ہے فطرت کا زندگی تلخ تر بھی خوشتر بھی

غمِ ہستی کو بھول جا بلبل! دیکھ پامالئ گلِ تر بھی!

موت بھی ایک زندگی نکلی نہ چھُٹے کشمکش سے مر کر بھی

اُس سے چھوٹے ہیں عمر بھر کے لئے جو نہ چھُٹتا تھا ہم سے دم بھر بھی

بے جنوں لطفِ زندگی نہ رہا

اب بساطِ خرد کو تہہ کر بھی!

ظفر تاباں

ترقی پسند ادب اور کثرتِ تعبیرہا

روحانیت، واقعیت، رجائیت، قنوطیت ان سب کانٹوں سے ادبی مچھلیوں کا شکار کھیلا جا چکا ہے۔ آج کل ترقی پسند اور رجعت پسند کا چرچا ہے، لیکن حسبِ معمول ابھی تک ان الفاظ کی مکمل وضاحت نہیں ہوئی ہے جتنے منہ اتنی باتیں۔ مختلف اصحاب ترقی پسند ادب کے مختلف تصورات قائم کئے بیٹھے ہیں اور اس کی حمایت پر کمربستہ یا مخالفت میں شمشیر بدست نظر آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے ہوا سے لڑنے کی بجائے تحقیق اور انصاف سے کام لیں تو ہمیں معلوم ہو جائیگا کہ ترقی پسند ادب کوئی ایسا عجوبہ نہیں ہے نہ اس نظریہ میں کوئی ایسی انوکھی بات ہے جس سے جہاد کرنا مذہبی فریضہ تصور کیا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ سب سے پہلے ترقی پسند ادب کے مکمل اور مفصل معنی متعین کر لئے جائیں اور اس مختصر عرصہ کے لئے ہم اپنی مدح یا مذمت اٹھا رکھیں۔ ظاہرا طور پر ترقی پسند ادب سے ایسی تحریریں مراد ہیں جو (۱) سماجی ترقی میں مدد دیں۔ (۲) ادب کے فنی معیار پر پوری اتریں۔ لیکن سماجی ترقی کسے کہتے ہیں۔ سماجی ترقی کوئی غیر منقسم چیز نہیں ہے۔ سماجی زندگی کے کئی شعبے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ کسی ایک شعبہ کی ترقی کسی اور شعبہ کے زوال کا باعث ہو۔ ظاہر ہے کہ ادب کا تعلق زندگی کے اُس شعبہ سے ہے جسے کلچر یا تہذیب کہتے ہیں اور اگر ہم ادب سے سماجی ترقی میں مدد چاہیں تو اس ترقی سے ہمیں کلچر یا تہذیب کی ترقی مراد لینا چاہیئے۔ یہ کلچر بھی مبہم لفظ ہے۔ یوں سمجھئے کہ کلچر سے اقدار (Values) کا وہ نظام مراد ہے۔ جس کے مطابق کوئی سماج اپنی اجتماعی زندگی بسر کرتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری روزمرّہ دنیوی زندگی میں بعض خیالات یا اشیا اہم سمجھے جاتے ہیں۔ بعض غیر اہم۔ بعض کو ہم عزیز جانتے ہیں، اور بعض کو حقیر گردانتے ہیں۔ انہیں 'ترجیحات' کو اقدار کہتے ہیں۔ اور انہیں کے عملی اظہار سے ہماری سماجی زندگی کا نقشہ بنتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کلچر ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا۔ اور ایک مخصوص سماج کے بغیر اس کا وجود ذہن میں آنا محال ہے۔ کلچر ہماری زندگی کا ایک کونہ ہے اس لئے اس کی نوعیت، اس کی ترقی اور تنزل بھی انہیں قوتوں کے قبضہ میں ہے جو سماج پر حکمرانی کرتی ہیں۔ یہ سیاسی اور اقتصادی قوتیں ہیں۔ پس کسی ملک یا کسی قوم کا کلچر اُس کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر منحصر ہے اور اگر اس نظام میں کوئی تبدیلی واقع ہو تو اُس کے کلچر میں انقلاب لازمی ہو جاتا ہے۔ ذرا سے تفکر سے ہم معلوم کر سکتے ہیں کہ کلچر کی تاریخ بہت حد تک انہیں سیاسی اور انقلابات کی تاریخ ہے۔ جب بھی کسی ادارے کسی نظریئے یا کسی مادی شے کی سیاسی اور اقتصادی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو ہم اُسے عزیز رکھنا ترک کر دیتے ہیں۔ ہمارے نظام اقدار میں اُس کا رتبہ گر جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں ہمارے کلچر کی ترکیب بدل جاتی ہے۔ اب ہم ترقی پسند ادب کی تعریف کو ذرا وسعت دے سکتے ہیں اور یوں کہہ سکتے ہیں کہ ترقی پسند ادب ایسی تحریروں سے عبارت ہے جن سے سماج کے سیاسی اور اقتصادی ماحول میں ایسی ترغیبات پیدا ہوں جن سے کلچر ترقی کرے اور رجعت پسند ادب وہ تحریریں ہیں۔ جو ان رجحانات کی مخالفت کریں۔ اور جن کی وجہ سے کلچر کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا ہوں۔ اگلا سوال یہ ہے۔ کلچر کی ترقی سے ہمارا کیا مطلب ہے۔ کلچر کے دو پہلو ہیں۔ اُس کی نوعیت اور اُس کی وسعت، کلچر ادنیٰ اور اعلیٰ بھی ہو سکتا ہے۔ وسیع اور محدود بھی۔ پہلے اس کی نوعیت کو لیجئے۔ ہم نے کلچر کو ایک نظامِ اقدار قرار دیا تھا۔ کس نظام میں ان اقدار کو زیادہ معقول اور تسلی بخش کہا جا سکتا ہے؟ یہ مسئلہ ذرا تفصیل طلب ہے۔ بعض اقدار بنیادی اور اہم ہوتی ہیں بعض فروعی اور نسبتاً غیر اہم۔ اگر ان اقدار کو اُن کی اہمیت کے مطابق ترتیب دیا جائے۔ تو یہ نظام معقول ہوگا۔ اب اُن کی اہمیت جانچنے کے لئے کوئی معیار ہونا چاہیئے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ وہ اقدار بنیادی اور اہم ہیں۔ جن کے حصول پر دوسری بہت سی اقدار کے حصول کا انحصار ہے۔ مثلاً ہم پیٹ بھرنے

کو ایک خاص طرز کا کوٹ پہننے سے زیادہ ضروری خیال کرتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر پیٹ میں روٹی نہ ہو تو ہم بڑھیا سے بڑھیا کوٹ پہن کر بھی زندگی کا حظ نہیں اُٹھا سکیں گے۔ یہاں پہ اگر 'اقدار' اور 'اقدار' کی مختصر تشریح کر دی جائے تو یہ بات غالباً آسانی سے سمجھ میں آجائے گی۔ ہم ایک چیز کو 'قدر' کیوں دیتے ہیں۔ یا اُسے کسی دوسری چیز سے عزیز اور اہم کیوں سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ اس چیز کے حصول سے ہماری کسی خواہش یا کسی جذبے کی تسکین ہوتی ہے اور ایک دوسری چیز جسے کم عزیز رکھتے ہیں، یہ تسکین اسی حد تک بہم نہیں پہنچا سکتی۔ ہماری ضروریات اور خواہشات یکساں طور پہ اہم نہیں ہوتیں، اُن کی تسکین بھی یکساں ضروری نہیں ہوتی اس لئے جو چیزیں ان خواہشات کو پورا کرتی ہیں اُن کی اقدار میں بھی فرق ہوتا ہے بنیادی اور اہم اقدار وہ اقدار ہیں جو بنیادی اور اہم خواہشات کو تسکین دیتی ہیں اور بنیادی اور اہم خواہشات وہ ہیں جن کی تسکین سے اور بہت سی خواہشات کی تسکین وابستہ ہے۔ پس بہتر اور اعلیٰ نظامِ اقدار وہ ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے انسانی فطرت کی زیادہ سے زیادہ تسکین ممکن ہو اور کم سے کم خواہشات کا خون کرنا پڑے۔

کلچر کی ترقی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ سماجی اقدار کی ترتیب میں مناسب تبدیلیاں کی جائیں۔ اور ترقی پسند ادب وہ ہے جو صحیح اقدار کا پرچار کرے۔ ہم ضمناً کہہ چکے ہیں کہ یہ اقدار اُس وقت تک کلچر کا حصّہ نہیں بن سکتیں جب تک ان پہ اجتماعی طور پر عمل نہ کیا جائے اور ایسا عمل کرنا اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک سیاسی اور اقتصادی ماحول کو ان کے مطابق نہ بنایا جائے۔

رہا کلچر کی وسعت کا سوال۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر وہ سماج جس میں دولت اور ذرائع پیداوار کسی محدود طبقے کے ہاتھ میں ہوں زندگی کی باقی آسائشوں کی طرح اپنا مروّجہ کلچر بھی اسی ایک طبقے کے حوالے کر دیتی ہے اور باقی ماندہ طبقوں کو اس کلچر میں ذرا بھی حصہ نہیں ملتا۔ مثلاً جب ہم یونانی کلچر، ایرانی کلچر یا کسی اور قوم کے کلچر کا نام لیتے ہیں تو دراصل ہماری مراد اس قوم کے ایک نہایت ہی محدود خوشحال طبقے کے کلچر سے ہوتی ہے لیکن کیا ہم کسی ایسی قوم کو مہذب یا 'کلچر یافتہ' کہہ سکتے ہیں جس کی اکثریت کلچر سے محروم ہو۔ کیا ہم کسی ایسے کلچر کو مثالی قرار دے سکتے ہیں جو اس اکثریت میں نفوذ نہ کر سکے۔ وہ کلچر جو چند نفوس تک محدود رہے بنیادی طور پر ناقص ہے۔ مثالی کلچر کے لئے لازمی ہے کہ وہ ایک خوبصورت حاشیئے کا کام دینے کی بجائے سماج کی تار تار میں بُنا جا سکے۔ چنانچہ کلچر کی ترقی کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اُسے اقلیت کے چنگل سے نکال کر اکثریت کی ملکیت قرار دیا جائے۔ اس کے لئے ایک دُہرے عمل کی ضرورت ہے۔

(۱) کلچر کی نوعیت بدلی جائے تاکہ وہ عوام کی زندگی کا جزو بن سکے۔

(۲) عوام کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے تاکہ وہ اس کلچر کو قبول کر سکیں۔

اب تک جو کچھ کہا جا چکا ہے۔ اُس کا خلاصہ یوں ہو سکتا ہے۔

ا۔ ترقی پسند ادب وہ ہے جو کلچر کی ترقی میں مدد دے۔ کلچر کی ترقی کا یہ مطلب ہے کہ (۱) سماجی اقدار کی ترتیب موزوں کی جائے اور صحیح اقدار کا پرچار کیا جائے (۲) ان اقدار کو عوام کے لئے اجتماعی طور پہ سہل الحصول بنایا جائے۔

ب۔ یہ دونوں باتیں اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک سماجی نظام کی بنیادی طور پر اصلاح نہ کی جائے۔ پس ترقی پسند ادب کا پہلا اور آخری مقصد بنیادی سماجی مسائل کی طرف توجہ دلانا ہے (ان مسائل میں سے غالباً طبقاتی کشمکش اور دنیوی آسائشوں کی تقسیم سب سے زیادہ اہم ہیں) اور سماج میں ایسے فکری، جذباتی یا عملی رجحانات پیدا کرنا ہے جن سے ان مسائل کا حل نسبتہً آسان ہو جائے۔

اب یہاں سے اختلافات شروع ہوتے ہیں۔ ہمارے بزرگوار فرماتے ہیں کہ آرٹ، کلچر، ادب یہ سب خودرو پودے ہیں اور دین کی طرح ان میں جبر و اکراہ قطعاً جائز نہیں۔ ان میں رجحانات پیدا ہوتے ہیں۔ پیدا کئے نہیں جاتے۔ مان لیا صاحب، رجحانات پیدا ہوتے ہیں لیکن آخر کیسے؟ یہی نہ کہ کسی بڑے ادیب یا چند ادیبوں نے خاص حالات سے متأثر ہو کر خاص ڈھنگ سے کچھ لکھا اور دوسرے لکھنے والے اُن کی پیروی کرنے لگے۔ رجحان پیدا ہو گیا۔ لیکن کیا ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس طرز پہ اوّلیں لکھنے والے یا لکھنے والوں نے یہ رجحان پیدا کیا۔ شاید آپ یہ فرمائیں کہ اُنہوں نے کیا نہیں، اُن سے ہو گیا۔ لیکن میں ادیب کو اتنا حقیر نہیں سمجھتا۔ وہ غیر شعوری جانور نہیں ہے۔ یہ بھی نہیں کہ لکھتے وقت کوئی سماوی روح اُس میں حلول کر جائے اور اُسے طوعاً و کرہاً اس کی اطاعت کرنا پڑے۔ ایک اچھے ادیب کو اپنے ارادے اور اپنی قوتِ تخلیق پہ یقیناً اتنی قدرت ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ لکھے اپنے فلسفے اور اپنے نظریئے کے مطابق لکھے۔ اگر اس نظریئے میں خلوص اور جان ہے تو اس سے ایک نئے رجحان کی تخلیق بھی ناممکن نہیں۔ پس ادب میں رجحانات پیدا کرنا اور ادب

کے ذریعہ سے سماج میں رجحانات پیدا کرنا اتنی مہمل اور لایعنی بات نہیں جتنی ہم میں سے بعض حضرات سمجھتے ہیں۔ ادب کوئی بے جان کل نہیں ہے جس کے عمل پر ہمیں اختیار نہ ہو۔ انسان کے ہاتھ میں اس کی حیثیت چکنی مٹی سے زیادہ نہیں اور اس کے لئے موزوں سانچے انتخاب کرنا انسان ہی کا کام ہے۔ لیکن اس ساری بحث سے یہ پتہ چلتا ہے کہ میں ادب سے پراپیگنڈا کا نیچ کام لینا چاہتا ہوں۔ کیا ادب کا مقصد پراپیگنڈا ہے؟ جی ہاں، قطعی! ادب کا جو نمونہ آپ سے کوئی تجربہ، کوئی نظریہ، کوئی حقیقت منوا نہیں لیتا (ایک لمحہ کے لئے ہی سہی) وہ بحیثیت ادب کے خاک بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ ادیب نے کچھ دیکھا ہے۔ کچھ محسوس کیا، کچھ سوچا ہے، وہ کوشش کرتا ہے کہ آپ بھی وہی کچھ دیکھیں، وہی کچھ محسوس کریں، وہی کچھ سوچیں۔ اگر یہ پراپیگنڈا نہیں ہے تو جانے پراپیگنڈا کسے کہتے ہیں۔ ترقی پسند ادب اور دوسری اقسام کے ادب میں یہ فرق نہیں ہے کہ یہ پروپیگنڈا کرتا ہے اور وہ نہیں کرتا۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک پراپیگنڈا صحیح اور مفید ہے۔ دوسرا گمراہ کن اور مضر یا غیر مفید۔ تو کیا ادب اور پراپیگنڈا میں کوئی فرق نہیں ہے؟ پھر ہم سیاسی تقریروں اور صحافتی اداریوں کو ادب کیوں نہیں کہتے۔ اس لئے نہیں کہتے کہ ان میں ادب کی فنی خوبیاں نہیں پائی جاتیں۔ ان میں بنفسہٖ کوئی ایسی چیز نہیں ہے۔ جو انہیں ادب بننے سے روکے (اور بعض اوقات سیاسی تقریریں اور صحافتی مضامین ادب کا بہترین نمونہ ہوتے ہیں) لیکن لکھنے والوں یا بولنے والوں کی بے احتیاطی، خامیٔ اظہار یا قلتِ خلوص کی وجہ سے انہیں ادبی حیثیت نصیب نہیں ہوئی۔ اسی لئے میں نے ترقی پسند ادب کی تعریف میں یہ بات شامل کر لی تھی کہ ترقی پسند ادب صرف ترقی پسند ہی نہیں ادب بھی ہے۔

شاید اب کوئی صاحب یہ اعتراض کریں کہ میں ادب کے دور از کار اور غیر متعلق مقاصد سے بحث کر رہا ہوں۔ ادب کا مقصد محض انسانی تجربات کی کامیاب ترجمانی ہے۔ یہ تجربات خارجی ماحول کے زیر اثر لکھنے والے کے ذہن پر منعکس ہوتے ہیں۔ لکھنے والے کو چاہیئے کہ انہیں من و عن بیان کر دے اور اس طریقے سے اپنے ماحول کا منظر ہو بہو ہمارے سامنے پیش کرے۔ ان تجربات کی نوعیت کیا ہے اور ان سے ماحول کے کونسے پہلو پر روشنی پڑتی ہے، ہمیں اس سے سروکار نہیں ہے۔ مثلاً اگر وہ گھریلو زندگی کا ایک معمولی سا واقعہ نہایت خوبی سے بیان کرتا ہے تو اُسے کیا پڑی ہے کہ ترقی پسند مصنفین کی طرح گلے سڑے مزدوروں کا رونا رویا کرے۔ مجھے تسلیم ہے کہ ادب کا فوری مقصد صرف تجربات کی ترجمانی کرنا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ یہ تجربات خارجی ماحول کے آئینہ دار ہوتے ہیں اور میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ادبی نقطۂ نظر سے ایک حقیقی تجربہ جھوٹے اور من گھڑت تجربات سے زیادہ قابلِ قدر ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ زندگی کا ہر لمحہ کسی نہ کسی تجربے کا حامل ہے۔ آپ ان سب کو تو بیان کر نہیں سکتے۔ آپ کو لازماً ان میں انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ان میں سے بعض تجربات اہم ہوتے ہیں بعض غیر اہم۔ اگر ہم اپنے تجربات کو خارجی ماحول کا آئینہ دار مان لیں تو ان تجربات کی اہمیت خارجی ماحول کے اُن پہلوؤں کے مطابق ہوگی۔ جن کی آئینہ داری مقصود ہو۔ مثلاً ہمارے بہت سے ذاتی گھریلو تجربات اُن تجربات سے کم اہمیت رکھتے ہیں۔ جن کا سماج کی اجتماعی زندگی سے تعلق ہے۔ ایک ترقی پسند ادیب اُن اہم تجربات کو ترجیح دیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کے تجزیہ سے ترقی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اُس کے موضوعات پر کوئی قید عائد کر دی گئی ہے۔ وہ ذاتی اور اجتماعی، بنیادی اور فروعی، اہم اور غیر اہم سبھی قسم کے تجربات بیان کر سکتا ہے۔ بشرطیکہ وہ ان میں کوئی ترتیب ملحوظ رکھے اور پڑھنے والے ان کی اہمیت اور غیر اہمیت کا اندازہ کر سکیں۔ تجربات تخلیق نہیں کئے جا سکتے لیکن اُن میں انتخاب تو کیا جا سکتا ہے اور ہم ترقی پسند ادیب سے صرف اتنا ہی تقاضا کرتے ہیں کہ اُس کا انتخاب گمراہ کن نہ ہو تاکہ اُس کے پڑھنے والے زندگی کے اہم مسائل کو بھلا کر غیر ضروری تفصیلات میں اُلجھ کر نہ رہ جائیں۔

لیکن کیا یہ کافی نہیں ہے کہ خارجی ماحول پہ تنقید کرنے کی بجائے اُس کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا جائے۔ یہ کافی شاید ہو ممکن نہیں ہے۔ کسی منظر کی ہو بہو تصویر تو کیمرہ بھی نہیں لے سکتا۔ بعض چیزیں کیمرہ کے قریب ہوتی ہیں۔ بعض ذرا فاصلے پر اس لئے فوٹوگراف میں ان کا تناسب زندگی سے مختلف ہو جاتا ہے۔ ایک اچھا فوٹوگرافر بھی اپنے مواد کو ترتیب دیتا ہے کسی منظر کی تصویر لیتے وقت بعض نقوش کو نمایاں کرتا ہے، بعض کو دبا دیتا ہے۔ تو کیا ادب میں یہ عمل لازمی نہیں؟ یہ صحیح ہے کہ ادیب کو محض تجربات کے اظہار سے سروکار رکھنا چاہیئے۔ لیکن ایک ہی تجربہ کئی طرح سے بیان ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک ٹی پارٹی میں محض رومانی چھیڑ چھاڑ بھی دکھائی جا سکتی ہے، کندۂ ناتراش امراء کی ذہنیت کا نقشہ بھی پیش کیا جا سکتا ہے، ہمارے سماجی تعلقات کا کھوکھلا پن بھی ظاہر کیا جا سکتا ہے، ماحول کو اس طرح پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہ آپ اُسے قبول

کرلیں اور اس طرح بھی کہ آپ اُس کے خلاف بغاوت کریں۔ ترقی پسند ادیب اگر اپنے ماحول کو تسلی بخش سمجھتا ہے تو پہلا پیرایہ اختیار کرتا ہے۔ غیر تسلی بخش خیال کرتا ہے تو دوسرا۔ وہ صرف نقاش ہی نہیں نقاد بھی ہے اگرچہ یہ ضروری نہیں کہ تنقید ہمیشہ جلی حروف میں کی جائے۔ تنقید بین السطور بھی ہو سکتی ہے لیکن اتنی بین السطور بھی نہیں کہ خوردبین کے بغیر نظر نہ آئے۔ ایک افسانے میں محض واقعات کے انتخاب اور ترتیب اور کرداروں کی تفسیر و تجزیہ سے تنقید کا کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس میں سیاسیات اور اقتصادیات پہ مستقل لکچر بھی شامل کئے جائیں۔

اب شاید ہم یہ سمجھ سکیں کہ ترقی پسند مصنفین زیادہ تر مزدوروں اور کسانوں کی کہانیاں کیوں لکھتے ہیں۔ اور ان میں اصلاحی رنگ پیدا کرنے کی کوشش سے کیا مقصود ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے مزدوروں اور کسانوں کی کہانیاں لکھنے سے ترقی پسند مصنفین کو نہ نمائش اور فیشن پرستی مطلوب ہے نہ مغرب کے چند ادیبوں کی اندھا دھند تقلید سے واسطہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ مزدوروں اور کسانوں کے مسائل ہماری سماج کے بنیادی مسائل ہیں اور انہیں حل کئے بغیر ہماری سماج آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اُن کا فرض ان مسائل کو حل کرنا نہیں محض ان کی طرف توجہ دلانا ہے تاکہ کم از کم ان مسائل کو حل کرنے کی خواہش پیدا ہو جائے۔ جیسے کہ میں نے ابھی عرض کیا تھا جب بھی آپ کوئی مسئلہ کسی خاص نقطۂ نظر سے پیش کرینگے تو اس میں اصلاحی اور تنقیدی رنگ کا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے۔ یہی بات ان مصنفین کی تحریروں میں بھی ہے شاید ان لکھنے والوں کو اپنے فن میں ابھی اتنی مہارت حاصل نہیں ہوئی کہ وہ آپ کے بلند ادبی معیار پہ پورے اُتر سکیں لیکن اس صورت میں آپ انہیں ناکام کہہ سکتے ہیں۔ قابلِ نفرین اور موجبِ حقارت تو نہیں ٹھہرا سکتے۔ ادبی تجربات کو پنپتے دیر لگتی ہے۔ اگر آپ کو اس تجربے کی سماجی افادیت سے انکار نہیں تو آپ کو اس کی ادبی تکمیل کا انتظار بھی کرنا چاہئے۔

رہا یہ اعتراض کہ مزدوروں کی کہانیاں لکھنے والے مزدور نہیں ہیں۔ یا خوشحال طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کی آواز مزدوروں تک نہیں پہنچتی اور جب تک وہ مزدوروں کی سی زندگی بسر نہ کریں۔ وہ مزدور کے مسائل کو سمجھ نہیں سکتے، تو اس کے متعلق میں صرف اس قدر عرض کروں گا۔ کہ مزدوروں کو تو ہم نے اس قابل رکھا ہی نہیں کہ وہ اپنے متعلق کچھ لکھ سکیں۔ مزدوروں کے متعلق جو بھی لکھے گا بہر صورت تعلیم یافتہ یا خوشحال طبقہ میں سے ہوگا۔ اور اگر آپ یہ نہیں چاہتے ہیں تو آپ کا مطلب یہ ہے کہ ہماری سماج کے ایک بنیادی ظلم کے متعلق کوئی شخص کچھ کہنے کی جرأت نہ کرے۔ مزدوروں کی رہنمائی بہر صورت خوشحال طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو کرنا پڑتی ہے۔ یہی نہیں اگر وہ چاہیں تو مزدوروں کے مسائل بھی مزدوروں سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ آخر مارکس، اینگلز، لینن مزدور تو نہیں تھے۔ نہ اُنہوں نے کسی کارخانہ میں ایک دن بھی کام کیا۔ اگر یہ استدلال کیا جائے کہ مزدوروں کے متعلق مزدوری کئے بغیر کوئی ادب تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ تو یہ ماننا بھی لازم آتا ہے کہ شیکسپیئر کو چھٹی اور ساتویں صدی کے متعلق ڈرامے لکھنے سے پہلے اپنی تاریخ پیدائش بدلوا لینا چاہئے تھی۔ یہ صحیح ہے کہ اگر ہم مزدوروں میں رہیں۔ اُن سے تعلقات رکھیں تو ہم اُن کے مسائل کو بہتر سمجھ سکیں گے۔ لیکن اگر ہمیں قوتِ احساس۔ قوتِ تخیل اور قوتِ اظہار میں سے تھوڑا سا حصہ ملا ہے تو ہم تھوڑی بہت کامیابی کے ساتھ یہی کام یوں بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ترقی پسند مصنفین کی آواز مزدوروں تک نہیں پہنچتی تو نہ پہنچے۔ مجھ تک اور آپ تک تو پہنچتی ہے ان کی تحریروں سے اتنا بھی ہو جائے کہ ہم اور آپ ان مسائل پہ غور کرنا شروع کر دیں تو یہی غنیمت ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ صرف مزدور کی جنگ نہیں ہے ہم سب کی جنگ ہے۔ ہمارے دوست دشمن بھی مشترکہ ہیں۔ مزدور اور کسان کی بہبودی سماج کی اجتماعی بہبودی کے مترادف ہے۔ کیا ہم بھی اسی سماجی اجتماع کے ایک فرد نہیں ہیں؟

فیض احمد فیض

دل لگی

تنگ آ گئے زندگی کے مسلسل فریب سے
اک بے مآل و حوصلہ فرسا شکیب سے

بے کیف واقعات کے خاموش دَور سے
امید و آرزو کے خزاں بار طور سے

ماحول پر نگاہِ المناک ڈال کر
ہر نقطۂ نظر سے فضا دیکھ بھال کر

حالاتِ ناگوار کا پہچان کر مزاج
بے رحم روزگار کا پہچان کر مزاج

ہنس کر گذر چلا تھا گمانِ حیات سے
ہونے لگا تھا میں متعارف نجات سے

لینے چلا تھا عالمِ اضداد کی خبر
چکھنے لگا تھا زہر سے تریاق کا اثر

لب کے قریب دیکھ کے ناگاہ جامِ زہر
اک ماہ وش نے روک دیا ذوقِ خامِ زہر

ہنس کر کہا کہ میں ہوں تری مشعلِ حیات
آ دیکھ! ہیں بھی سامنے ظلماتِ حادثات!

میرے لبوں کا نام ہے میخانۂ خوشی
میری نظر کو پیار سے کہتے ہیں زندگی

میری دراز زلف ہے جس کی بہار سے
ہیں روئے کائنات پہ لرزاں خمار سے

میں ہوں سفینہ راں! تو سفینہ تو لے کے آ
جینے کا اک ذرا سا قرینہ تو لے کے آ

پاتے ہی شہ نگاہِ حرارت طراز کی
میں نے معاملات سے پھر ساز باز کی

جوشِ جنوں میں وقت سے آگے نکل گیا
کتنے ہی حادثات کا سینہ کچل گیا

حالاتِ واژگوں کو موافق بنا دیا
نبضِ زماں کو حسبِ تمنا چلا دیا

پاتے ہی اپنے پاؤں پہ سرِ انبساط کا
ملتے ہی اختیار جہانِ نشاط کا

اُس ماہ وش کو میں نے دیا عیش کا پیام
کی التجا کہ آؤ پئیں زندگی کے جام

میرے پیامِ شوق کو سن کر وہ مہ جبیں
کہنے لگی بہ دلکشیٔ سحر آفریں

سچ مچ گیا تھا تھوڑا ہی وعدہ نباہ کا
صرف اک مذاق تھا مرے ذوقِ نگاہ کا

بروقت دل لگی تھی کہ اک کام کر گئی
اک برمحل نگاہ تو تھی، نام کر گئی

میں نے بھی یوں خطاب کیا اس کے بے دھڑک
اے آرزو کے غنچۂ نورستہ کی مہک

میں بھی تو جامِ زہر کا منہ تک رہا تھا بس
پینا تو خیر کیا تھا یونہی دیکھتا تھا بس!

میرا معاملہ بھی فقط اک مذاق تھا،
مرنے کا توبہ توبہ! کسے اشتیاق تھا!

عبدالحمید عدم

سُکھ سنچارک کمپنی متھرا
ہر قسم کی آیورویدک ادویات بنانے کا کارخانہ
سُکھ سنچارک چیون پراش
سُدھا سندھو
کف کھانسی ہیضہ۔ دمہ۔ دردِ شکم سنگرہنی
پیچش۔ قے۔ دست وغیرہ ایسے امراض کی
بغیر انوپان کی گھریلو دوا۔ قیمت فی
شیشی آٹھ آنے
بال سُدھا
کوئی دوا نہ خریدیئے جب تک سُکھ سنچارک کمپنی متھرا کا نام نہ ہو
قواعد ایجنسی اور فہرست مفت طلب فرمایئے

چھوکری کی لُوٹ

بچپن کی بہت سی باتوں کے علاوہ پرسادی رام کو چھوکری کی لوٹ کی رسم اچھی طرح یاد تھی۔

دو بیاہے ہُوئے بھائیوں کا ساری عمر ایک ہی گھر میں رہنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اُن میں سے ایک تو صبح شام گھی شکر میں ملا کر کھانا پسند کرے اور دوسرا اپنی حسین بیوی سے ایسی چھوٹی چھوٹی باتیں سن کر کانوں کا کچا بنے۔ مگر محلہ شہشوانی ٹولہ میں پرسادی کے پتا چمبا رام اور تایا ٹھنڈی رام جگت گورو اپنے باپ دادا کے مکان میں جنم سے اکٹھے رہتے آئے تھے اور اس میل ہی کی وجہ سے اُن کے صحن اور دوارے میں برکت تھی۔ اور وہاں آم کے ایک بڑے پیڑ کے ساتھ کھرنی اور کمرخ کے دو چھوٹے پیڑ بھی اُگ رہے تھے جن کے پتوں سے ملی جُلی ہوئی گکروندہ کی بیل بازار میں چھدالی کی دوکان تک پہنچ گئی تھی اور دیس بدیس سے آئے ہوئے مسافروں کو ٹھنڈی میٹھی چھاؤں دیتی تھی۔

پرماتما کا کرنا، پرسادی کی پیدائش سے کچھ عرصہ بعد چمبا رام جی "سورگ میں چلے گئے۔" مگر شری جگت گورو نے بھاوج کو بہن کر کے جانا اور پرسادی کو اپنا بیٹا ہی سمجھا۔ اور تائی اماں بھی تو کچھ ایسی بُری نہ تھیں اساڑھی اور ساونی کے دو موقعوں کے سوا جبکہ بٹوارہ گھر میں آتا تھا۔ وہ پرسادی کی ماں سے بہت کھُلے ماتھے سے بولتیں چالتیں۔ بس یہی معلوم ہوتا جیسے دونوں ماں جائی بہنیں ہیں۔ دیورانی جیٹھانی نہیں۔ اس اتفاق کی وجہ سے صحن کی برکت ویسے ہی رہی۔ صحن میں چار پانچ برس سے لے کر بیس اکیس برس تک کی لڑکیاں سہیلے، گھوڑی، بدھائی، بچھوڑے اور طرح طرح کے گیت گاتیں۔ چرخے کاتتیں اور سوت کی بڑی بڑی انٹیاں مینڈھیوں کی طرح گوندھ کر کتان بننے کے لئے رحیمو جُلاہے کے ہاں بھیج دیتیں۔ کبھی کبھی ساون کی کسی چاندنی رات میں رت جگا کاٹتیں اور ساون کی رات کا پُرکیف رت جگا اُس وقت تو پرسادی کے ایسے چھوکرے کو میوے، ناریل، بادام اور گلگلے کھلانے کا بڑا مزا رہتا۔

پرسادی کی تایا زاد بہن رتنی پرسادی سے بارہ تیرہ برس بڑی تھی۔ عمر کے اتنے بڑے فرق کا پرسادی کو بہت گِلہ تھا اور گِلہ تھا بھی بالکل بجا۔ سچ پوچھو تو رتنی پل بھر بھی پرسادی کے ساتھ نہیں کھیلتی تھی۔ ہاں! سردیوں میں سوتی ضرور تھی اور جب تک وہ پرسادی کے ساتھ سو کر اُس کے بستر کو گرم نہ کر دیتی۔ پرسادی مچلتا رہتا ——

"رتنی آؤ . . . . آؤ نا رتنی . . . . مجھے بہت سردی لگ رہی ہے۔"

رتنی بہت جھنجھلائی ہوئی ہوتی تو چیخ اُٹھتی۔ "ارے سوتا کیوں نہیں مونڈی کاٹے . . . . میں کوئی انگیٹھی تھوڑے ہی ہوں۔"

یہ تو ہوئی نارات کی بات۔ دن کو رتنی کسی اپنی ہی دُھن میں مگن رہتی ہولے ہولے گاتی رہتی۔ "میٹھے لاگے وا کے بول . . . . !"

آخر کوئی تو پرسادی کے ساتھ کھیلنے والا بھی چاہیئے تھا۔ جب وہ بالکل اکیلا ہوتا تو اُسے کچھ کچھ سمجھ میں آتا کہ "سورگ میں چلے جانے" کا کیا مطلب ہے۔ وہاں لوگ اکیلے رہتے ہیں۔ مگر اُنہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوتی جب وہ سوچتے سوچتے تھک جاتا۔ تو اُٹھتا اور دوڑا دوڑا ماتارانی کے جوہڑ پر پہنچ جاتا۔ تمام کپڑے اُتار کر پانی کے اندر سے بہت سی چکنی مٹی لاتا اور گھر پہنچ کر رتنی کو دیتا کہ وہ اُسے اُس کا ایک مُنّا بنا دے۔ بہت سندر چھیل چھبیلا مٹی کا مُنّا . . . . اور وہ تمام دن مُنّے کے ساتھ کھیلتا اور اُدھم مچاتا رہے گا۔ اور رتنی کو تنگ کرنا چھوڑ دیگا۔ رتنی کہتی "دیکھ پرسُو . . . . میں تب بناؤں گی تیرے لئے مُنّا . . . . جو تو کوٹھا پھاند کر ملو کنہیا کے پاس جائے اور اُن سے کہہ دے کہ جب تارے آنکھیں جھپکنے لگیں۔ تو وہ رتنی بہن سے چھدامی کی دوکان پر بیل کے نیچے ملیں۔"

ملو کنہیا کے مکان کی ڈھلوان سی چھت پر رینگ کر چڑھنا کوئی کھیل تھوڑا ہی تھا۔ جب تک رتنی خود کھڑی ہو کر پیٹھ کا سہارا نہ دے وہ ملو کنہیا کے مکان کی منڈیر پر پہنچ ہی نہیں سکتا تھا۔ لاکھ آسرا دینے پر بھی اُس کی کہنیوں اور گھٹنوں پر کی کھال اُتر جاتی اور اتنی کڑی تپسیا کے بعد جب پرسادی لوٹتا۔

تو دیکھتا کہ رتنی نے کوئی منّا وناّ نہیں بنایا بلکہ بوڑھی جمعدارنی کی طرح پُھلکاری سے منہ چھپائے وہ بالکل فضول اور بے رس سا گیت گا رہی ہے۔ ۔ ۔ میٹھے لاگے وا کے بول ۔ ۔ ۔ !

اُس وقت پرسادی کی بہت بُری حالت ہوتی۔ وہ چاہتا کہ وہ بھی " سورگ میں چلا جائے " مگر سورگ جانے سے پہلے بہت ہی پھونک کر بخار چڑھتا ہے ہڈیاں ٹوٹتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کوئی کالے رنگ کا بڑا سا بھینسا سینگ مارنے دوڑا آ رہا ہے۔ آدمی ڈر ڈر کر چیخیں مارتا اور کانپتا ہے اور پرسادی کو یہ باتیں تمہیدًا منظور نہ تھیں۔ بیٹھے بٹھائے پل بھر میں سورگ باش ہو جاتا تو کسی بڑے بھاگوان ہی کو ملتا ہے۔ تب وہ روتا روتا ماں کے پاس جاتا اور کہتا۔

" چندو کے گھر مُنّا ہوتا ہے ۔ ۔ ۔ بیرو کے گھر بھی مُنّا ہوا ہے ماں ۔ ۔ ۔ ہمارے گھر کیوں نہیں ہوتا مُنّا ۔ ۔ ۔ تم ایسا جتن کرو ماں ہمارے بھی ایک مُنّا تو ہو جائے ! "

پرسادی کی ماں ایک بہت گہری اور ٹھنڈی سانس لیتی۔ چھنیک چھنیک کرلوہے کی ایک کونڈی میں لال لال مرچیں کوٹتی جاتی۔ پھر نہ جانے اُس کے جی میں کیا آتا کہ پرسادی کی طرح بلک بلک کر رونے لگتی۔ پھر ایکا ایکی رونا دھونا چھوڑ کر جلد جلد مونڈھے پر اوڑھنی کو چھیلنے کے لئے رگڑنا شروع کر دیتی۔ اور جب ننھا پرسادی ہٹ کئے ہی جاتا تو وہ کہتی ۔ ۔ ۔

" پرسو بیٹا! یُوں نہیں کہا کرتے ۔ ۔ ۔ تمہارے پتا لایا کرتے تھے مُنّا ۔ ۔ ۔ وہ اب رُوٹھ گئے ہیں "

" تو تایا سے کہو نا ۔ ۔ ۔ وہی لا دیں ہمیں مُنّا ۔ ۔ ۔ "

" وہ مُنّا اپنے ہی گھر لائیں گے ۔ ۔ ۔ کوئی کسی کو منّا لا کر نہیں دیتا جاؤ ۔ ۔ ۔ کھیلو ۔ ۔ ۔ ایسی باتیں مت کیا کرو۔ ہاں ! "

پرسادی کا کیا تھا وہ تو یہ چاہتا تھا کہ ماں کوئی جتن کرے۔ اُسے منّا کہیں سے لا دے۔ ہائے ! اُسے تو کوئی مٹی کا مُنّا بھی بنا کر نہیں دیتا تھا۔

ساون کی شام کے سنہری جُھٹ پٹے میں وہ برکت والا صحن ہر عمر کی چھوکریوں، رنگ رنگیلے چرخوں اور طرح طرح کی ٹوکریوں سے بھرنا شروع ہو جاتا۔ بڑی چھوکریاں اور چھوٹی، پتلی اور موٹی، گوری اور کالی غرضکہ ہر قسم کی چھوکریاں گلگدندے کی بیل کی اوٹ میں آ بیٹھتیں۔ بڑی لڑکیاں چھوٹی لڑکیوں کو علیٰحدہ کھرنی کے نیچے بٹھا دیتیں۔ وہ سوچتیں کہ ان کل کی بچیوں کو چنری لینے کا تو ہوش نہیں۔ اور وہ اُن کے گانے کو بھی نہیں سمجھ سکتیں صرف مُنہ اُٹھائے ٹک ٹک اُن کے چہروں کی طرف دیکھنے لگ جاتی ہیں۔ پھر شرم آنے لگتی ہے۔ مُنہ لال لال ہو جاتا ہے اور گانا گلے میں اٹک جاتا ہے اور وہ تکلوں پر دھاگے کی لمبی لمبی تاریں اُٹھاتی ہوئی ٹوکری میں اٹی کے نیچے سے بُھنے ہوئے چنے اور گُڑ نکال کر کھاتیں۔ تبھی تو وہ رتنی کی طرح گرم گرم تھیں ! ۔ ۔ ۔ اور اُن کے چھوٹے بھائی سردیوں میں اُن کے ساتھ سونے کے لئے مچلتے تھے۔

رام کلی دو دھے الاپتی اور سر ہلاتی ہوئی اپنا سر کرگدندے میں چھپا لیتی دوسری انمل بولتی ہوئی جھومنے لگتی اور جب آم پر کوئل کُوکُو کرتی۔ تو بسنت، مدن اور رتی یا برہ کے گیت شروع ہو جاتے۔ اور کبھی کبھار کوئی لڑکی ٹھنڈا سانس لیتی۔ جانے بڑا ہی دُکھ پہنچ رہا ہو۔

اسی لئے تو بڑی لڑکیاں چھوٹی لڑکیوں کو علیٰحدہ کھرنی کے نیچے بٹھاتی تھیں۔ پرسادی نے چھوٹی لڑکیوں کو اس قسم کا دُکھ پہنچتے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ تو چُپ چاپ کھرنی اور کرنج کے ملے جُلے پتوں کے نیچے بیٹھ کر پہیلیاں کہتیں۔ اُنہیں اور خود پرسادی کو وہی سیدھی سادھی پہیلیاں بہت بھاتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ اُن کی اپنی زندگی ابھی ایک سادہ سی پہیلی تھی۔ اُن پر ابھی وہ راز نہیں کُھلا تھا۔ جو رام کلی، رتنی، بھیموا اور دھیرا پر آشکار ہو چکا تھا 'میٹھے لاگے وا کے بول' ۔ ۔ ۔ اس بن دو جا اور نہ کوئے، اور یہی چند ایک بول تو بڑی لڑکیوں کو پیارے تھے۔ بڑی عورتیں بھی کبھی کبھی دو سخنے اور انملے سُنتیں۔ تو اُنہیں اپنے بچپن کے رت جگے اور عیش بہاریں یاد آ جاتیں۔

ہاں ! ایک بات پرسادی نے شدت سے محسوس کی۔ اور وہ یہ تھی کہ اُن بڑی لڑکیوں میں آئے دن تبدیلی ہو جاتی۔ جیسے بھری دنیا میں کبھی دائیں یا بائیں سے آواز آتی ہے کہ فلاں آدمی سرگباش ہو گیا۔ اس طرح اُن میں سے بھی آواز آتی۔

" چمپو بھی بیاہی گئی "

یا

" رام کلی بھی گئی۔ چلو یہ بھی چُھٹی ہوئی۔ بڑی نٹ کھٹ تھی ۔ ۔ ۔ پرماتما کرے ! اپنے گھر بیٹھی لاکھوں برس سہاگ منائے ۔ ۔ ۔ لاکھوں برس "

" ارے دھیرا کے بغیر تو کہنی کا مزہ ہی نہیں آتا۔ کیسی لٹک کے ساتھ کہتی تھی۔ دابن سب جگ لاگے پھیکا ۔ ۔ ۔ سندر بہت تھی۔ جب ناک میں ایک کیل پہن لیتی تھی۔ تو یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اُس نے بہت سے زیور پہن رکھے ہوں ۔ ۔ ۔ اور گڑ بہت کھاتی تھی۔ کہتے ہیں بہت گڑ کھانا

اولاد کے لئے اچھا نہیں ہوتا۔"

لیکن کیا گُلگر دھرے کی بیل کے نیچے بیٹھی ہوئی ٹولی میں کوئی کمی واقع ہوجاتی؟ بالکل نہیں۔ کیونکہ چمپو، رام کلی اور دھیرا کی طرح سہاگن بننے والی لڑکیوں کی ٹولی میں خالی جگہ کو پُر کرنے کے لئے شہشوانی ٹولہ کی مائیں کثرت سے چھوکریاں جنتیں۔ اور اس طرح ایک تانتا بندھا رہتا۔ یا شاید یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا کہ شری جگت گورو جی کے صحن کی ریل پیل اور دھما چوکڑی جُوں کی تُوں برقرار رہے۔

جب مکر سنکرانت کا تہوار آیا۔ تو عورتیں آپس میں ڈھکے ہوئے پھل پھولوں اور ایک دوسری کے سہاگ قائم رہنے کی دعاؤں کا تبادلہ کرنے لگیں۔ اُس دن کنواری لڑکیوں نے بھی اپنی آنے والی شاداں زندگی کی پیشوائی میں ایک دوسری کے شگن منائے۔ پرسادی کی تائی اماں ان دنوں بہت فکر مند رہتی تھیں۔ کہتی تھیں "کہیں چھوکری کے ہاتھ پیلے کر چکوں تو سُکھ اور چین کی نیند سوؤں۔ ابھی تک بر نہیں ملا۔ اور پانی سر پر سے نکلا جا رہا ہے۔ یہ سنجوگ کی بات ہے نا ... بدھاتا ہی کرنے ہار ہے ... استری مرد کا وہی میل ملاتا ہے ... جہاں سنجوگ ہونگے ... ہے پرماتما!"

اُس روز تمام عورتیں جگت گورو جی کے صحن میں جمع ہو کر ٹھٹھے اور خوشی کی باتیں کر رہی تھیں۔ ایکا ایکی پرسادی کی تائی اماں نے سب بہو بیٹیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"لو ... اب میں چھوکری کی لُوٹ مچاؤنگی۔"

اس تہوار میں یہ رسم بھی عجیب ہوتی ہے۔ جس کی لڑکی بہت جوان اور بیاہے جانے کے قابل ہو جائے۔ وہ چھوکری کی لُوٹ مچاتی ہے۔ تاکہ اُس کی شادی جلد ہو جائے۔ تائی اماں کی طرح کوئی بوڑھی سہاگن اُٹھ کر ناریل، چھوہارے، بیر، پتہ، بادام اور سات اناجوں کی مٹھیاں بھر بھر کر لڑکی کے سر پر گراتی ہے اور جب وہ چیزیں نیچے بکھر جاتی ہیں۔ تو تمام کنواریاں اور سہاگنیں گرتے ہوئے پھل پھول لوٹنے کے لئے جگت گورو کے صحن میں اُگے ہوئے پیڑوں کے پتوں کی مانند بکھری ہوجاتی ہیں۔ ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ لوٹا ہوا پھل کھائے۔ اگر سہاگن کھائے تو اُس کے سہاگ کی عمر لمبی ہوجاتی ہے ۔۔۔۔ شاید لاکھ برس! بانجھ کھائے تو اُس کے چاند سا بیٹا پیدا ہوتا ہے۔ کنواری کھائے تو اُس کی جلدی سے شادی ہوجاتی ہے۔ اچھا سا بر ملتا ہے۔ اس لئے کنواری لڑکیاں اُٹھا کر چپکے چپکے اور چوری چوری کھاتی ہیں وہ پھل!

پرسادی نے دیکھا جب رتنی کی لُوٹ مچائی گئی۔ تو وہ بہت لجاتی تھی اور اُس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہوگیا تھا۔ پرسادی کی ماں چونکہ بیوہ تھی اس وجہ سے سب عورتوں سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھی آہیں بھر رہی تھی۔ اُس نے پرسادی کو بتایا کہ چھوکری کی لُوٹ کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ تمہاری رتنی بہن کو کوئی بیاہ کرلے جائے گا ... کوئی لُوٹ کرلے جائے گا۔ پھر پرسادی کی اماں ہنسنے لگیں ... کہنے لگیں۔ تمہاری تائی اماں خود بھی رتنی کے لُوٹے جانے کو پسند کرتی ہیں۔ اور ایسے آدمی کی تلاش میں ہیں۔ جو سر سے پاؤں تک اُسے اپنی بنا کر ڈولی میں بٹھا کر چل دے ... اور بڑی دھوم دھام کے ساتھ ... باجے بجواتا ہوا اور پھر گھر میں سے چیزیں بھی سمیٹ کرلے جائے۔

پرسادی نے سوچا "کس کا کیا جائے گا۔ مصیبت تو مجھے پڑے گی۔ سردی میں انگیٹھی کی طرح گرم رتنی چلی جائے گی۔ تو میرے بستر کو کون گرم کرے گا؟ تائی اماں تو برف کی طرح ٹھنڈی ہیں۔ اور اماں تمام رات اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر پہلو بدلتی رہتی ہیں۔ نہ سوتی ہیں۔ نہ سونے دیتی ہیں کھانستی بھی تو بہت ہیں اور کہتی ہیں "میرے ساتھ سونا اچھا نہیں۔ مجھے پرانا تپ ہے۔" ... عجب ہے یہ چھوکری کی لوٹ!! اس سے تو اچھا ہے کہ میں سورگ میں چلا جاؤں!

تایا جگت گورو ٹھنڈی رام آدمی بڑے ہشیار تھے۔ اُنہوں نے دنیا کے سب پاپڑ بیلے تھے۔ تبھی تو لوگ اُنہیں جگت گورو کہتے تھے۔ صبح شہر میں بھیجنے کے لئے کیلنڈروں کی جفتیاں بنواتے رہے۔ آٹھ بجتے بجتے کھوئے میں گُھر بلا بھی تیار کرلیا۔ اور پھر جھٹ سے کام پر بھی چلے گئے۔ بلا کے آدمی تھے جگت گورو۔ اُس دن پرسادی بھی اُن کے ساتھ گیا۔

جگت گورو چنگی پر محرر تھے۔ تمام دن وہ گلقند میں کام آنے والے پھولوں اور کچی کھالوں پر محصول لگاتے رہے۔ کبھی کبھی کسی سے کچھ پیسے ٹکے لے کر اُسے یونہی چھوڑ بھی دیتے۔ آخر جگت گورو تھے نا۔ اور انہیں رتنی کی لُوٹ مچانی تھی۔ اس طرح دھیلا دھیلا پیسہ پیسہ کرکے ہی تو کچھ بنتا ہے تب ہی تو ٹھنڈی رام جی موٹے ہو رہے تھے۔ لوگ کہتے ہیں رشوت لینے سے آدمی موٹا ہوجاتا ہے۔ اور روح اور ضمیر سوکھتے جاتے ہیں مگر جسم تو دکھائی دیتا ہے۔ روح اور ضمیر کس کو دکھائی دیتے ہیں۔

چنگی پر خوشیا اور وفاتی آتے۔ پرتو اُنہوں نے اچھا ڈھونڈھ

رکھا تھا بہت ہی اچھا! اب ساہے کی تاریخ مقرر ہوئی تھی۔ جگت گورو نے لڑکے کی جنم پتری اچھی طرح دیکھ بھال کر ساہے کی تاریخ بدھوا رکھی تھی۔ اور جنم پتری جیب میں لئے پھرتے تھے۔ دفاتی کے پوچھنے پر اُنہوں نے ساہے کی تاریخ فوراً بتا دی۔ لڑکے کی طرف سے کوئی میر مدّد آیا تھا۔ سب "بڑے بھاگ ججمان کے . . . . بڑے بھاگ ججمان کے . ." کہتے ہوئے رخصت ہوئے۔

تائی اماں بڑی بے صبری سے ساہے کا انتظار کرنے لگیں۔ اُنہوں نے کئی سونے اور چاندی کے گہنے اور برتن بنوا رکھے تھے۔ آخر اسی بات کے لئے تو تایا جی نے گلقند والے گلاب کے پھولوں کی کئی گٹھڑیاں دو دو چار چار آنے لے کر چھوڑ دی تھیں۔ اور کچے چمڑے کی گانٹھیں دو دو چار چار روپے لے کر۔ بیسیوں گلاس، تھال اور کڑاہیاں اور نہ جانے کیا کیا کچھ منگایا گیا۔ تایا نے ایک بڑا سا پلنگ بھی خریدا۔ اس پر پرسادی اور رتنی جیسے چھ جنے سو سکتے تھے۔ پھر کرسی، میز، سنگاردان، ٹرنک، جرابیں اور بہت سی اور چیزیں تھیں۔ کپڑے سینے کے لئے ایک درزی بھی گھر پر بٹھا لیا گیا تھا۔ پرسادی ان سب چیزوں کو دیکھتا اور سوچتا ——

"کیا یہ سب کچھ ہے لٹانے کے لئے؟"

پرسادی نے کہا۔ تایا جی کچھ اتنے سیانے نہیں معلوم ہوتے۔ مگر دفاتی، خوشیا، بیلی رام اور اڑوس پڑوس کے سب مرد عورتیں جگت گورو کی واہ وا کر رہے تھے۔ لڑکی کا دان کرنا سو گائے کے دان کے برابر ہوتا ہے تلادان سے کم پھل نہیں ملتا۔ لوگ تو یہی کہتے تھے۔ جگت گورو کو یہ نام یوں ہی تھوڑے ملا تھا۔ اسی لئے تو یہ نام رکھا گیا تھا۔ بڑے سیانے، بڑے کارگر آدمی تھے۔ ایشور کسی کو بیٹی دے تو لٹانے کے لئے بہت پیسہ بھی دے . . واہ وا . . واہ وا . . .

پرسادی نے اماں سے تایا کی عقل کے بارے میں پوچھا۔ تو وہ کہنے لگی: "بیٹا! یہ چھوکری کی لُوٹ آج سے نہیں۔ جب سے دنیا بنی ہے چلی آرہی ہے . . سب اپنی اپنی چھوکریوں کو لٹا دیتے ہیں۔ اور اتنا دھن دولت بھی!"

اور آنکھیں پونچھتے ہوئے اماں بولیں۔

"ہائے! اس پر بھی بس ہو تو کوئی صبر کرے . . لڑکیوں والے منتیں کرتے ہیں۔ پاؤں پڑتے ہیں۔ کیا جانے لڑکی کے ساس سُسر رُوٹھ جائیں، برا چھا نہ ہوا تو لے دے کر بھی نہیں بساتا . . . پھر کسی بھاگوں جلی کا سہاگ ہی لُٹ جاتا ہے . . . اور وہ دکھیا پھر سگے ماں باپ کو بھی بوجھل معلوم ہونے لگتی ہے۔"

اور جب پرسادی طرح طرح کے سوال کرنے لگا۔ تو ماں کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ کہنے لگی "پرسُو! تو بھی بڑا ہو گا۔ تو ایک چھوکری لُوٹ کر لائے گا۔ اسی طرح دھن سمیت . . . اُسے اچھی طرح سے بسانا . . مجھے ڈر ہے کہیں وہ بھاگوان دن اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں گی . . ."

"تو کہاں چلی جائے گی ماں؟"

"تمہارے پتا کے پاس . . . وہ بھی مجھے اس طرح لوٹ کر لائے تھے۔ میں انہی کی ہوں۔"

پرسادی ایک بجھے ہوئے تنور پر . . ٹانگیں لٹکائے ہوئے تمام دن اداس بیٹھا رہا۔ ہائے! میں بڑا ہوں گا۔ رتنی کی طرح ایک لڑکی کو لوٹ کر لاؤں گا۔ اُس چھوکری کے ہاں کرد ندہ کی بیل کے نیچے ایک لڑکی کی کی ہو جائے گی۔ جسے کوئی اور پُر کرے گی۔ ہاں! اگر وہ چھوکری بھی اپنے کسی بھائی کو سردیوں میں اپنے بستر میں جم جانے یا اپنی تائی اماں کے برف سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر سو جانے کے لئے چھوڑ آئے گی۔ اس کا بھائی تو رہ رہ کر مجھے کوسے گا۔ اور کہے گا۔ اس سے تو کہیں اچھا ہے کہ میں سورگ میں چلا جاؤں!

ساہے کے دن پرسادی اور اُس کے چچا بہت سے لوگوں کے ساتھ آئے۔ اگر اماں منع نہ کرتیں۔ تو پرسادی لٹھ لے کر اُن کا مقابلہ کرتا۔ پھر کسی کی کیا مجال تھی کہ اس فضول سی رسم کو پوری ہونے دیتا یا رتنی کو لُوٹ کر لے جانے کی جرأت کرتا اگرچہ جگت گورو اور تائی اماں کو اس لُوٹ کی خوشی تھی۔ تائی اماں ایک منڈپ کے نیچے جھنڈیوں اور کاغذ کی پھولوں کی بیلوں کے نیچے بیٹھی تھیں۔ جب پھیرے ہو گئے۔ تو سب نے تائی اماں کو بدھائی دی۔ اور اُس کی سُرخ پھلکاری پر پیلے پیلے پھول اور پنکھڑیاں برسائیں۔ جیسے تائی اماں نے رتنی کو لُٹا کر بہت عقلمندی کی بات کی تھی۔ پھر تائی اماں نے اس لوٹ کی خوشی میں دُودھ کے دو بڑے بڑے کٹورے بھر کر پئے۔

پرسادی کو چچا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ پرسادی نے کہا۔ یہ مردہ سا آدمی، کالا کلوٹا رتنی بہن کو لوٹ کر لے جائے گا۔ رتنی تو اس سے ڈرے گی۔ لوٹ کر لے جانے والے ڈاکو ہی تو ہوتے ہیں۔ بُری بُری شکل کے . . . اس میں اور ان میں اتنا فرق ہے۔ کہ ڈاکو منڈاسا باندھ کر آتے ہیں۔ اور یہ کالا کلوٹا چچا سہرے پہن کر آیا ہے . . . اور اُس سے

تو ہمارا ملّو کنہیا سو درجے اچھا ہے۔

جب کہاروں نے ڈولی اُٹھائی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ اس لئے کہ کنگر وندہ کی بیل کے نیچے سے ایک شہ نشست خالی ہو رہی تھی۔ تائی اماں اونچے اونچے رونے لگیں۔ ہائے! بیٹی کا دھن عجیب ہے۔ پیدا ہوئی۔ راتیں جاگ جاگ کر گُوموت سے نکالا، ناز و نعمت سے پالا، پڑھایا، جوان کیا۔ اب یُوں جا رہی ہے، جیسے میں اس کی کچھ ہوتی ہی نہیں ایشور! بیٹی کسی کی کوکھ میں نہ پڑے۔ بیٹی کا بچھوڑا بُرا ... یہ چگتی چڑیا! ... اور اماں تو در و دیوار سے ٹکریں مارنے لگیں۔ ہائے! رتنی کا بچھوڑا مجھ سے نہ سہا جائے گا۔ میری بیٹی نے تو مجھے رنڈاپا بُھلا دیا تھا ... اچھا! بیٹی یہ سنسار ہی جھوٹا ہے۔ اس کی ریت جھوٹی ہے۔ اس سے پریت جھُوٹی ہے۔ جس سے بھی دل لگایا جاتا ہے۔ وہ چھوڑ کر چل دیتا ہے ... جا ... بیٹی جا ... جا اپنے گھر سُکھی رہ۔ تیری مہک ہمیں یہاں آتی رہے۔ تو پھلے پھولے۔ لاکھوں برس سُہاگ منائے!

تمام لڑکیاں بھی بچھوڑا گاتے ہوئے رُک رُک گئیں۔ بہت روئیں۔

ڈولی کا پردہ اُٹھا کر رتنی نے پرسادی کو گلے سے لگا کر خوب بھینچا۔ پرسادی بھی سب کو روتے دیکھ کر بہت رویا۔ رتنی کہتی تھی۔

"پرسو بھیا۔ میرے لال تو میرے بغیر سوتا ہی نہیں تھا۔ ہائے! اب تو رتنی کو کہاں ڈھونڈے گا ... ؟"

پھر سب کو مخاطب کر کے کہنے لگی۔

"ہائے میرے ایشور! مجھے اس گھر میں رکھنے کی کوئی بھی حامی نہیں بھرتا۔ سبھی تو میری جان کے لاگو ہو رہے ہیں۔"

اور جب جیتے جاگتے آدمیوں میں سے کسی نے اُسے روکنے کی حامی نہ بھری۔ تو رتنی دادا اور چچا چمبا رام کو یاد کر کے رونے لگی۔

چمبا رام کی یاد نے پرسادی کی اماں کی بہت بُری حالت کر دی۔ پھر رتنی در و دیوار سے باتیں کرنے لگی۔" یہ دروازہ جس کی سینکڑوں دفعہ زنجیر لگائی ... میں سمجھتی تھی۔ میرا اپنا گھر ہے ... ہائے کھرنی اور میرے میٹھے آم ... ہائے! نردئی پتا! تیرے بستے مندروں میں سے مجھے زبردستی نکال کر لے جا رہے ہیں ... یہاں کا دانہ پانی چھوٹ گیا!

جب رتنی چلی گئی۔ تو پرسادی اُسی بجھے ہوئے تنور پر اداس بیٹھا اُدھیڑ بُن کرتا رہا۔ طرح طرح کے خیال اور وسوسے اُس کے دل میں پیدا ہوتے۔ اُس نے کہا۔ تائی اور اماں کہتی تھیں۔ پرماتما ہی مرد اور استری کا میل ملاتا ہے۔ تو پھر خوشیا اور دفاقی کی کیا ضرورت ہے ... وہ یُوں بھی تو گھر میں سے سیروں آٹا، گڑ اور گھی لے جاتے ہیں۔ گٹھوں کے گٹھے گنڈل کے ساگ پات، کچا پکّا —— بدمعاش کہیں کے ... صرف اتنی سی بات کہتے ہیں "بڑے بھاگ جُمانی کے ... بڑے بھاگ جُمانی کے" کیوں نہیں ملّو کنہیا ہی رتنی کو لے جاتے۔ پرماتما نے آپ ہی تو میل ملایا تھا۔ اور یہ خوشیا اور دفاقی لا دیتے ہیں اتنا مروہ سا کالا کلوٹا جیجا ... پرماتما کے کئے میں دخل دیتے ہیں نا ... رتنی نہ کہتی تھی۔ تمہارا جیجا ملّو کنہیا ہے ... کبھی کسی کے دو دو جیجے بھی ہوتے ہیں۔ میں تو ملّو کنہیا کو ہی جیجا کہوں گا۔ اُس مردوے کو کبھی نہیں، لاکھ زور لگائے کوئی۔"

نہ جانے یہ لوگ چھوکری کی لُوٹ کے اتنے خواہشمند کیوں ہوتے ہیں۔ پل پل گن کر ساہے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھیروں کے بعد دودھ کے کٹورے پیتے اور بدھائیاں لیتے ہیں۔ اور پھر جب لُوٹ ہوتی ہے تو روتے ہیں۔ اتنا مورکھ کون ہوگا۔ جو آپ ہی سب کام کاج کرے اور پھر روئے جیسے کوئی سورگ چلا گیا ہو۔ اور پھر رتنی کی بھی تو جانے کی اتنی مرضی نہ تھی۔ وہ دہلیز پکڑ پکڑ کر رو دی تھی۔ بچاری! بُرا حال تھا!

اتنی چیزیں بھی دے دیں اور پھر ہاتھ جوڑتے رہے۔ قبول کرو ... قبول کرو ... میں تو یُوں کبھی کسی کے پاؤں نہ پڑوں۔ اول تو دُوں ہی نہیں اور جو دُوں تو یُوں منتیں کر کے کبھی نہ دُوں۔ نہ لیں تو جائیں بھاڑ میں!

اُس دن ساری رات تائی اماں کے برف سے ٹھنڈے جسم کے ساتھ لگ کر پرسادی جاگتا رہا۔ اور سوچتا رہا۔ سوچتا رہا اور جاگتا رہا۔

کچھ دنوں بعد رتنی آپ ہی آپ آ گئی۔ پرسادی کو اُس نے بہت چُوما۔ بہت پیار کیا۔ گویا اب وہ کبھی نہیں جائے گی۔ اور اُسے خود بھی وہ فضول سی رسم پسند نہیں۔ اُس رات پرسادی بڑے مزے سے رتنی کی انگیٹھی سے گرم جسم کے ساتھ لگ کر سویا۔ رتنی ساری رات پیار سے پرسادی کو بھینچتی رہی ... جب سویرے اُس کی آنکھ کھلی۔ تو رتنی بستر پر نہ تھی۔ پتہ چلا کہ وہی لٹیرا اُسے پھر لُوٹ کر لے گیا ہے۔

پرسادی پھر رو دیا۔ مگر ماں نے پھر سمجھایا۔" پرسو بیٹا! یہ رسم آج سے نہیں جب سے دنیا بنی ہے چلی آ رہی ہے۔"

سوچتے ہوئے پرسادی نے کہا۔ بڑے نخرے کرتی تھی رتنی۔

سچی سچی تو بات یہ ہے کہ یہ چھوکریاں خود بھی لُٹ جانا پسند کرتی ہیں۔ وہ تو اپنے سوتے ہوئے بھائیوں کے جاگنے کا انتظار بھی نہیں کرتیں۔ اور کالے کلوٹے جیجا کے ساتھ بھاگ جاتی ہیں!"

اب کے جو رتنی آئی اور آئی بھی بہت دنوں کے بعد، تو چھوکری کی لُوٹ کے متعلق پرسادی نے اپنا نظریہ بالکل بدل دیا۔ اُس نے کہا۔ دراصل یہ لُوٹ سب کے لئے اچھی ہوتی ہے۔ تائی، اماں، جگت گورو شہشوانی ٹولہ کی سب چھوکریاں اور خود رتنی بھی اسے پسند کرتی ہے اور خاص طور پر اُسے بھی اچھی لگتی ہے۔ منّا تو رل جاتا ہے۔ رتنی نے اُسے جیجا کی طرح دُبلا پتلا مگر اپنی طرح گورا چٹا منّا کھیلنے کو لا دیا تھا۔ منّا کو دیکھ کر پرسادی نے ماں کو آواز دی۔

"بھولی اماں ... تُو توجتن کرنے سے رہی ... کیا تُو نہ لُٹے گی ماں؟"

راجندر سنگھ بیدی

اے مرے دل!

اے مرے دل، اے مرے بے آبرو، بے آب دل! اے مرے بے رنگ دل، بے چین دل، بے تاب دل!

دیکھ یہ اُمنڈا ہُوا ساون، یہ موسم کا شباب کالی کالی بدلیاں، اور بجلیوں کا پیچ و تاب

یہ کنارِ رودِ جہلم، آہ! یہ سیمِ رواں! نغمہ ریز و نغمہ بیز و نغمہ خیز و نغمہ خواں

یہ ہجومِ گُل رُخاں، یہ التزام و اہتمام! یہ شباب افروز منظر، یہ نشاط انگیز شام

دامنِ کہسار میں خورشید پاروں کا ہجوم خاک کے آغوش میں یہ چاند تاروں کا ہجوم

کالے کالے آنچلوں میں چاند سے چہروں کا نور روح میں انگڑائیاں لینے لگی موجِ سرور

آہ! یہ اُڑتے ہوئے، بکھرے ہوئے، شبرنگ بال گرد جن کے سامنے رعنائی حُسنِ خیال

آہ! یہ سانسوں کی موسیقی کہ جن کے مست راگ روح کی گہرائیوں میں بھی لگا دیتے ہیں آگ

آہ، یہ آنکھیں، کہ جن کی سرخیوں کے درمیاں لے رہی ہے ناز سے دوشیزگی انگڑائیاں

پُھول سے لب مسکراتے، پُھول برساتے ہوئے خار و خس میں زندگی کا خون دوڑاتے ہوئے

آہ، یہ نازک بدن، نازک ادا، ناز آفریں اک جواں افکار شاعر کے یہ "خوابِ مرمریں"

تیرے بہلانے کو آمادہ ہیں یہ سارے، مگر ڈالتا ہی تُو نہیں اِن پر چھلکتی سی نظر

اے مرے دل، اے مرے بے آبرو، بے آب دل اے مرے بے رنگ دل، بے چین دل، بیتاب دل

تو ابھی روتا ہے اُس نا آشنا کی یاد میں
یہ وفاداری، ارے! اک بے وفا کی یاد میں

تجھ میں رقصاں ہی نہیں ہے زندگانی کے شرار
اے مرے دل، میری خوں گشتہ امیدوں کے مزار!

آہ! تو بھولا نہیں وہ چاندنی راتیں ہنوز،
یاد ہیں تجھ کو گئی گذری ملاقاتیں ہنوز!

یہ جوانی، اور کمھلایا ہوا رہتا ہے تو؟
اس طرح سے آہ مُرجھایا ہوا رہتا ہے تو؟

اے مرے دل، اب وہ لمحے بھول جانے دے مجھے
آنسوؤں کی گود میں ہی مسکرانے دے مجھے

میری پژمردہ جوانی پر بہار آنے بھی دے
مجھ کو پھر اک مسکراتا پھول بن جانے بھی دے

پھر فضائے لامکاں کی سمت اڑ جانے بھی دے
بربطِ زہرا پہ کوئی راگنی گانے بھی دے

بے خودی میں حُسن کے قدموں پہ گر جانے بھی دے
آسمانوں سے ستارے توڑ کر لانے بھی دے

آج پا لینے دے مجھ کو میرا گم کردہ شباب
آج بھر دے میری رگ رگ میں محبت کی شراب

آج پی لینے بھی دے اُن مے فروش آنکھوں کا نور
دوڑنے بھی دے رگوں میں شعلۂ برقِ سرُور

بازوؤں پر ریشمیں زلفوں کو بکھرانے بھی دے
زندگی کو اک بہشتی خواب بن جانے بھی دے

مرمریں باہوں کو سینے سے لگا لینے بھی دے
آج حسن و عشق کی معراج پا لینے بھی دے

چُوس بھی لینے دے ان امرت بھرے ہونٹوں کا رس
پھر اُبھر آنے بھی دے سینے میں جینے کی ہوس

دیکھ! پیمانہ بکفِ پیرِ مغاں بے تاب ہے
آج سجدے کے لئے خود آستاں بے تاب ہے

سیّد ضمیر جعفری بی۔ اے

تماکو

چرخ نے مُردہ جسم میں سے اپنی تھوتھنی نکالی، اور اُوپر اُٹھا کر اپنے کانوں کو کھڑا کیا۔ اُس کی زرد زرد آنکھیں اس طرح متحرک ہوئیں گویا وہ نامطمئن اور مشتبہ ہے۔ دُور اندھیرے جنگل میں سے کسی لشکر کے آگے بڑھنے کی آواز آ رہی تھی ——— دھب، دھب، دھب، دھب!

ایک گدھ بولا۔ پھر اپنے پر پھڑپھڑا کر ایک درخت کی ٹہنی پر جا بیٹھا۔ باقی دو گدھوں نے بھی اُڑان بھری اور تاوے کاٹ کاٹ کر اُونچے ہونے لگے، یہاں تک کہ ایسے نظر آنے لگے کہ نیلے آسمان کے ریشمی شامیانہ میں آویزاں ہو گئے ہیں۔

گدھ کہہ رہے تھے "تماکو آ رہا ہے!"

سنگ صورت بندروں کی ایک ٹکڑی جو جھاڑیوں میں لوٹ مار کر رہی تھی۔ قلانچیں بھرتی باہر میدان میں نکل آئی۔ اُن کے گل مچھے پھڑپھڑا رہے تھے اور دُمیں آسمان کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ آگے آگے ایک جعادری تھا جو اس ٹکڑی کا سردار تھا۔

جعادری نے اپنے زرد زرد دانت چمکا کر کہا "تماکو آ رہا ہے۔"

باقی سب بندروں نے بھی منہ چڑا کر کہا "تماکو کے لئے راستہ چھوڑ دو۔"

اُن کا سردار ایک چھلانگ مار کر اوپر پھیلے ہوئے ٹہنوں کے جال میں پہنچ چکا تھا۔ باقی سارے بندر بھی چھلانگیں مارتے اس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔

چرخ اکیلا کھڑا ابھی سوچ ہی رہا تھا۔ اس کے سامنے شیرِ ببر کا پس خوردہ زیبرا پڑا تھا۔ چرخ کی تھوتھنی ایک بار پھر زیبرے کے مُردہ جسم میں غائب ہو گئی۔ ایک ہی لمحہ بعد اس نے اپنی خون میں لتھڑی ہوئی تھوتھنی اُٹھائی اور دُور سے آنے والی آواز کی طرف کان لگا کر سونگھنا شروع کیا۔

دھب، دھب، دھب، دھب!

زمین کانپنے لگی۔ سامنے کا درخت قریب آنے والے کے خوف سے لرزتا نظر آ رہا تھا۔ پھر ایکا ایکی جنگل کے سناٹے میں دھننناک چنگھاڑیں گونجنے لگیں۔ جیسے سینکڑوں نقیبوں نے ایک ساتھ اپنی اپنی ترئی پھونک دی ہو ——— پُواو پُواو پُواو پُواو!

یہ ہاتھیوں کی چنگھاڑ تھی۔ ان میں سب سے اونچی ایک آواز تماکو کی تھی۔ جو اپنے غول کا سردار تھا۔ اس کی چنگھاڑ کا جواب باقی اور سب ہاتھی دے رہے تھے ——— پُواو پُواو پُواو پُواو!

چرخ کے لئے یہ اعلان کافی تھا۔ اس نے اپنی بالوں سے ڈھکی تھوتھنی میں سے کچلیاں چمکائیں۔ تیزی سے ایک پلٹا کھایا اور خاک کا ایک بادل سا اُڑاتا ہوا سبز رنگ کی گھنی جھاڑیوں میں سائے کی طرح غائب ہو گیا۔

ٹہنی پر بیٹھے ہوئے گدھ نے ایک زور کا قہقہہ سا لگایا "تماکو آ رہا ہے!"

ایک گیدڑ دُم دبا کر راستہ میں سے بھاگا۔ کالے ناگ نے بھی بھاری بھاری قدموں اور کچل دینے والی موت کا خطرہ محسوس کیا اور جلد جلد اپنی کنڈلی کھول جھاڑی میں کھسک گیا۔

شیرِ ببر کے پنجوں سے چری ہوئی زیبرا کی لاش دھوپ میں پڑی سڑ رہی تھی۔ چیونٹیوں کی چمکدار قطار جو زیبرا تک پھیلی ہوئی تھی، وہ بھی یکایک غائب ہو گئی تھی۔ گھنے جنگل کا یہ چھوٹا سا میدان پُراسرار سناٹے سے معمور ہو گیا تھا۔

بھاری بھاری قدموں کی خاموش گرج قریب ہوتی جا رہی تھی۔ تاریکی کے ایک پہاڑ نے اس چھوٹے سے میدان کو ڈھک لیا۔ سورج کی شعاعیں منقطع ہو گئیں۔ اور جنگل کے سبز رنگ پردوں کو ہٹاتا ہوا یہ کالا پہاڑ عجیب شان و شکوہ سے آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

یہ ننّاکو تھا جو اپنے غول کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اُس کی سُونڈ درختوں کو راستے میں سے ہٹاتی جاتی تھی، اور اپنے چارے کو سُونگھتی جاتی تھی۔ بڑے بڑے کان پنکھوں کی طرح ہل ہل کر مکھیوں اور کیڑوں کو بھگا رہے تھے۔ ننّاکو بڑی ہوشیاری سے ایک ایک قدم پھُونک پھُونک کر رکھ رہا تھا۔ لمبے لمبے ہلکے زرد رنگ کے دانت موت کے نقیب معلوم ہوتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر چیز کو شُبہے کی نظر سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس کے بھاری بھاری قدم اِس طرح اُٹھ رہے تھے جیسے کوئی اِنسان اندھیرے میں بڑی احتیاط سے پنجوں کے بل چلے۔

پُواو پُواو پُواو پُواو!

اب ننّاکو نے یہ آواز اتنی ہلکی نکالی کہ بالکل سرگوشی بن گئی۔

جنگلی سفید چڑیاں اس کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے پَر پھڑپھڑانے اور چونچیں مارنے لگیں۔ ننّاکو نے اپنا پچھلا دھڑ ذرا سا آگے کو کر دیا۔ اس پر کھال کی بہت سی بٹیں پڑی ہوئی تھیں، اور یہ وہ مقام تھا جہاں کبھی کسی شکاری کی گولی لگی تھی۔

ننّاکو وہاں آ کر ذرا ٹھٹکا جہاں مُردہ زیبرا پڑا تھا۔ ننّاکو کی بل کھائی ہوئی سُونڈ اس کی طرف سُونگھتی ہوئی بڑھی، پھر سر سے اُونچی اُٹھ گئی۔ ننّاکو کی ایک ہلکی سی چیخ سُنائی دی۔ اور وہ کترا کر الگ ہٹ گیا۔ اُسے مردار سے نفرت تھی۔ یہ تو چرخ اور گِدھوں ہی کا من بھاتا کھاجا ہے۔

درخت پر بیٹھے ہوئے گِدھ کے قہقہے کی آواز اس نے سُنی۔ اُسے غصّہ آگیا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ اس کی سُونڈ درخت کے تنے سے لپٹ گئی۔ اور ایک ہی جھٹکے میں درخت جڑ سے اُکھڑ آیا۔ گِدھ اپنی بے پروائی ظاہر کرتے ہوئے آسمان کی طرف اُڑ گیا۔ ننّاکو نے اُکھڑا ہوا درخت جھاڑی کی طرف اُچھال دیا۔ جھاڑی میں دبکا ہوا چرخ چیخ مار کر اور بھی اندر جا چھُپا۔

ہاتھی کی آواز سُنائی دی۔ "راستہ صاف کرو، ننّاکو آ رہا ہے۔"

جیسے کسی جنازے کے ساتھ لوگ خاموش چلتے ہیں۔ اسی طرح باقی اور سب ہاتھی اپنے سردار کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ گویا جنگل کے سارے کالے دیو قطار بنائے چل رہے تھے۔ چند بچّے بیچ میں کلبلیں کرتے جا رہے تھے۔ بوڑھے ہاتھیوں کے لمبے لمبے دانت نکلے ہوئے تھے۔ ہتھنیاں بچّوں کو قطار میں کرتی چلتی تھیں درختوں کو ہٹاتا، اکھیڑتا اور جھاڑیوں کو کچلتا روندتا ہاتھیوں کا یہ جلوس چلا جا رہا تھا۔ چھوٹے سے میدان میں زیبرے کے سڑے ہوئے جسم پر دُھوپ کی دھاری پھیر پڑنے لگی۔ اب پھر اس کھُلی جگہ میں سنّاٹا تھا اور سینکڑوں آنکھیں جھاڑی میں سے جھانک رہی تھیں۔

لیکن یہ جھانکنے والے جانور بالکل ساکت تھے۔ گِدھ اب بھی آسمان میں ٹِکتے ہوئے نظر آتے تھے۔ صرف کالے ناگ نے ذرا بلند ہو کر اپنا پھَن کھول دیا، کیونکہ اب وہ ایک اور بھی زیادہ خطرناک بُو پا رہا تھا۔ کوئی انسان قریب آ رہا تھا!

ایک لمحہ بعد وہ انسان جنگل کا پردہ ہٹا کر نمودار ہوا۔ یہ ایک گوری رنگت کا نوجوان تھا۔ دُھوپ سے تمتماتے ہوئے چہرے سے مسرّت اور وفورِ شوق ظاہر ہوتا تھا۔ سیدھے ہاتھ میں ہاتھی کے شکار کی رائفل تھی۔ اُس نے آسمان کی طرف نظر نہیں اُٹھائی اور نہ ان گِدھوں کو دیکھا جو آسمان میں معلّق تھے۔ اُس کی نظریں تو ہاتھیوں کے ان پیروں کے نشانوں پر جمی ہوئی تھیں جو ننّاکو اور اس کا غول اپنے جلَو میں چھوڑ گیا تھا۔ نیچے جھکے جھکے وہ اسی کھوج کو دیکھتا بھالتا سا چلا جا رہا تھا۔

اس اُجلے رنگ کے نوجوان کے ساتھ ساتھ سائے کی طرح ایک کالے رنگ کا بندوق بردار لگا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ایک بوسیدہ خاکی وردی تھی۔ کمان کی طرح مڑی ہوئی ٹانگیں جھُلسی ہوئی لکڑیاں معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ٹھیک اسی جگہ ٹھٹکا جہاں ننّاکو نے ٹھہر کر زیبرا کے مُردہ جسم کو سُونگھا تھا اور کترا کر نکل گیا تھا۔

اردلی نے کہا "صاحب! اِن پگوں پر چلنا جان جوکھم کا کام ہے۔"

صاحب نے اپنی نیلی آنکھیں اس کی طرف اُٹھائیں۔ اور تعجب سے دیکھا۔ اردلی کا اُترا ہوا چہرہ دیکھ کر وہ ہنس پڑا۔

"عبدل! ہاتھی کا شکار ہی جان جوکھم کا کام ہے۔ ابھی اُنہوں نے ہماری بُو نہیں پائی۔ آدھ گھنٹے میں ہم اُنہیں جا لیں گے۔ اور جس کو چاہیں گے گرا لیں گے۔"

اردلی نے بددلی سے کہا "یہ بہت خطرناک ہیں صاحب"!

صاحب کے چہرے سے نفرت ٹپکنے لگی۔

"تو تمہیں ڈر لگ رہا ہے عبدل"؟

عبدل کا سر جھُکا رہا۔

"میں نے بہت سے بہادر شکاریوں کی بندوقیں اُٹھائی ہیں صاحب"!

صاحب نے حقارت سے کہا: "ہاں مجھ سے بھی یہی کہا گیا تھا"
عبدل نے اُسی بے دلی سے کہا: "صاحب۔ اب میں اس کام میں پُرانا ہوگیا ہوں ۔ اور کچھ سُوجھ بُوجھ بھی بڑھ گئی ہے ۔ ایسے ہاتھی کا پیچھا کرنا جسے کوئی نہیں مار سکتا آسان نہیں ہے"
"کیا کہا؟" صاحب نے اپنی بندوق اور بھی زور سے پکڑتے ہوئے کہا۔
"مَیں نے جو کہا سچ ہے صاحب۔ ہم نماکو کے کھوں پر چل رہے ہیں۔ اُس ہاتھی کے جسے کوئی نہیں مار سکتا"
عبدل کی بات ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ باقی تین شکاری بھی اتنے میں آگئے۔ اور صاحب کے پیچھے جا کھڑے ہوئے۔
صاحب نے عبدل کے الفاظ کو دُہرایا: "نماکو! جسے کوئی نہیں مار سکتا! یہ تو پہلی بار مَیں نے تم سے سُنا ہے"
"نماکو" کا نام شکاریوں کے دماغ پر بجلی بن کر گرا۔ اُنہوں نے ایک دوسرے سے خوف زدہ سرگوشیوں میں کہا۔
"نماکو! صاحب نماکو کو مارے گا!"
عبدل نے بڑبڑا کر کہا: "صاحب مَیں نے آپ سے جو کہا ہے اس میں جھوٹ نہیں ہے۔ بہت سے شکاریوں نے نماکو کا شکار کھیلنا چاہا۔ مگر ایک بھی اس کے مارنے کی خبرے کر نہیں لوٹا۔ جنگل کا سب سے بڑے دانتوں والا ہاتھی نماکو ہی ہے۔ اس کے دماغ میں ایک بھوت رہتا ہے۔ اور اس کے جسم میں ایک کالے امبر کی رُوح ہے۔ کئی بہادر اور ہوشیار شکاریوں نے نماکو کا پیچھا کیا۔ چھ نے اُس پر گولی چلائی۔ ایسی کہ اُسے گر جانا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ گولی ابھی ڈھلی ہی نہیں جس سے نماکو گر جائے۔ جنگل کے اندھیرے میں سے وہ بپھرا ہوُا نکلتا ہے۔ اور جو اُسے شکار کرنا چاہتے ہیں اُنہیں رَوند ڈالتا ہے۔ اُس کے پیروں سے سات آدمی اب تک روندے جا چکے ہیں۔ صاحب آپ ذرا ہوشیار رہیئے۔ کہیں آٹھویں آپ ہی نہ ہوں"
صاحب کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔
"ایسا ہاتھی تو شکار کرنے کے لائق ہے۔ اچھا اب میرے ساتھ آؤ۔ اس ہاتھی کو مارنے کے لئے تو مَیں جہنم تک اس کا کھوج لگاؤں گا"
یہ کہہ کر بے اختیاری میں آگے بڑھا۔ عبدل نے اُسے روکنے کے لئے اپنا دُبلا سیاہ ہاتھ بڑھایا۔ صاحب نے غصّے سے اُس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔
"اگر تُو ڈرتا ہے تو یہیں ٹھہر جا۔ مَیں کسی ڈرپوک کو اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا"
عبدل کی آنکھیں ٹمٹمانے لگیں۔ اُس شخص کے لئے جس کی زندگی کا آغاز ہی ہاتھی کے شکار سے ہوُا ہو۔ جس نے ساری عمر اس طرح شکار کھیلا ہو کہ درخت پر سے جنگلی ہاتھی کی پیٹھ پر کُود کر اُسے چھُری سے مار گرایا ہو۔ بھلا وہ اِتنا بڑا طعنہ کیسے سہہ سکتا تھا۔ اُس نے آہستگی سے جواب دیا: "صاحب مَیں آپ کی بندوق اُٹھانے کے لئے نوکر رکھا گیا ہوں۔ اگر آپ جائیں گے تو مَیں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا"
یہ کہہ کر اُس نے اور دیسیوں کو ایسی نظر سے دیکھا جس سے چابک برس رہے تھے۔ پھر میدان طے کرکے جنگل کے گھنے سبزے میں غرق ہوگیا۔ ان کے جاتے ہی گیدڑ کی تھوتھنی جھاڑی میں سے نکلی اور بُو سُونگھنے کے بعد وہ مُردار زیبرے کے پاس دبکتا ہوُا پہنچ گیا۔
آدھ گھنٹے کے اندر ہی اندر خود سر صاحب اور عبدل نے ہاتھیوں کے غول کو جالیا۔ ہاتھی ٹھہر گئے تھے۔ اور جنگلی سبزیاں کھانے میں مصروف تھے۔ بچے اُچھلتے پھر رہے تھے۔ اور ہتھنیاں اُن کی نگرانی کر رہی تھیں۔ لیکن کان سب کے اٹکے ہوئے تھے جس سے ظاہر تھا کہ شکاریوں کے قریب ہونے کا انہیں گمان نہیں تھا۔
یہ منظر دیکھ کر صاحب کی باچھیں کھل گئیں۔ اُسے ایسا معلوم ہوُا کہ وقت کی ساری نیو دہ توڑ کر وہ لاکھوں سال پہلے کی دُنیا میں پہنچ گیا ہے۔ سامنے بیس ہاتھی کھڑے اپنے لمبے لمبے دانتوں سے سبزے کو اُلٹ اُلٹ کر کھا رہے تھے۔ سفید چڑیاں ایک کی پیٹھ سے پھُدک کر دُوسرے کی پیٹھ پر بیٹھ جاتی تھیں۔ صاحب اس وقت تہذیب و تمدّن کی دُنیا کو بھُول چکا تھا۔ عورتوں کی دلکشی اور بجلی کی روشنی کو فراموش کر چکا تھا۔ اب وہ جانوروں کے سامنے کھڑا تھا اور خود بھی ایک حیوانِ ناطق سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔
اِس مختصر سے وقفے میں اُس نے زندگی کا اصلی مزہ چکھا۔ اس کے دل میں وہی احساس پیدا ہوُا جو مَرنے والے کے دل میں پیدا ہوُا کرتا ہے۔ جیسے کوئی برکت حاصل کرنے کے لئے گھٹنوں کے

بل جھک جائے ۔ یہ نوجوان بھی ایک گھٹنے پر جھک گیا ۔ رائفل کا کندہ
اُس کے کندھے سے لگ گیا اور ٹھنڈی نال رُخسار سے چھُو گئی ۔ تیزی سے
اس کی نظر اُٹھی اور دو سَو گز پرے ہاتھیوں پر جم گئی ۔

عبدل نے برابر سے کہا "ذرا ہوشیاری سے صاحب"۔

بوڑھے شکاری کی نظروں نے ہاتھیوں کے غول میں خوفناک
نماکو کو پہلے ہی سے تلاش کر لیا تھا ۔ اُس نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس
لیا کہ نماکو اور ہاتھیوں سے کچھ الگ کھڑا جھُول رہا تھا ۔ جب صاحب
نے بندوق چھتیائی تو نال کا رُخ ایک اور ہاتھی کی طرف تھا جو اپنے
دانتوں سے زمین اُدھیڑ رہا تھا ۔

بندوق کا دھماکہ ہُوا ۔

دھوئیں کا ایک ہلکا سا پردہ اور بارُود کی بُو کا بھبکا شکاریوں
کی طرف آیا ۔ جب سامنے کی ہوا صاف ہوئی تو اُنہوں نے دیکھا کہ ہاتھی
گویا جَم کر پتھر کے بَن گئے ہیں ۔ خوف سے وہ ایسے ساکت کھڑے تھے
کہ جنبش کا نام تک نہیں تھا ۔

جس ہاتھی پر گولی چلائی تھی وہ کچھ لڑکھڑایا اور سنبھلنے کی کوشش
کرتا رہا ۔ پھر اُس نے اپنی سُونڈ اوپر اُٹھائی اور زور سے چنگھاڑا ۔ اِس
کے بعد ہی وہ ایک گھٹنے پر جھُک گیا ۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایک
کالے پہاڑ کی طرح لڑھک کر ڈھیر ہو گیا ۔ دو درخت جو اُس کی
لپیٹ میں آ گئے تھے اس طرح ٹوٹ گئے گویا دو چھپٹیاں تھیں ۔

عبدل نے خوش ہو کر کہا "بڑا اچھا نشانہ لگا صاحب"!

صاحب خوشی سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا ۔

"نیچے نیچے صاحب"!

عبدل نے صاحب کی قمیص پکڑ کر نیچے زمین کی طرف گھسیٹا ۔
اور اس وقت صاحب کو معلوم ہُوا کہ جانوروں سے مقابلہ تو اب شروع
ہُوا ہے ۔ کیونکہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا غول اِس طرح حرکت میں آ گیا ۔
جس طرح گھڑی کے سارے پرزے ایک مقرّرہ اصول کے ماتحت چلتے
ہیں ۔ زخمی ہاتھی دَم توڑ رہا تھا ۔ اس کو کپکپاتے دیکھ کر اور ہاتھیوں نے
اپنی آنکھیں اُس کی طرف سے پھیر لیں ۔

کالے پہاڑ حرکت کرتے رہے یہاں تک کہ سب نے ایک
نصف دائرہ بنا لیا ۔ یہ اُسی طرح کا ہلال تھا جیسے افریقہ کے وحشی زُولو
دشمن سے مقابلہ کرنے میں بناتے ہیں ۔ باہر کے رُخ ہاتھی تھے ۔ اُن کی
سونڈیں اور کان کھڑے ہوئے تھے تا کہ جس رُخ سے بھی بُو یا آواز آئے
وہ اُسے پا سکیں ۔ بڑی چالاکی سے بچّوں کو پیچھے چھُپا لیا گیا تھا ۔

یکے بعد دیگرے چالاک سُرخ آنکھوں نے اُس مقام کو تاڑ لیا ۔
جہاں صاحب اور چار شکاری زمین پر پڑے ہوئے تھے ۔ اِس لمحہ
صاحب نے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی خنکی رینگتی محسُوس کی ۔
لیکن ہاتھیوں کی سُرخ آنکھیں اُسے مسحُور سا کر چکی تھیں ۔ ان کے دانت
نیچے کو جھُکے ہوئے تھے ۔ اور وہ کھڑے جھُوم رہے تھے ۔

آہستہ آہستہ اور کسی ارادے سے وہ آگے بڑھ رہے تھے ۔
بہت ہی آہستہ ۔ وہ گویا جھُوم جھُوم کر رقص کر رہے تھے ۔ اور اپنے
دشمنوں کی طرف بڑھ رہے تھے ۔ جنہوں نے اُن کے ایک ساتھی
کو مار ڈالا تھا ۔ ہاتھیوں کی بُو جیسے ہی صاحب کی ناک میں پہنچی اس
کے حواس بجا ہو گئے ۔ اُس نے محسُوس کیا کہ ایک کالے ہاتھ نے
اس کے ہاتھ میں ایک اور رائفل تھما دی ۔ وہ جلدی سے اُٹھ بیٹھا ۔
اور سامنے تکنے لگا ۔

عبدل نے چیخ کر کہا "ٹھہریئے صاحب ٹھہریئے"۔ کیونکہ وہ
ہاتھیوں کے داؤ گھات خوب جانتا تھا ۔ لیکن یہ آگاہی دیر سے ملی ۔
رائفل چل چکی تھی ۔

صاحب نے اب کے گولی اُس ہاتھی پر چلائی تھی ۔ جو ہلال
کے وسط میں تھا ۔ صاحب کے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اُٹھی ۔
کیونکہ بیچ والا ہاتھی لڑکھڑا گیا تھا ۔ لیکن وہ ہاتھی ایک طرف گر پڑا تھا
تا کہ اس کے پیچھے جو سب سے بڑے دانتوں والا ہاتھی تھا وہ آگے بڑھ
کر حملہ کرے ۔ یہ پہاڑ کا پہاڑ چیختا چنگھاڑتا چشمِ زدن میں صاحب کے
سامنے آ گیا ۔

عبدل نے چیخ مار کر کہا "یہ نماکو ہے صاحب ۔ خونی ہاتھی
بھاگو صاحب بھاگو"!

رائفل کی گولی پھر چلی ۔ مگر نماکو کے غضبناک حملے کو روک نہیں
سکی ۔ شکاری منتشر ہو گئے اور جس کے جہاں سینگ سمائے بھاگ
نکلا ۔ غول اپنے داؤ گھات برابر لگا رہا تھا ۔ ہلال کے سرے بڑھتے جا
رہے تھے ۔ اور ان سِروں پر خوفناک دانت والے ہاتھی تھے ۔
شکاری اب خود شکار بن گیا تھا ۔

صاحب بھی اَوروں کے ساتھ پلٹ کر بھاگ نکلا تھا ۔ مگر

اُس کے پیچھے کالا دیو زمین دہلاتا اُڑا چلا آ رہا تھا ۔ خوف وہراس پھیل چکا تھا ۔ سارا جنگل چیخوں اور چنگھاڑوں سے گونج رہا تھا ۔ سارے ہاتھی مرنے مارنے پر تُل گئے تھے ۔

صاحب کا پاؤں کسی چیز میں اُلجھا اور وہ گر پڑا ۔ مرنے سے پہلے اِس مختصر سے دقفے میں اُس نے ایک مضحکہ خیز جاگتے کا خواب دیکھا ۔ اُس نے دیکھا کہ دوستوں کی ایک محفل میں اُسے پہلی دفعہ جامِ شراب پیش کیا گیا ہے اور اُس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ مَیں نہیں پیتا ۔ اس پر چاروں طرف سے سب اُس پر ہنس رہے ہیں ۔

یہ اُس کی زندگی کا آخری خواب تھا ۔ صُور کی سی چنگھاڑ کے ساتھ نماکو اس پر ٹوٹ پڑا ۔ اس کی سُونڈ کمر میں لپٹ گئی ۔ اور اُسے ہوا میں اُچھال کر زمین پر دے مارا ۔ ان سفید بندروں پر جو اُس کے غول کے ہاتھیوں کو مارتے رہتے تھے نماکو کا غصّہ دیوانگی کی حد کو پہنچ چکا تھا ۔ بے رحم آنکھیں اُس سفید بندر کو گھور رہی تھیں جو اس کے قدموں میں بے جان پڑا تھا ۔ پھر اُس نے اپنا بھاری پاؤں اُٹھایا اور سفید بندر کے جسم پر رکھ کر کامیابی کا ایک نعرہ لگایا :-

پُواو پُواو پُواو پُواو !

غول نے جواب دیا ۔ پُواو پُواو پُواو پُواو !

ایک اور شکاری شکار ہو چکا تھا ۔

باقی ہاتھیوں کا غول بھی اب بڑھتے بڑھتے نماکو کے قریب آ گیا تھا ۔ اب سارے ہاتھی خاموش کھڑے اپنے سردار کو دیکھ رہے تھے نماکو نے ذرا سا جُھک کر اپنے لمبے زرد دانتوں سے ایک ہی دار میں زمین میں گہری قبر کھود دی ۔ پھر بڑی نفرت سے اُس نے کُچلے ہُوئے انسانی جسم کو اپنی سُونڈ میں اُٹھا کر قبر میں جھونک دیا ۔ یہ تھا سلوک جو وہ اپنے غول پر حملہ کرنے کی جرأت رکھنے والوں سے کرتا تھا ۔ اس کے بعد اپنے غول کی طرف دیکھے بغیر وہ اس جگہ سے ہٹ گیا ۔ اور دیوانہ وار غصّہ کو فرو کرنے کے لئے یہ پہاڑ کا پہاڑ جھُومتا جھامتا واپس آنے لگا ۔ جب مُردہ ہاتھی کے نزدیک پہنچا تو کترا کر اُس ڈھیر کے قریب سے نکل گیا ۔ موت سے تو سبھی کو ڈر لگتا ہے ۔

مَوت کے اِس خوف کے باوجود نماکو کچھ اوپر سَو سال سے اسی جنگل میں زندہ تھا ۔ ہاتھیوں سے لڑ لڑ کر وہ اس غول کا سردار بنا تھا ۔ کئی سفید آدمیوں نے اسے شکار کرنا چاہا لیکن ناکام رہے ۔ یہ نماکو تھا ، وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا ا

ایک بار پھر اس نے اپنی سُونڈ اُٹھائی ۔ اور جنگل کی ہوا کو سُونگھنے لگا ۔ پھر جنگل کی طرف چل پڑا ۔ اور غول اس کے پیچھے پیچھے تھا ۔ صرف عبدل ایک درخت میں چھپا ہُوا خوف کی نظروں سے ہاتھیوں کو جاتا دیکھ رہا تھا ۔

" اچھا تو یہ کہو راآبن کہ ہاتھی دانت کے لالچ میں تم پھر یہاں کھنچ آئے "

یہ الفاظ علاقے کے افسر نے ایک اور صاحب سے کہے ۔ یہ صاحب دُبلے پتلے اور پستہ قد تھے ۔ اور اس وقت خیمے میں ایک کُرسی پر بیٹھے تھے ۔

راآبن نے کہا " نہیں بھئی ۔ ہاتھی کا شکار کھیلنے کے لئے اب میں بہت بوڑھا ہو گیا ہوں ۔ یہ نوجوانوں کا شکار ہے ۔ مَیں تو اپنے حصّے کا شکار کھیل چُکا ۔ مَیں تو جنگل میں یونہی پھرنا چاہتا ہوں ۔ ولایت کے شاندار بازاروں میں پھرنے سے زیادہ لطف مجھے جنگلوں میں آتا ہے "

علاقہ افسر نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا " مجھے اِس میں شُبہ ہے کہ یہ جوانوں کا شکار ہے ۔ مَیں تو سمجھتا ہوں کہ بوڑھے شکاری کا نشانہ بہتر ہوتا ہے "

راآبن نے کہا " آپ کیا سوچ رہے ہیں ؟ "

علاقہ افسر نے کہا " اسٹوکلی ایک مالدار اور بہادر جوان تھا ۔ ہاتھی کے شکار کا بہت شوقین ۔ چھ ہفتے ہوئے وہ جنگل میں گیا تھا ۔ عبدل اُس کا بندوق بردار تھا ۔ جنگل میں ہاتھیوں کا کھوج اُنہیں مل گیا ؟ "

" بڑا خوش قسمت تھا ! "

" اسٹوکلی کے لئے یہ بدقسمتی کے نشان تھے ۔ کیونکہ نماکو اس غول کا سردار تھا "

" نماکو ؟ "

راآبن کا شوق اور بھی بڑھ گیا ۔ بھُوری آنکھوں میں سے بیتے ہوئے دِنوں کی یاد جھلکنے لگی ۔

"ہاں۔ اسٹوکلی نے پٹھے کو گرا لیا تھا۔ گر غول نے حسبِ معمول داؤگھات شروع کر دیئے۔"

راَبن نے سر ہلا کر کہا۔ "نو لو کا گھیرا؟ میں جانتا ہوں، اور پھر نماکو نے حملہ کر دیا؟"

علاقہ افسر نے کہا "ہاں۔ نماکو نے دھاوا بول دیا۔"

ایک لمحہ کے لئے خاموشی رہی۔

راَبن نے پوچھا "کُل کتنے اس مُوذی کی بھینٹ چڑھے۔"

"آٹھ"

"آٹھ!"

پُرانے شکاری نے تعجب سے کہا۔ گزرے ہوئے زمانے کی یاد اب بھی اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ وہ اُٹھا اور اُٹھ کر اُس نے ایک انگڑائی لی۔ پھر بے پروائی سے بولا "اچھا اب ہم چلتے ہیں۔ اُمید ہے کہ پھر آپ سے جلد ملنا ہوگا۔"

علاقہ افسر نے سر ہلایا۔ وہ راَبن کو خوب جانتا تھا۔ اور جب راَبن ذرا ٹھٹکا تو اُسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔

پھر اسی بے پروائی سے راَبن نے کہا "اچھا وہ عبدل کہاں ہے؟"

علاقہ افسر نے سر کو جنبش دے کر کہا "میرے ملازموں میں ہے۔ ایک ہفتہ ہوا کہ اُس نے یہ خبر سُنائی تھی۔"

ایک منٹ بعد علاقہ افسر نے پُرانے شکاری کو عبدل سے باتیں کرتے دیکھا۔ خاکی کپڑوں میں عبدل کا چہرہ چمکنے لگا۔ وہ جلد جلد بول رہا تھا اور بار بار سر ہلا رہا تھا۔ دوسرے منٹ میں اُس نے راَبن کا شکاری سامان کندھے پر لاد لیا تھا۔ اور اُس کے پیچھے پیچھے جنگل کو چلا جا رہا تھا۔

علاقہ افسر نے دل ہی دل میں کہا "اگر یہ تماشا میں دیکھ سکتا تو اپنی ایک مہینے کی تنخواہ نذر کر دیتا۔"

عبدل اپنے معمر آقا کے پیچھے پیچھے ایک جنگلی گیت گاتا چلا جا رہا تھا۔ اِس گیت میں اُس کالے دیو نماکو کا ذکر تھا جس نے آٹھ آدمیوں کو مار ڈالا تھا۔ نماکو، جسے کوئی نہیں مار سکتا! لیکن صرف ایک زبردست شکاری ہے۔ جس نے ہزاروں ہاتھی مارے ہیں۔ جس نے نماکو کو گرانے کی قسم کھائی ہے۔ یہ ایک زبردست شکاری ہے۔ جس کا نام راَبن صاحب ہے۔

پُواو پُواو پُواو پُواو!

"نماکو آرہا ہے۔"

سارے جنگل میں ایک کان سے دوسرے کان تک یہ سرگوشی پھیل گئی۔ جتنے جاندار تھے سب کے سب اس بلائے جان کا راستہ چھوڑ کر کھسک گئے۔ چیتا بھی ناک بھوں چڑھا کر کچلیاں دکھانے لگا اور ذرا کی ذرا میں ٹھٹک کر جنگل میں جا دُبکا۔ سارے جانور اس کالے پہاڑ سے واقف تھے جو ہاتھیوں کے غول کا سردار تھا۔

تنہا شہنشاہ کی طرح نماکو جھومتا چلا آرہا تھا۔ نماکو نے اپنی اس شان و شکوہ کا اندازہ اپنے چالاک دماغ میں لگایا۔ ایک صدی سے زیادہ کا بوجھ اس پر تھا۔ وہ اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب جنگل میں جانوروں کا راج تھا۔ جب شیر ببر کا ڈکرانا، چیتے کا غرّانا، اور ہاتھی کا چنگھاڑنا گویا ایک حیوان کا دوسرے حیوان کو دعوتِ جنگ دینا سمجھا جاتا تھا۔

وہ اُن دنوں کی دُھندلی یاد جگا رہا تھا جب وہ بچّہ تھا اور اپنی ماں کی جھرّیائی ہوئی کھال سے لٹکا لٹکا چلا کرتا تھا۔ وہ اُس بے پایاں مسرّت کو محسوس کر رہا تھا جو دلدل کی کیچڑ اپنے بدن پر اُچھالنے میں اُسے حاصل ہوتی تھی۔ اُسے جنگل کا علم سکھایا گیا تھا۔ زہریلے پودوں سے الگ رہنا اور جنگل میں چھپی ہوئی موت سے ہوشیار رہنا۔

اُسے جو سبق سُونڈ کی مار اور دانتوں کے کچوکوں سے سکھایا گیا تھا یہ تھا۔ "ہمیشہ غول کے ساتھ رہو۔ اتفاق ہی میں طاقت اور ساتھ رہنے ہی میں عافیت ہے۔ سردار کی اطاعت ہر حال میں فرض تصوّر کی جائے۔ جنگل میں اکیلا پھرنا گویا یقینی موت ہے۔" اکثر ایسا ہوا تھا کہ نماکو کو یہ نصیحتیں بادلِ ناخواستہ قبول کرنی پڑی تھیں۔ اور غول کے قوانین کی پابندی کرنی پڑی تھی۔

گر جیسے جیسے اُس کے جسم میں دیووں کی سی طاقت بڑھتی جاتی تھی۔ نماکو میں اپنی قوّت کا اظہار کرنے کی خواہش بھی بڑھتی جاتی تھی۔ پہلا اظہار اس قوّت و شجاعت کا اس موقع پر ہوا جب ایک کالی ایال والا شیر ببر غول پر جھپٹا اور سارے ہاتھی اس کے خوفناک پنجے ہوتے دہانے کو دیکھ کر مارے ڈر کے بدحواس ہو گئے۔ سردار بھی جھجک کر پلٹ گیا۔ اور غول اُس کے پیچھے ہو لیا۔ گر نماکو وہیں

ڈٹ گیا۔

یہ جوان ہاتھی ببر سے کھڑا آنکھیں لڑاتا رہا۔ بڑے بڑے لٹکے ہوئے کان اُبھر گئے۔ آنکھیں سُرخ ہو گئیں۔ دعوتِ جنگ قبول کر لی گئی تھی۔ متعجب شیر ببر نے اپنا منہ اور بھی پھاڑ کر ایک زہرہ گداز دہاڑ ماری جسے سُن کر سارے جانور بدحواس ہو کر دُور دُور تک راستہ صاف کر دیتے تھے۔ دہاڑ کے ساتھ ہی گچھے دار دُم نے ہوا میں ایک چکر کاٹا۔ گویا حملے کا اعلان کر دیا۔

نماکو نے کچھ نہیں کیا۔ بس کھڑا جھُولتا رہا۔ لیکن اُس کی چالاک آنکھوں نے ببر کے سُبک جسم کو غصّے سے کپکپاتے دیکھ لیا۔ سفید ناخن ملائم پنجوں میں سے باہر نکل آئے۔ اور ایک لحظہ بعد ببر اس پر جھپٹ پڑا۔ لیکن اُس کا مہلک تھپّڑ پڑنے سے پہلے نماکو کی سُونڈ متحرّک ہو چکی تھی۔ اس کی ایک ہی بے ہوش کر دینے والی ضرب نے ببر کی جست کا رُخ بدل دیا۔ لیکن سفید ناخنوں نے نماکو کے پُٹھے پر رحم کر کھال اُدھیڑ دی۔ اور گوشت تک اُتر گئے۔ نماکو تکلیف سے بلبلا گیا۔ تیزی سے پلٹ کر اُس نے دیکھا کہ ببر اُس کے پُٹھے سے رپٹتا ہوا نیچے گر رہا ہے۔

غصّے سے چنگھاڑ کر نماکو نے اُس کے جسم کو اپنی سُونڈ میں لپیٹ لیا۔ اور چشم زدن میں اپنے سَر سے اُوپر اٹھا لیا۔ ببر بے بسی سے ہوا میں پنجے چلاتا رہا۔ اور پھر زمین پر اس شدّت سے پٹخا گیا کہ زمین ہل گئی۔ ایک دھچکے سے سانس لینے کی آواز سُنائی دی۔ اور اس کے بعد ایک بھاری پاؤں ببر پر بے دردی سے رکھ دیا گیا۔ چند لمحوں میں جانوروں کا بادشاہ گھُلا ہوا سا ڈھیر بن کر رہ گیا۔ جسے ٹھکانے لگانے کے لئے آن کی آن میں کالی چیونٹیوں کا ایک زینہ سا بن گیا۔ نماکو ایک طرف کو جھکے سے ہٹ گیا اور لنگڑاتا ہوا غول کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

مگر یہ لڑائی دیکھ لی گئی تھی۔ غول کے سارے ہاتھیوں نے اپنی سونڈیں اُٹھا اُٹھا کر نماکو کا خیر مقدم کیا۔ سردار نے اُس کی طرف سوچ بچار کی نظر سے دیکھا۔ اس کے لئے اب ایک ہمسری کا مدّعی پیدا ہو گیا تھا۔ ایک پٹھا جس کے دانت ابھی نکلنے ہی شروع ہوئے تھے۔ جب سردار کے دانت دو ہاتھ کے ہو گئے۔ تو وہ غول سے الگ ہو کر دلدل کی طرف چل دیا۔ یہ دلدل ہاتھیوں کا قبرستان تھی۔ اور سردار اُس میں غرق ہو گیا۔ اب نماکو اپنے غول کا سردار ہو گیا۔ اس وقت سے اب تک وہ لڑتا رہا تھا۔ اور اپنی شہنشاہیت تسلیم کرانے کے لئے ہلاک کرتا رہا تھا۔

پھر اصلی مدِّمقابل سامنے آیا ...... انسان!

پہلے چند پستہ قد جنگلی آئے۔ اُن کے ہاتھوں میں نیزے اور کلہاڑیاں تھیں۔ یہ بہت مکّار ہوتے تھے۔ زہریلے حشرات الارض سے بھی زیادہ خطرناک۔ مگر نماکو اور اس کا غول اُن کے مقابلے میں فتحمند رہا تھا۔ کتنے ہی کالے کالے جسم شکست کھا کر کچلے جا چکے تھے۔

لیکن سفید بندر اِن سے مختلف تھے۔ ان کے ہاتھوں میں شُل کر دینے والی لکڑیاں تھیں۔ ان لکڑیوں سے سیدھ باندھی، اُن میں سے ایک شعلہ نکلا اور جیسے کسی چیز نے پنجوں سے چیر کر ڈال دیا۔ ایک ایک کر کے کئی ہاتھی ان سفید بندروں نے ان لکڑیوں سے مار ڈالے تھے۔ مرے ہوئے ہاتھی تو وہیں چھوڑ دیئے جاتے تھے، بس ان کے دانت کالے مزدوروں پر لاد کر چل دیتے تھے۔ اِن تباہ کاریوں اور شکستوں سے نماکو نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اُسے گوشت کے پرخچے اُڑانے والی گولیوں کی تکلیف کا تجربہ خود بھی تھا۔ اُس کے سیاہ چمڑے کو تیس گولیاں پھاڑ کر اندر گھُس چکی تھیں۔ ایک نے تو اس کا پچھلا دھڑ بے کار سا کر دیا تھا۔ لیکن آج تک کسی نے اُسے گھٹنوں کے بل بھی نہیں جھکایا تھا۔ آٹھ سفید بندروں سے نماکو انتقام لے چکا تھا۔ اُس کا نام نماکو تھا۔ وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا!

جنگل کی نرم سبزی میں نماکو اپنا مرغوب چارہ تلاش کر کر کے کھا رہا تھا۔ غول دو میل دُور تھا۔ نماکو اس قطعے میں اکیلا آیا تھا، تاکہ خوب سیر ہو کر کھائے۔ اس میں بھی بُڈھوں کی سی ہوسناکی و خودغرضی پیدا ہو گئی تھی۔ اِس لئے سب سے الگ تھلگ اپنا پیٹ بھرنے کا لطف اُٹھا رہا تھا۔ اس کے بڑے بڑے زرد دانت زمین کو اُدھیڑ رہے تھے۔ چاروں طرف جنگل کا سنّاٹا پھیلا ہوا تھا۔ نماکو بلاشرکتِ غیرے سارے جنگل کا بادشاہ تھا۔

گرمیوں کی دوپہر تھی۔ ہر چیز پر ایک سُستی سی چھائی ہوئی تھی۔ دُور سے دلدل کی خوشگوار بدبو آ رہی تھی۔ اِس پُرسکون سے متاثر ہو کر نماکو نے اپنی سُونڈ سُورج دیوتا کی طرف شکر گزاری

سے اٹھائی۔ پھر ایکا ایکی سونڈ اونچی اُٹھ کر رہ گئی ۔ اور بڑے بڑے کان
ہوشیاری سے ہلنے لگے ۔ انسان! کوئی سفید بندر قریب تھا۔
عقلِ حیوانی نے اُسے بتایا کہ وہ ہاتھی جسے کوئی نہیں مار سکتا
شکاری کا نشانہ بنا چاہتا ہے ۔ اور یہ بھی اس نے محسوس کیا کہ سفید
بندر بڑے صبر و سکون سے اس کی گھات لگا رہا ہے ۔ صرف بُو سے
اس کی موجودگی کا پتہ چلا تھا، اور وہ بھی جب کہ اس کا فاصلہ چند قدم
سے زیادہ نہیں تھا۔ ناگو کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے پیچھے جو چالاک
دماغ تھا بجلی کی سی تیزی سے کام کرنے لگا۔ چال بازی کا جواب
چال بازی سے دینا چاہیئے ۔

راآبن بھی اکیلا تھا۔ عبدل کو اس نے پیچھے کیمپ پر بضد ہو
کر چھوڑ دیا تھا۔ خود اکیلا ہاتھی کے کھُروں کا کھوج لیتا ہوا یہاں تک پہنچا
تھا۔ جنگل میں چلنے کی خاص چال سے، جس میں میلوں چلنے پر بھی تھکان
نہیں ہوتی ۔ راآبن چلتا رہا اور بڑھاپے کی کمزوری اور زندگی کی
بے ثباتی پر غور کرتا رہا ۔ اُسے اپنی موجودہ زندگی بے کار نظر آ رہی تھی ۔
مارو یا مر جاؤ۔ بس یہی اصولِ زندگی ہے ۔ شہروں میں بھی اور جنگلوں
میں بھی ۔ اپنے شکار پر جست کرنے کے لئے درندے گلی کوچوں کی
تاریکی میں بھی چھپے رہتے ہیں ۔ اور جنگل کی قد آدم گھاس میں بھی ۔
بجلی کے کھمبے ہوں یا جنگل کے درخت، دونوں انسانی زندگی کی
شاہراہِ موت میں یکساں طور پر تباہ کار ہیں ۔

لیکن جب راآبن کو اِس کا خیال آیا کہ آج جنگل میں ایسا مقابلہ ہے
جو ادھر یا اُدھر ہو کر رہے گا تو اس کی آنکھیں مسکرا کر رہ گئیں ۔ برسوں سے
یہ پست قد سفید آدمی اُس عظیم الجثہ بڑے بڑے زرد دانتوں والے ہاتھی
کی فکر میں تھا۔ جس کا نام ناگو تھا۔ مختلف موقعوں پر راآبن نے پانچ گولیاں
اس ہاتھی کی کھال میں پیوست کی تھیں جسے کوئی نہیں مار سکتا۔ لیکن
ان موقعوں پر بھی موت ناگو سے زیادہ راآبن کے قریب تھی ۔ شکاری
کچھ تو اپنی قسمت سے اور کچھ جنگل کی چال بازیوں سے اچھی طرح واقف
ہونے کی وجہ سے بچ بچ گیا ۔ ناگو پر گولیاں بظاہر بے اثر ثابت ہوئی
تھیں ۔ اِس لئے اُس کی دھاک اور بھی بیٹھ گئی تھی ۔

ایسے جانور کا پیچھا کرنا اور وہ اس طرح کہ رائفل میں صرف
پانچ گولیاں ہوں بجائے خود ایک حماقت تھی ۔ راآبن نے اپنے دِل
میں ہنس کر کہا "یہ بھی ایک بڈھے کی بے وقوفی ہے" اس نے ساری
عمر جُوا کھیلا تھا۔ درندوں کے ساتھ، زندگی اور موت کا جُوا کھیلنے میں عمر
گذری تھی ۔ اب تک وہ برابر جیتتا رہا تھا۔ مارو یا مر جاؤ کے مقولہ پر اُس
کا عمل تھا۔ ممکن ہے زندگی کا یہ سب سے بڑا داؤ بھی وہ جیت جائے۔
آہستہ آہستہ وہ رینگ کر آگے بڑھا۔ اُس کے دُبلے پتلے ہاتھ میں رائفل
بھی آگے کھسک آئی ۔

لمبی لمبی گھاس میں اُس نے کچھ فاصلے پر ہاتھی کا سایہ دیکھا ۔
جانور کے چوکنا ہونے سے اُس نے سمجھ لیا کہ وہ بُو پا گیا ہے۔ لیکن
کیا جانور کو اس کی جگہ کی بھی خبر ہو گئی ہے؟ اُس نے ناگو کو پھر سونڈ
نیچے کر کے چارہ اٹھاتے دیکھا۔ راآبن کو یہ چال دھوکہ نہ دے سکی ۔ ناگو
بھی آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ شکاری اور شکار
دونوں ایک دُوسرے سے اس وقت جان بوجھ کر لاعلمی ظاہر کر رہے
تھے ۔ راآبن ساکت رہا ۔ اور ناگو اپنی سونڈ خواہ مخواہ سبزے میں پھراتا رہا۔

آدھ گھنٹے تک یہ ابتدائی حرکات جاری رہیں ۔ سفید بندر
جہاں پڑا ہوا تھا ناگو کو اس مقام کا صحیح اندازہ تھا۔ اُس کی چالاک
آنکھوں نے ایک سفید چڑیا کو وہاں سے بچ کر اُڑتے دیکھا تھا۔ وہ
اکھیڑ اکھیڑ کر کچھ کھاتا جاتا تھا اور دھاوا بول دینے پر غور کر رہا تھا۔ لیکن
اگر ایسا کیا تو سو گز پرے ہی سے شکاری اپنی شعلہ اُگلنے والی لکڑی
چلا دے گا ۔ اُس نے اپنے دل میں سمجھ لیا کہ آج جنگل میں کسی بیوقوف
سے مقابلہ نہیں ہے ۔

شام ہو چلی تھی ۔ سورج شفق کے سمندر میں غوطے کھا رہا تھا۔
اِس پس منظر پر مُڑے تُڑے درخت کالی پرچھائیاں سی نظر آ رہے
تھے ۔ اس وقت وہ گھاس متحرک ہوئی جہاں سفید بندر دبکا ہوا تھا۔
چُپکے چُپکے ناگو چند قدم آگے بڑھا، تاکہ خطرے کے مقام سے ہٹ
جائے کیونکہ غروب ہونے والے سورج کے پس منظر پر اُس کا ڈیل
ڈول آسانی سے نشانہ بن سکتا تھا۔ اِس لئے ہٹتے ہی شکاری بھی
کھِسکا ۔ راآبن مُنہ ہی مُنہ میں ایک گالی بڑبڑا کر رہ گیا ۔ کیونکہ ہاتھی کی اِس
حرکت نے اُس کے منصوبے درہم برہم کر دیئے ۔ فاصلہ اس قدر
زیادہ تھا کہ گولی چلانا کارآمد ثابت نہ ہوتا ۔

راآبن اور بھی آگے کھِسکا ۔ ناگو اُسے لالچ دے رہا تھا ۔
اس کا گھاس کھانا فریب آمیز تھا۔ راآبن نے قریب کے ایک مضبوط
درخت کو تاڑا ۔ اگر ہاتھی حملہ کر دے تو جان بچانے کا ایک یہ بھی

سہارا ہو سکتا ہے ۔ درخت دس گز کے فاصلے پر تھا ۔ بس ایک گز اور
اس کی طرف کھسک جائے تو خطرے سے نکل جائے ۔

لیکن اسی لمحہ میں زمین لرزنے لگی ۔ نماکو نے اس کا مدعا تاڑ کر
دھاوا بول دیا تھا ۔ اب یہ دیو کا دیو اس کی جانب دانت تانے رتھ
کی طرح گرجتا چلا آ رہا تھا ۔ راجن کے لئے اب ایک ہی صورت باقی تھی
فوراً ایک گھٹنا جھکا ، رائفل چھتیا اس نے گولی داغ دی ۔ سامنے کا وار
وہ نہیں کرنا چاہتا تھا ۔ مگر اب جان ہی پر آ بنی تھی تو یہی کرنا پڑا ۔

گولی نشانے پر بیٹھی ۔ مگر اس ریلے کو کس کی مجال تھی کہ روک
سکتا ! راجن ایک ہاتھ میں رائفل لئے لئے درخت کی طرف لپکا ۔ اور
اچھل کر ایک ٹہنی میں جھول گیا ۔ جب درخت پر چڑھ گیا تو ایک دبی
ہوئی چیخ اس کے منہ سے نکلی ۔ ہاتھی کے گزرنے سے ہوا کا ایک
زناٹا آیا ۔ پھر غصے کی چنگھاڑ سنائی دی ۔ اور خاک کا بادل زمین سے
اٹھا ۔ چشم زدن میں نماکو پلٹ پڑا ۔ اور درخت سے ٹکرایا ۔

ایک خوفناک تڑاخہ ہوا ۔ اب کے درخت گر جائے گا ۔ ٹہنے
پر سنبھل کر راجن نے شست لگائی اور ریڑھ پر گولی چلائی ۔

دھماکہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا ۔ کہ درخت جھول گیا ۔ اس کی گولی
نے کھال پھاڑ دی تھی ، لیکن مہلک ثابت نہیں ہوئی تھی ۔ نماکو اس
کے صدمہ سے ذرا کی ذرا رکا اور گھٹنے پر جھکا بھی مگر راجن اس کی
نگوں ساری دیکھ نہیں سکا ۔ وہ کانٹوں دار جھاڑیوں میں گھسا چلا جا
رہا تھا ۔ رائفل اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی ۔ درخت سے گرنے میں
اسے چکر سا آ گیا تھا ۔ وہاں پڑا ہوا وہ آسمان کی طرف گھور رہا تھا ۔
اور سوچ رہا تھا کہ ہاتھی کا پاؤں اس پر اب پڑا کہ اب پڑا ۔ چکرائی
ہوئی آنکھوں سے دیکھنے میں بھی اسے آسمان سفید نظر آ رہا تھا ۔
جیسے کسی مردے کا چہرہ ہو ۔

ہاتھی کا پاؤں راجن پر نہیں پڑا ۔ نماکو غصے میں جھنجھلا رہا تھا ۔
کوئی چیز اس کی جان اس کے جسم میں سے نکال رہی تھی ۔ اس نے
اپنی سونڈ اونچی کی اور غول کو آواز دی ۔

پُواو پُواو پُواو پُواو !

یہ چنگھاڑ جنگل میں گونج گئی ۔ لیکن غول کئی میل دور تھا ۔ اس
سے پہلے کہ سارے کالے پہاڑ جمع ہوں اور گھیرا ڈال کر حملہ کریں موت
یا تو انسان کو یا جانور کو آنی لازمی تھی ۔

چنگھاڑ کی آواز نے راجن کو چونکا دیا ۔ وہ اچھل کر اپنے
پیروں پر کھڑا ہو گیا ۔ نیم بے ہوشی کی حالت ہی میں اس نے دیکھا
کہ کالا پہاڑ چند قدم کے فاصلے پر کھڑا چیخیں مار رہا ہے ۔ بڑی ہمت
کر کے اس نے پھر رائفل چھتیائی اور گولی چلا دی ۔

دھماکے کے ساتھ ہی ایک اور غصے کی چنگھاڑ سنائی دی اور
ہاتھی غائب ہو گیا ۔

کیا اس نے کالے پہاڑ کو گرا لیا تھا ؟ راجن کے کپڑے کانٹوں
میں الجھ الجھ کر تار تار ہو گئے تھے ۔ اور جگہ جگہ کھرنچیں لگ لگ کر
وہ خونم خون ہو رہا تھا ۔ کانٹوں کی باڑ میں سے بمشکل تمام وہ باہر
نکلا ۔ اسے امید تھی کہ سامنے مرا ہوا ہاتھی پڑا ہو گا لیکن وہاں میدان
صاف نظر آیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین پھٹ گئی ۔ اور نماکو اس
میں سما گیا ۔

اس نے اپنی آنکھیں ملیں ۔ شام کی ملگجی روشنی میں اس نے
ایک بڑا سا سایہ جھاڑیوں میں گزرتا دیکھا ۔ نماکو فرار ہو رہا تھا ۔ راجن
تھک کر چور ہو رہا تھا ۔ مگر یہ دیکھ کر اس کی ساری تھکان جاتی
رہی ۔ اور بڑھتے ہوئے حوصلے سے اس کے تعاقب میں چل پڑا ۔

جھاڑیوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بھوتوں کا جلوس نکل
رہا ہے ۔ دن کی روشنی تیزی سے غائب ہو رہی تھی ۔ لیکن راجن کو
روکنے والی کوئی چیز نہیں تھی ۔ اس آخری کھوج کو وہ کیسے چھوڑ
دیتا ؟ خون کی ایک لکیر نے بتایا کہ ہاتھی بری طرح زخمی ہوا ہے ۔ اور
بجائے سنبھل سنبھل کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے کے راجن
جھاڑیوں میں اڑا چلا جا رہا تھا ۔ جھاڑیوں اور درختوں کو کچلنے اور توڑنے
کی آوازیں اس کے کانوں میں آ رہی تھیں ۔

پھر خاموشی ہو گئی ۔ نماکو رک گیا تھا ۔ کیا آخری حملہ کرنے
کے لئے تیار ہو رہا تھا ؟ راجن ٹھٹکا نہیں ۔ اس نے سمجھ لیا کہ ہاتھی
اس کا انتظار کر رہا ہے ۔ اور اب مقابلے کی آخری گھڑی آ پہنچی ہے
وہ اچھل کر اور آگے بڑھا ۔

مرنے والے دن کی سسکتی ہوئی روشنی میں نماکو دکھائی
دے رہا تھا ۔ اس کے کھڑے ہونے کے ڈھنگ سے معلوم
ہوتا تھا کہ ہزیمت خوردہ اور لائق رحم ہے ۔ راجن کو اس پر ترس
آنے لگا ۔ زمانے نے ایک دفعہ پھر انہیں آمنے سامنے لا کھڑا

گیا تھا . . . پُرانا ہاتھی اور پُرانا شکاری ۔ رآبن نے دیکھا کہ نماکو کی دُھندلی سُرخ آنکھیں اُسے گھُور رہی ہیں ۔ ایک لمحہ پھیل کر لامتناہی ہوگیا تھا ۔ اور اس لمحہ کے لئے انسان اور جانور ایک دُوسرے کو کھڑے دیکھتے رہے ۔

جیسے مشین خودبخود چلتی ہے اُسی طرح رآبن نے بغیر ارادے کے رائفل پھر چھتیائی ۔ یہ جان کر کہ اب کے جو وار ہوگا ، مہلک ہوگا ۔ بوڑھے ہاتھی نے تن کر مقابلے کے لئے آخری دفعہ اپنی سُونڈ اوپر اُٹھائی مگر مقابلے کی دعوت دینے والی چنگھاڑ ایک دبی ہوئی کمزور چیخ بن کر نکلی ۔

پوّاو پوّاو پوّاو پوّاو !

رائفل کا دھماکہ ہوُا ۔

بارُود کے دُھوئیں میں رآبن نے آنکھیں مچکا کر اس سمت کو دیکھا جہاں نماکو کھڑا تھا ۔ مگر یہ دیکھ کر اُسے حیرت ہوئی کہ بوڑھا کالا دیو اس پر ایک خفگی کی نظر ڈال کر پلٹ گیا ۔ اور آہستہ آہستہ آگے چلا گیا ۔ معجزہ سچ ثابت ہوچکا تھا ۔ اس ہاتھی کو جسے کوئی نہیں مار سکتا ، کوئی گولی ہلاک نہیں کرسکتی تھی ۔

رآبن اول فول بکتا ، جاتے ہوئے ہاتھی کے پیچھے لپکا ۔ اُس کے پاس ایک کارتوس اور رہ گیا تھا ۔ اِسے ایک گز کے فاصلے سے ہاتھی پر چلانا چاہتا تھا ۔ تھکان نے اس کے پیر شل کر دیئے ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لئے ۔

ایک لمحہ بعد یوُں معلوم ہوُا کہ کمر تک کا دم نکل گیا ۔ بوُڑھا شکاری بے سُود کوشش کرتا رہا ۔ اب اُسے معلوم ہوُا کہ بات کیا ہے ۔ نماکو اُسے اپنے پیچھے دلدل میں لگا لایا تھا ۔ وہی دلدل جو ہاتھیوں کا قبرستان تھی ۔ یہاں بڑے بڑے جانور مرنے آتے تھے ۔ تاکہ اُسی کالی کیچڑ میں دھنس جائیں جس سے کبھی ان کا جسم بنا تھا ۔ رآبن کے پیروں تلے ہاتھی دانت کا دفینہ تھا ۔ مگر دھسن میں وہ اس طرح پھنس چکا تھا جیسے مکھی سریش میں پھنس جاتی ہے ۔

اس نے نااُمیدی سے چاروں طرف دیکھا ۔ چند گز آگے نماکو دلدل میں خاموش ڈوبتا چلا جا رہا تھا ۔ وہ مر بھی رہا تھا ۔ اُس کی آنکھوں میں سے بڑے بڑے آنسو نکل کر بہنے لگے ۔ سُونڈ اپنے دشمن انسان کی طرف بڑھا دی گویا وقتِ آخر دوستی کا ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیا ۔ رآبن کی کشمکش ختم ہوچکی تھی ۔ اُس کا بھی وقت آپہنچا تھا ۔ اُس نے رائفل دُور اُچھال دی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے دلدل میں غرق ہوگئی ۔ ایک منٹ کے اندر اندر وہ بھی وہیں پہنچ جائے گا جہاں رائفل پہنچ گئی تھی ۔

ایک بار پھر انسان اور حیوان نے ایک دوسرے کو دیکھا ۔ رآبن اپنی قسمت پر صابر ہوچکا تھا ۔ یہ انجام دونوں کے شایانِ شان تھا ۔ اُس نے لمبے لمبے زرد دانتوں کو دلدل میں دھنستے دیکھا اور اُس نے چلّا کر کہا "ہم پھر ملیں گے نماکو" ۔

اس کے بعد دلدل ان کے سروں پر ہموار ہوگئی اور رات نے اپنا تاریک دامن کالی کیچڑ پر پھیلا دیا ۔

(ولیم جے میکن) **شاہد احمد دہلوی**

تسلّی

چند روز اَور مری جان! فقط چند ہی روز،

ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم،
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں،
اپنے اجداد کی میراث ہے، معذور ہیں ہم!
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں،
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں،
اپنی ہمّت ہے کہ ہم پھر بھی جئے جاتے ہیں!
زندگی کیا، کسی مفلس کی قبا ہے، جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں!
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر! کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں!
عرصۂ دہر کی جُھلسی ہوئی ویرانی میں
ہم کو رہنا ہے، پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے،
اجنبی ہاتھوں کا بے نام، گرانبار ستم
آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے!
یہ ترے حُسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد،
اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار،
چاندنی راتوں کا بیکار، دہکتا ہُوا درد،
دل کی بے سود تڑپ، جسم کی مایوس پکار

چند روز آور، مری جان! فقط چند ہی روز!

فیض احمد فیض

محلّات جانعالم اور اُن کی شاعری

سلطانِ عالم محمد واجد علی شاہ اختر آخری فرمانروائے اودھ کی بدنصیبی ۱۱ رفروری ۱۸۵۶ء سے شروع ہوتی ہے ۱۸۵۶ء سے آج تک اس بدنصیب بادشاہ کی بدبختی پر جس قدر افسوس کیا گیا اور آئندہ بھی جتنا کیا جائے کم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر تاریخ ہند کی ورق گردانی کی جائے تو جانعالم جیسا رنگیلا اور دُکھی بادشاہ کوئی نہ ملے گا، یوں تو بہت سے غم نصیب فرمانروا مثلاً ابوالحسن تاناشا، محمد شاہ رنگیلے، شاہ ظفر وغیرہ گزرے ہیں مگر آخری تاجدارِ اودھ سا کوئی نہیں گزرا۔

عام طور پر یہ مشہور ہے کہ واجد علی شاہ حکومت کے ناقابل اور امورِ سلطنت سے بالکل کورے تھے۔ اس لئے گورنمنٹ نے انہیں معزول کر دیا، کہا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف سلطنت کے نظم و نسق سے ناواقف بلکہ بزدل اور ڈرپوک بھی تھے۔ وہ حسین عورتوں کے عاشق اور خواجہ سراؤں کے سرپرست تھے۔ رات دن شغلِ مے و مینا اور عیش و عشرت میں منہمک رہتے تھے اور یہی ان کی روزانہ زندگی کا مشغلہ تھا اگر وہ حسن پرست اور رقص و سرود کے دلدادہ اور محض شیر قالین نہ ہوتے تو آج اودھ پر انہی کی نسل حکومت کرتی۔

یہ سچ ہے کہ سلطانِ عالم "بتانِ نوبہار" کے شیدائی، ناچ، رنگ کے دلدادہ اور عورت کی محبت کے بھوکے تھے۔ ان کی حکومت اور قابلیت فقط محلات ہی کی حد تک تھی، مگر ساتھ ہی ساتھ معترضین کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ کسی کی زندگی پر تنقید کرنے یا اس کے اخلاق اور قابلیت پر نکتہ چینی کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہوتا جیسا کہ آج کل کسی ایک کے کمزور پہلو کو لے کر بہت ہی سخت اور ناشائستہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں۔ ایسا کرنا، انتقاد پر ظلم کرنا ہے۔ چاہیئے تو یہ کہ جب کبھی کسی کی زندگی یا قابلیت پر تنقید کریں تو سب سے پہلے اس کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں پر ایک گہری نظر ڈال کر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور اس شخص کے طور و طریق، عادات و اطوار، جہل اور قابلیت کو الگ الگ جانچ کر اس پر قلم اٹھائیں اور بغیر کسی ذاتی عناد کے تنقید کریں، مگر افسوس ہے کہ آج کل بہت کم ایسی تنقیدیں دیکھنے میں آتی ہیں جو صحیح اور بے لاگ ہوتی ہوں، چنانچہ اسی بنا پر میں واجد علی شاہ کے معترضین سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ ایک ایسا بادشاہ جو برائے نام ہو اور اس کی بادشاہی صرف دستخط کی حد تک ہو اور اس کو غیر کے اشارے پر ہر ایک حرکت کرنے کے لئے مجبور کر دیا جائے۔ تو وہ سوائے اپنے گھر کی حد تک حکومت کرنے کے اور کیا کر سکتا ہے؟ وہ کس طرح اپنی قابلیّت کا مظاہرہ کرے؟ ان حضرات پر جو وقتاً فوقتاً واجد علی شاہ کی برائی کرنے پر تیار رہتے ہیں یہ اچھی طرح واضح رہے کہ باوجود اس تمام قید و بند اور روک ٹوک کے اختر پیا کبھی امورِ سلطنت سے غافل نہیں رہے بلکہ حتی الامکان اپنی رعایا کی فریاد سنتے تھے، اور مظلوموں کی مدد کرتے تھے۔ چنانچہ اس کا ثبوت محل خانۂ شاہی صفحہ ۱۱ میں اختر پیا کی خود نوشتہ تحریر سے مل سکتا ہے وہ تحریر فرماتے ہیں کہ

"میں نے خلقت کی دادخواہی کے واسطے چاندی کے صندوقچے
لکڑیوں پر نصب کروا کر اردلی کے سواروں کو دئے تھے کہ جو شخص
عرضداشت اس میں چھوڑے وہ جمع ہو کر دوسرے روز میرے
ملاحظہ میں گذرانی جائیں۔"

اس کا ایک اور ثبوت مولانا عبدالحلیم شررؔ مرحوم کی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" سے بھی مل سکتا ہے۔ جس میں مولانا نے چشم دید واقعات قلم بند کئے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"واجد علی شاہ کی سلطنت کا آغاز تو اس عنوان سے ہوا کہ نوجوان
بلکہ بادشاہ کو عدالت گستری اور اصلاح فوج کی طرف غیر معمولی

تو تبھی سواری میں آگے آگے دو نفری صندوق چلتے جس کسی کو کچھ شکایت ہوتی عرضی لکھ کے ان میں ڈال دیتا۔ کبھی خود بادشاہ کے پاس رہتی۔ محل میں پہنچ کے حضور ان عرضیوں کو نکالتے اور اپنے ہاتھ سے احکام تحریر فرماتے۔" ص۴۹

یہی وجہ تھی کہ واجد علی شاہ دس سال یعنی ۱۸۴۷ء سے ۱۸۵۶ء تک باوجود شاہ محض ہونے کے والیٔ اودھ کہلاتے رہے اور انہیں کے دم کی برکت تھی کہ اودھ اختر پیا کے زیرِ سایہ رشکِ ارم بنا ہوا تھا۔ اور مسلسل دس سال تک اودھ کے ہر گھر میں محفلِ عیش و نشاط کی دھوم، ہر گوشے میں حسن و عشق کی چھیڑ چھاڑ، ہر گلی میں گل رویوں اور بادہ خواروں کا ہجوم، ہر بام پر حسنِ دلنواز کی جلوہ آرائیاں، ہر کوچہ پر مہوشانِ اودھ کے قہقہے سنائی دیتے تھے اور بڑے بڑے محلوں میں زربفت کے پردوں کے اندر ایرانی قالینوں پر حریری ملبوس میں بیسیوں سیم تن نشۂ حسن و شباب میں مدہوش دکھائی دیتے تھے، غرض کہ اودھ کی ہر شب شبِ برات اور ہر دن روزِ عید کا نظارہ پیش کرتا تھا اور یہ تمام عیش و مسرت اختر پیا کے دم قدم سے تھی "شامِ اودھ" واقعی انہیں کے دم سے شامِ اودھ تھی، ورنہ امجد علی شاہ جنت مکان کے انتقال کے بعد ہی سلطنتِ اودھ کا خاتمہ ہو گیا ہوتا یہ واجد علی شاہ ہی کی رعایا پروری تھی جس کی وجہ سے اور دس سال تک اودھ میں واجد علی شاہ ٹکے رہے ورنہ انہیں دس سال پہلے ہی کلکتہ جانا پڑتا۔ چنانچہ میرے اس بیان کی تصدیق شرر مرحوم کی تحریر سے ہو سکتی ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

"... اب امجد علی شاہ کے بڑے بیٹے واجد علی شاہ تختِ سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے۔ ان کا زمانہ اس مشرقی دربار کی تاریخ کا آخری ورق اور اسی مرثیۂ پاستان کا آخری بند ہے۔ چونکہ انتزاعِ سلطنت انہیں کے عہد میں ہوا اس لئے تمام اہل الرائے کے ہدفِ سہام اور نشانۂ ملامت وہی بن گئے اور قریب قریب یہ قطعاً تسلیم کر لیا گیا کہ زوالِ سلطنت کا باعث وہ تھے۔ لیکن جس زمانے میں ان کی سلطنت کا خاتمہ ہوا ہے ان دنوں ہندوستان کی وطنی قوتیں ٹوٹ رہی تھیں اور بری بھلی سب طرح کی قدیم حکومتیں دنیا سے مٹتی جاتی تھیں۔ پنجاب میں سکھوں کا اور دکن میں مرہٹوں کا دفتر کیوں الٹا جو بہادر اور زبردست اور ہوشیار مانے جاتے تھے؟ دہلی میں مغل شہنشاہی کا اور بنگالے میں نوّاب ناظمِ بنگالہ کا استیصال کیوں ہوا؟ حالانکہ ان میں اتنی طفلانہ مزاجی نہ تھی جتنی کہ لکھنؤ کے اریکہ آرائے سلطنت میں بتائی جاتی ہے۔ مذکورہ چاروں درباروں میں کوئی واجد علی شاہ نہ تھا، حالانکہ ان کی تباہی لکھنؤ کی تباہی سے کم نہ تھی۔ اصل یہ ہے کہ اس عہد میں ادھر اہلِ ہند کی غفلت و جہالت کا پیمانہ چھلکنے کے قریب پہنچ گیا تھا اور اُدھر دولتِ برطانیہ کی قوت اور برٹش قوم کی عاقبت اندیشی قابلیت، جفاکشی اپنی کوششوں اور اپنی اعلےٰ تہذیب و شائستگی کا ثمرہ پانے کی روز بروز مستحق ثابت ہوتی جاتی تھی۔ غیر ممکن تھا کہ دانایانِ فرنگ کی ذہانت و طباعی، خوش تدبیری و باضابطگی ہندوستان کی جہالت و خود فراموشی پر فتح نہ پاتی۔ زمانے نے ساری دنیا میں تمدن کا نیا رنگ اختیار کیا تھا۔ اور پکار پکار کے ہر ایک قوم سے کہہ رہا تھا کہ جو اس مذاق میں میرا ساتھ نہ دے گا مٹ جائے گا۔ زمانے کے اس ڈھنڈورے کی آواز ہندوستان میں کسی نے نہ سنی اور سب مٹ گئے۔ انہیں مٹنے والوں میں اودھ کی سلطنت بھی تھی جس کے زوال کا بار غریب واجد علی شاہ پر ڈال دینا محققانہ مذاق کے خلاف ہے۔" صفحہ ۵۱۰ و ۵۲۵

یہ تو ہیں وہ اعتراض اور ان کے جواب جو غریب اختر کے دورِ حکومت کے زمانے سے متعلق ہیں اور اسی وجہ سے اس غریب کو دنیا کا بدترین اور ناکارہ آدمی سمجھا گیا۔ حالانکہ یہ حقیقت کے بالکل منافی ہے۔ میں بلا خوفِ تردید یہ کہوں گا کہ واجد علی شاہ ایک بہت گراں پایہ صاحبِ ذوق و وجدان انسان تھا اور اُس نے نہ صرف اپنے چند سالہ دورانِ حکومت میں بلکہ قید اور اس کے بعد کے زمانے میں بھی وہ وہ جدتیں اور اختراعات کیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کی جدت کا ایک ادنیٰ نمونہ کلکتہ کا مٹیا برج ہے۔ مٹیا برج کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ جب واجد علی شاہ قلعے سے چھوٹ کر شہر آئے اس وقت موچی کھولا میں ایک بڑی کوٹھی راجہ بردوان کی تھی جس کے ایک سو ایک کمرے تھے اور ان دنوں یہ کوٹھی بالکل خالی پڑی ہوئی تھی، مہاراجہ بردوان یہ کوٹھی ایسے شخص کو کرائے پر دینا چاہتے تھے جو اس کوٹھی کے ہر کمرے کو روشن رکھے، جب واجد علی شاہ قید سے چھوٹنے لگے تو مہاراجہ بردوان نے

ان سے خواہش کی کہ اس کوٹھی میں قیام فرمائیں اور بطور نذر قبول کریں۔ واجد علی شاہ نے مہاراجہ بردوان کی اس کوٹھی کو قبول کیا اور اس میں قیام فرمایا، اس کوٹھی کے شمال کی طرف بھاگیرتی دریا تھا۔ یہاں واجد علی شاہ نے قیام کر کے دریا کے کنارے مسلسل نئی کوٹھیاں بنوائیں اور ہر ایک کا نام جُدا جُدا رکھا اور یہ سب کوٹھیاں رنگین تھیں اور ہر ایک کوٹھی کا رنگ الگ الگ تھا۔ بھاگیرتی کے مشرقی جانب پہلی کوٹھی بادام کوٹھی تھی اور اس کا رنگ بھی بادامی تھا اور آخری کوٹھی کا نام سلطان خانہ تھا، سلطان خانہ سے دکھن کی طرف ایک مٹی کا بہت اونچا ٹیلہ تھا۔ جب واجد علی شاہ کی نظر اس ٹیلے پر پڑی تو اس جدت پسند بادشاہ نے اسے کھدوانے کی بجائے ارد گرد کی زمین ہموار کروا دی اور اس ٹیلے کو ترشوا کر مینارہ بنوا دیا اور اوپر ایک کمرہ تیار کر کے اطراف میں جنگلہ لگوا دیا اور اس میں ایک شیر چھوڑ دیا اسی زمانے سے یہ حصہ مٹیا برج کہلانے لگا[۱]، اس سے پہلے اس کو مٹیا برج کوئی نہ کہتا تھا۔

اسی قسم کے بیسیوں واقعات واجد علی شاہ کی انتزاعِ سلطنت اور اس کے نظم و نسق اور اختراعات وغیرہ سے متعلق ہیں، اب دیکھنا یہ ہے کہ آخر واجد علی شاہ نے اپنے دورِ حکومت میں کچھ کیا بھی یا نہیں، یہ ایک ایسا سوال ہے جو قدرتی طور پر واقعات بالا کا مطالعہ کرنے والے کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور یہی فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔

واجد علی شاہ نے اپنی حد تک جس قدر عدل و داد کی فکر کی میں نے پہلے لکھ دیا ہے مگر یہ کارنامے واجد علی شاہ کے حقیقی کارنامے نہیں تھے اور نہ ان کو دہرا کر تاریخ اختر کا نام ظاہر کر سکتی ہے۔ ان کا حقیقی کارنامہ اردو کی سرپرستی اور ترویج و اشاعت ہے۔ واجد علی شاہ نے یوں تو ولی عہدی کے زمانے ہی سے اردو کی سرپرستی شروع کر دی تھی۔ مگر تخت نشینی کے بعد سے تو انہوں نے اپنے آپ کو اردو کے لئے گویا وقف کر دیا، ان کے محبوب مشغلے صرف دو تھے۔ ایک شاعری دوسرا موسیقی (چونکہ اس وقت میرا موضوع محلات کی شاعری ہے اس لئے موسیقی کو نظر انداز کرتا ہوں۔ آئندہ کسی صحبت میں واجد علی شاہ کی موسیقی پر تفصیلی نظر ڈالوں گا) ہندوستان میں سب سے پہلے اردو کے اسٹیجی ڈراما کو عالم وجود میں لانے والے یہی تھے چنانچہ انہیں کی وجہ سے امانت کی "اندر سبھا" ظہور میں آئی واجد علی شاہ عروسِ اردو کے ایسے والا و شیدا تھے کہ سارے دربار کو بڑے بڑے شعرا اور اعلیٰ نثاروں سے بھر دیا تھا، بڑی بڑی تنخواہیں اور وظیفے ان کے لئے مقرر کر دیئے تھے۔ ان کی اردو سرپرستی کا کھلا ثبوت یہ ہے کہ ان کے دربار میں ناظموں اور نثاروں کی تعداد سترہ سو تھی، مثنوی "حزنِ اختر" میں اس تعداد سے متعلق ارشاد ہوتا ہے کہ

فقط سترہ سو تھے اہلِ قلم طبیبوں کو کر پانچ سو تو رقم

محل میں تمام خواتین کو باضابطہ تعلیم دلوائی جاتی تھی اور تقریباً کل ممنوعات جن کی تعداد ستر کے قریب تھی بڑی اچھی شاعرہ تھیں۔ جن میں سے اکثر نثر بھی خوب لکھتی تھیں چنانچہ "بیگمات اودھ کے خطوط" کے عنوان سے میرا ایک تفصیلی مضمون سالنامۂ ادبی دنیا بابت ۱۹۳۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔

انگریزوں نے واجد علی شاہ کو معزول کر دیا اور اپنے حسابوں ان کی بادشاہت کا خاتمہ کر ڈالا مگر قدرت کو واجد علی شاہ کی حکومت میں وسعت دینی منظور تھی اس لئے اس نے بظاہر دنیا کی مادی چیزوں پر سے ان کی حکومت اُٹھالی اور اس کی جگہ انہیں اقلیم زبان پر حکمران کر دیا، لکھنؤ تو واجد علی شاہ کا ہو ہی چکا تھا۔ قدرت نے بنگال میں بھی ان کا گزرا سکہ جاری کر دیا۔ وہ کلکتہ جس میں اردو سمجھی تک نہ جاتی تھی وہاں اردو بولی جانے لگی اور واجد علی شاہ کے کلکتے پہنچنے کے بعد سے انتقال تک آہستہ آہستہ اردو نے اتنی ترقی کی کہ سارا بنگال اردو سمجھنے اور بولنے لگا، شعر و شاعری کے علاوہ نثر نگاری کا بھی چرچا شروع ہو گیا، مطابع کھل گئے اور کلکتہ کی دوسری زبان اردو کہلانے لگی۔

واجد علی شاہ کے خاندان کے اکثر افراد وہیں رہ پڑے، متوسلین نے کلکتے کو وطن بنا لیا، بعض لوگ بہار، رمنہ، ڈھاکہ وغیرہ میں ٹھہر گئے اس طرح اردو نے بنگال میں نشو و نما پائی۔ آج کلکتے میں جو اردو کی چہل پہل، ادب و شعر کا مذاق نظر آتا ہے یہ واجد علی شاہ اور صرف واجد علی شاہ کا تصدق ہے۔

لوگوں کو یہ معلوم کر کے حیرت ہو گی کہ کلکتے میں پہلا لیتھو پریس "مطبع سلطانی" کے نام سے واجد علی شاہ نے قائم کیا تھا جس میں ان کی تصانیف اور ان کی حرموں کے "تودونا مجات" وغیرہ طبع ہوئے ہیں، افسوس ہے

[۱] عابد مرزا بیگم مرحومہ کا چشم دید واقعہ ہے مرحومہ نے میری خواہش پر یہ واقعہ لکھ ادیا تھا۔ علاوہ اس کے اس واقعہ کو شرر مرحوم نے بھی "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ" میں تحریر فرمایا ہے۔ تسکین۔

کہ اب مطبع سلطانی کی مطبوعات اشرفیوں کے مول بھی نہیں ملتیں۔

— واجد علی شاہ سے پہلے عورتوں میں شعر و شاعری کا چرچا بہت کم تھا بلکہ شریف خواتین شاعری کرنا بھی بُرا تصور کرتی تھیں، مخدرۂ عظمیٰ نواب عالم نے اپنی طویل مثنوی شائع کرکے پہلی بار خواتین کو اپنا کلام پبلک کرنے کی ترغیب دی ہے۔

بہرحال واجد علی شاہ جیسے ایجاد پسند نفیس مزاج اور طبّاع والیٔ ریاست کی مثال ناپید ہے۔ ان کے ہر کام میں جدّت، ہر بات میں نفاست، ہر شغل میں ذہانت اور ہر فعل میں طبّاعی نظر آتی تھی، اردو پر اختر پیا کا جو احسان ہے وہ قیامت تک رہے گا۔ افسوس ہے اردو دان طبقے پر کہ امانت اور میر امّن کو تو اردو کا محسن تصور کرتے ہیں مگر اس شخص کو جس نے اردو کی خدمت اس عمدگی سے کی بنگالہ کو رشکِ لکھنؤ بنا دیا یوں بھلا دیا گیا ہے۔ انشاء اللہ کسی فرصت میں "واجد علی شاہ اور اردو" کے متعلق خامہ فرسائی کی جائے گی فی الحال بیگماتِ واجد علی شاہ کی شاعری پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

امراؤ محل

امراؤ خانم نام اور عمدہ خانم کی لڑکی تھیں امراؤ عمدہ خانم کے نام سے مشہور، نہایت حسین اور طرحدار تھیں پندرہ برس کی عمر میں محلات میں داخل ہوئیں، اختر پیا نے کس طرح ان کو محل میں داخل کیا انہیں کی زبان سے سنئے،

"...... ناگہاں ایک معشوق پری تمثال شوخ و عشوہ پرداز عربدہ جُو دل آزار و دلفریب، سمن بر سرو قد، غنچہ دہن سامنے آئی، اس کی مژگان نشتر کا کام کرتی تھیں، آنکھیں زہر ہلاہل پلانے کو تیار تھیں، ابرو نزد بان جاہ و تجمل تھے، کان حسن کے گوشوارے تھے، اس کا کتابی چہرہ مضمونِ عشق یاد دلاتا تھا، بینی شاہد انگشتِ شہادت تھی، اس کے عارض ورقِ گلستان جبین بجنبال بوستان تھی، اس کی آنکھوں کی سیاہی رشکِ دو مشکِ تاتار اور دونوں رخسارے آئینۂ چینی، گیسوئے دراز رستم کے گلے کے کمند تھے۔ اس کی جعدِ مشکیں پر سنبل زہر کھائے ہوئے، اس کے خوشرنگ لب جنّت کے مزے، دانت بہشت کی شیرینی تھے، اس کی زبان خامۂ حسن و مسّی مالیدہ، لب ابر سیاہ تھے، اس کے ہاتھ مثل برق کے تھے، اگر عاشق کی نظر ان ہاتھ پاؤں پر پڑ جائے تو یقین ہے اس کے قدم بھی لڑکھڑا جائیں، اس کے ساعدِ سیمیں اپنی خوش اسلوبی میں رشکِ شمعِ طور اور صفائی میں قوتِ بازوئے حسن و جمال ہو رہی تھی، اس کا پورا سراپا بہ تناسب اعضا، ایسا تھا جیسے معشوقِ دلفریب جلوہ دکھائے۔ اس کا سن تقریباً پندرہ برس کا تھا حسن و جمال میں موجودہ زمانے کے تمام حسینوں سے سبقت لے گئی تھی، اس کا نام امراؤ عمدہ خانم والی مشہور تھا۔ اس کے حسن دلفریب کے تیر سے ایک عالم کے دلوں میں ناسور پڑ گئے تھے، جب ہم دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو باہم اپنے اپنے چمنِ حسن سے گلِ عشق چننے لگے، اس اثنا میں ہنگامۂ رقص و سرود گرم ہوا، اس جلسے میں ایسا لطف آیا کہ اس سے پیشتر کبھی ایسا حظ نہ آیا تھا، الغرض دوسرے روز اس معشوقۂ عاشق صفت نے اپنے عشق کے جوش و ولولے سے از خود رفتہ ہو کر بے اختیار اپنی زبانِ سحر بیان سے عرض کی کہ تمہارے جذبۂ محبت نے مجھے اپنی اصلی حالت پر نہیں رہنے دیا میری طاقت طاق ہو گئی۔

اے صبح بتاب بر شبِ من — کز جاں رفتی ست بر لبِ من

سیرم نعمتِ زندگانی — دادم خبرت دگر تو دانی

کوئی کام ایسا کرنا چاہئے جو یادگارِ زمانہ ہو، جب تک میں زندہ ہوں آپ کی تابعدار ہوں مجھے آپ کے پہلو سے اُٹھنا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ مجھے اُس کی اس پُرتاثیر گفتگو سے نہایت خوشی ہوئی اور قبولیت کا ہاتھ آنکھوں پر رکھ لیا، چونکہ مجھ کو اپنے والد ماجد طاب ثراہ کا بے حد خوف تھا بدیں وجہ اس راز کو اپنے ہمنشینوں پر ظاہر کیا آخرش سبھوں میں یہ رائے قرار پائی کہ پہلے مردانہ وار شریعت کی رو سے اس امر میں مدد اور ہدایت مجتہدین سے جو شرعِ مبین کے حامی ہیں لینا چاہئے، یہ سن کر میں نے میر مہدی کو جو میری سرکار میں داروغہ ہیں طلب کرکے ان سے اس بارے میں گفتگو کی اور سید ابراہیم علی خاں (جناب سید ابراہیم علی خاں بہادر خطاب سے سرفراز ہیں) حیلہ پکڑا کہ مصلحتاً انہوں نے اس نازنین سے متعہ کیا اور ایک عرضداشت متضمن ترکِ فسق اور آمادگیٔ نکاح لکھ کر معہ سید ابراہیم علی اور اس نازنین کے محکمۂ شریعہ میں مجتہدین

کی خدمت میں بھیج دیا، میر محمد مہدی داروغہ نے اس امر میں
نہائت کوشش کی جس سے مطلب براری ہوگئی، اس کے بعد
سیّد ابراہیم علی نے محکمۂ شرعیہ سے واپسی کے وقت اثنائے
راہ میں اس نازنین کو طلاق دے دیا اور وہ میری نازنین مجھے
مل گئی ......" (محل خانۂ شاہی ص ۵۳ و ۵۴)

جب آپ بحیثیت ممتوعہ محل میں داخل ہوئیں تو سکندر بیگم خطاب سے مخاطب ہوئیں اور اختر پیا کے فرمانروائے اودھ ہونے کے بعد اختر پیا نے آپ سے باضابطہ نکاح کیا اور حبیبۃ السلطان مکرمۃ الزمانی نواب سکندر محل خطاب اور تین ہزار ماہوار سے سرفراز ہوئیں اور اختر پیا کو خاصہ کھلانے کی خدمت عنائت ہوئی، آپ کے بطن سے ایک شہزادہ مرزا سلطان قدر پیدا ہوا تھا جس نے ایک ہی سال کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا، افسوس ہے کہ اختر پیا کے والیٔ اودھ ہونے کے بعد عین جوانی میں اختر پیا کو داغ جدائی دے گئیں۔

چونکہ سارا محل نے و نغمہ، رقص و سرود، شعر و شاعری سے بھرا ہوا تھا اس لئے آپ کو بھی شاعری سے لگاؤ پیدا ہوا اور خود بھی شعر کہنے لگیں، یہ چند اشعار انہیں کے یادگار ہیں۔

نہیں آتا ہے اب قرار مجھے — تیرے خط کا ہے انتظار مجھے
حال اپنا میں کیا کروں اظہار — بس ترا دھیان مجھ کو ہے ہر بار
دن کو رہتا ہے اضطراب مجھے — شب کو آتا نہیں ہے خواب مجھے
ہر گھڑی حال غیر ہے جانی! — خاتمہ اب بخیر ہے جانی
گر رہے گا یہی تمہارا رنگ — دور ہو جائے کا ہمارا رنگ

(محل خانہ شاہی ص ۵۳ تا ۱۲۹ مخزن اسرار سلطانی)

امراؤ بیگم

یہ امراؤ نام کی دوسری خاتون ہیں جو رضی الدولہ بہادر کی معرفت معہ اپنی ماں کے جان عالم کے محل میں داخل ہو کر حضور السلطان خطاب اور دو ہزار روپیہ ماہانہ سے سرفراز ہوئیں، چونکہ فن رقص و سرود میں اپنا جواب نہیں رکھتی تھیں اس لئے اختر پیا کی منظور نظر تھیں محل میں داخل ہونے سے پہلے شاید پیشہ کرتی تھیں۔ انہیں بھی سکندر بیگم کی طرح شاعری کا شوق ہوا اور شعر کہنے لگیں۔

خدا دور تم سے کرے یہ الم — نہ ہووے کسی بات کا تم کو غم
حکومت اسی طرح پھر تم کو دے — قیامت تلک ملک قائم رہے
جہاں میں نہ تم کو کبھی ہو ملال — محب شاد ہو دیں عدو پائمال

(مخزن اختر ص ۹۹، محل خانہ شاہی ص ۱۱۰ مخزن اسرار سلطانی)

بدر

جانعالم کی یہ بھی ایک محبوب ممتوعہ تھیں، نواب بدر عالم بیگم صاحبہ خطاب تھا ان کے اور حالات معلوم نہ ہو سکے صرف ان کے رقعات "تاریخ بدر" سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ جب واجد علی شاہ کلکتے بھجوا دیئے گئے تو یہ کسی وجہ سے کلکتے نہ جا سکیں اور لکھنؤ ہی میں رہیں مگر جانعالم کی خیالی تصویر اپنے خانۂ دل میں رکھ کر اس کو پوجتی رہیں، اپنے محبوب کے لئے جو نذرانۂ عقیدت زبان اور قلم سے بصورت نظم و نثر ادا کرتی تھیں اس وقت وہ میرے سامنے "تاریخ بدر" کے نام سے کتابی صورت میں موجود ہے۔ ان جواہر پاروں کا دیباچہ جوہر شناس اختر نے لکھا ہے جو نقل کیا جاتا ہے۔

"امابعد راقم الحروف ابوالمنصور ناصرالدین سکندر جاہ بادشاہ عادل قیصر زماں، سلطان عالم واجد علی شاہ بادشاہِ اودھ حوالۂ صفحہ بیان کرتا ہے کہ جب سپہرِ بوقلموں نے نیا رنگ دکھلایا اور سفرِ کلکتہ کا اتفاق ہوا بعض محلاتِ سلطانی کہ جلبابِ دوری اور پردۂ مہجوری میں رہیں اکثر خطوطِ درد آمیز بھجواتی تھیں اور اشتیاق اور محبت کی یاد دلاتی تھیں بہ پاس مراسم الفت ملحوظ نظر ہوا کہ وہ قرطیس حسن تالیف پائیں تاکہ رائیگاں نہ جائیں، لہٰذا ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ میں خطوط نواب بدر عالم بیگم صاحبہ کو زیور ترتیب عطا کیا اور تحریرات ہر سال کو باب اور ہر ماہ کو فصل قرار دیا اور "تاریخ بدر" نام رکھا۔"

یہ مختصر سا رقعات کا مجموعہ تین ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں ۱۲۷۳ھ کے خطوط دوسرے باب میں ۱۲۷۵ھ کے اور تیسرے باب میں ۱۲۷۶ھ کے خطوط موجود ہیں کل چوبیس خطوط ہیں جن میں پانچ منظوم ہیں اس کو سیّد محمد علی نعمانی ملیح آبادی نے قاسم پریس حیدرآباد دکن میں طبع کرایا ہے۔

بدر کو نہ صرف نثر پر عبور تھا بلکہ نظم میں بھی خاصی مہارت رکھتی تھیں شعر ملاحظہ ہوں:۔

ایک دو میں سے حال ہو جائے وصل ہو یا وصال ہو جائے

لالۂ باغ ہیں تو چار ہیں داغ ایک دل میں مرے ہزار ہیں داغ

ہے تپِ فرقت سے بھڑکی دل میں آگ آہ کا سینے سے اُٹھتا ہے دھواں

دن گذر کر جو شام ہوتی ہے ایک منزل تمام ہوتی ہے

جاں تلک اس کی محبت میں گنوا بیٹھے ہیں ہاتھ جینے سے سر دست اٹھا بیٹھے ہیں

تو نے ہمیں بے گناہ مارا بے ساختہ دل یہی پکارا

ستاتا ہے بہت دردِ جدائی دہائی ہے خدا وندا دہائی

تمہارے خط کو جب دیکھا تنِ مردہ میں جان آئی ہوا ثابت کہ ہے تحریر میں اس کے مسیحائی

مرا دل خانۂ تن میں ہے بے تاب خدا آگاہ ہے مانند سیماب

بلائے ہجر میں جب سے پھنسی ہوں میں انگاروں کے اوپر لوٹتی ہوں

بدر کی ایک بہت مرصع غزل ہے جس کی ردیف اختر ہے۔

شکل دکھلاؤ بس اب بہرِ پیمبر اخترا ہوں بہت رنجِ جدائی سے مکدر اخترا
رات دن تیرے تصور میں بسر کرتی ہوں اس دلِ زار کو سمجھاؤں میں کیونکر اخترا
چھٹ گیا آب و خورش صدمۂ ہجراں میلے کیا کہوں تجھ کو کہ جیتی ہوں میں کیونکر اخترا
تجھ سلیمانِ جہاں سے جو محبت ہے مجھے طائرِ دل کو بناتی ہوں کبوتر اخترا
سبز ہو کر چمن دہر میں با رنج و الم یاد کرتے ہیں تجھے سرو و صنوبر اخترا
سانپ سے سینۂ مجروح پہ لہراتے ہیں یاد آتی ہیں جو زلفیں تیری پیچیدہ اخترا
ناتوانی نے کیا جسم کو ایسا لاغر ضعف سے آتے ہیں گام پچکر اخترا

بدرِ عالم یہی رکھتی ہے سدا ورد زباں
نورِ دیدار سے کر دل کو منور اخترا

(تواریخ اودھ جلد دوم ص۲۹۹)

بیگم

سلطان عالم واجد علی شاہ اختر کی یہ بھی ایک چہیتی ممتوعہ اور پنجاب کی رہنے والی تھیں، اختر پیا کی منظورِ نظر ہو کر رشک محل خطاب سے سرفراز ہوئیں، واجد علی شاہ کے قید کے زمانے میں ایک مدت تک کلکتہ میں رہیں اور پھر لکھنؤ چلی گئیں، اُن کے بطن سے مرزا آسمان جاہ بہادر شہزادہ ششم پیدا ہوئے، جب آپ کلکتے سے لکھنؤ چلی گئیں تو اپنے لختِ دل کو کلکتہ ہی میں چھوڑ گئیں جس کا ذکر واجد علی شاہ نے مثنوی حزنِ اختر میں اس طرح کیا ہے۔

پسر اب چھٹا آسماں جاہ ہے وہ بن ماں کا اب میرے ہمراہ ہے
مقدم محل پر اگر رشک ہو تو نام اس کی ماں کا قلم سے لکھو
پسر کو بھی چھوڑا روا نہ ہوئی جو بھاگی رواں سوئے خانہ ہوئی
نہ میں نے بلایا نہ پھر آئی وہ نکل کر مرے گھر سے پچتائی وہ
غرض ہے جو دلدار میر محل اسے پالا کرتی ہے وہ خوش عمل
فدا اس پہ مادر سے بھی ہے سوا وہ گل ہے اسی باغباں سے اُگا
برس پانچ کا اب سن و سال ہے میں ہوں قید میں وہ خوش اقبال ہے
وہ ہے مدتی کھوٹے کے اندر مقیم سلامت رکھے اس کو ربِ کریم

(حزنِ اختر ص۸۹)

جناب عبدالباری آسی مؤلف تذکرۃ الخواتین نے بیگم کا ذکر نہایت ہی بری[1] طرح کیا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"یہ ایک پنجابن باکمال رقاصہ کا تخلص ہے جو اپنے ہنر اور اپنے حسن و سیرت سے اودھ کے عیاش مزاج نیک دل سلطان واجد علی شاہ مرحوم کے محل تک پہنچی اور ان کی ممتوعہ ہو کر رشک محل کا خطاب پایا۔ لکھنؤ اور کلکتہ دونوں جگہ بادشاہ کے ساتھ رہی مرتے مرتے حق رفاقت ادا کیا۔ شاعری سے ذوق خاص تھا۔ اور لطف یہ کہ وہ اپنی اصلی بول چال میں شاعری کرتی تھی یعنی اول اول زنخی گوئی کا شوق تھا بعد کو نہ معلوم کیوں اس شاعری کو چھوڑ کر مردانہ شاعری کی طرف مائل ہوئیں" (تذکرۃ الخواتین ص۲۵)

آسی صاحب کے اس قول کی تصدیق کہ مرتے مرتے حق رفاقت ادا کیا" افسوس ہے کہ کسی تذکرے سے نہیں ہوتی۔ نہ جانے انہوں نے کس بنا پر لکھ دیا ـــــــ بیگم ۱۲۹۹ھ تک زندہ رہیں۔

[1] بری طرح تو نہیں، البتہ آپ کے مطابق اس میں صرف ایک واقعے کی غلطی ہے۔ ادارہ

ہے منظور باجی ستانا تمہارا   گلہ کرتی ہے جو دگانا تمہارا
نہ بھیجوں کی سسرال میں تم کو خانم   نہیں مجھ کو دو بھر ہے کھانا تمہارا
مری کنگھی چوٹی کی لیتی خبر ہو   یہ احساں ہے سر پہ دگانا تمہارا
ہوا بال بیکا جو مرزا ہمارا   تو پھر سنگ ہے اور شانا تمہارا

گھر سہ گانہ کے دوگانا مری مہمان گئی   میں یہ انگاروں پہ لوٹی کہ مری جان گئی

(حزن اختر ص۹۱ سخن شعرا ص۴۷۳ جمن انداز ص۲۷، ۶۷ ماہ درخشاں ص۹۰ شمیم سخن ص۲۹، ۲۷، مشاہیر نسواں ص۱۵۳ تاریخ اودھ جلد دوم ص۹۱ سوانح شاہ اودھ ص۲۱ بہارستان ناز ص۲۹، ۳۰)

حور

نجّہ نام تھا اور امیرن ڈومنی کی لڑکی تھیں، داروغہ میر محمد مہدی کے ذریعے جانعالم تک رسائی پا کر پسند طبع ہمایوں ہوئیں اور حور پری خطاب پایا، اس کے کچھ عرصہ بعد جانِ جہاں حور بیگم خطاب سے سرفراز ہوئیں اور جب جانعالم تخت نشین ہوئے تو نواب حور محل صاحبہ خطاب اور دو ہزار منصب سے سربلند ہوئیں، قبول صورت ہونے کے علاوہ فن موسیقی و رقص میں اپنا ثانی نہیں رکھتی تھیں جس کی وجہ سے جانِ جانعالم تھیں، آپ کے بطن سے ایک شہزادہ روشن گہر مرزا اور ایک شہزادی جہان آرا بیگم تولد ہوئیں،

چونکہ پڑھی لکھی تھیں اس لئے شعر و شاعری کا بھی خاصا ذوق تھا جب محلات میں داخل ہوئیں تو سوائے رقص و غنا، شعر و شاعری کے اور کوئی کام تھا ہی نہیں اس لئے خوب شعر کہنے لگیں۔

حور کیا عشق میں تاثیر ہے اللہ اللہ   ہر گھڑی کا وِرد تقدیر ہے اللہ اللہ

برہم ہوئے ہیں گیسوئے برہم کی یاد سے   اب پوچھتے ہو تم سبب اضطرار کیا
گیسو کی آرزو کبھی عارض کا اشتیاق   دیکھیں دکھائے گردشِ لیل و نہار کیا
لو آؤ ایک دم مرے پہلو میں سو رہو   گر اپنا جانتے ہو تم اے جان عار کیا
لاکھوں حسیں ہیں صورتِ جاناں کے شیفتہ   ہم کس قطار میں ہیں ہمارا شمار کیا

کب ہے یقیں کہ زینتِ آغوش ہو حصول
اے حور اُن کے دل پہ نہیں اختیار کیا

کہاں ہو اے مرے پیارے کہاں ہو   خفا ہو اے صنم نامہرباں ہو

گذارش ہے شبِ غم کی کہانی   اگر الطاف سوئے دوستاں ہو
یہی رہتا ہے ہر لحظہ زباں پر   رکھے اللہ خوش تم کو جہاں ہو
دکھاؤ شوخیاں بچپنے نہ بیٹھو   ابھی نامِ خدا تم نوجواں ہو
دکھائیں رفعتِ مضموں اگر ہم   زمینِ شعر قصرِ آسماں ہو
مصیبت پائیں طفلِ اشک میرے   جو مژگاں کا نہ ان پہ سائباں ہو
خوشا تقدیر ہم یوں ہی ہیں راضی   جو سینہ ہجرِ جاناں کا مکاں ہو
اٹھاؤ آنکھ دیکھو حال میرا   کبھی تو لطف سوئے بیکساں ہو

سہیں کیوں کاوشیں اے حور غم کی
اگر پہلو میں یار دلستاں ہو

دیکھ لیں پھر ترے رخسار وہ پیارے پیارے   آ سرِ بام کہ ہو جائیں نظارے پیارے
شوخیاں نیچی نگاہوں کی دکھا دو ہم کو   پھر اُسی طور ہوں چوری سے اشارے پیارے
اب کہاں ہوش جو تنگ آئے پریشانی کا   ہم تو شیدا ہوئے مدت سے تمہارے پیارے
جی میں ارمان ہزاروں ہیں مگر صد افسوس   کہہ نہیں سکتی ہوں کچھ شرم کے مارے پیارے
تیرے صدقے ترے قربان ترے واری ہیں   میرے جانی مرے دلدار دلارے پیارے

افسردگی ہے غنچۂ خاطر کو ہجر میں   بگڑی ہوئی چمن کی ہمارے بہار ہے
جی چاہتا ہے سرمۂ چشم اس کو کیجئے   بتلا تو اے صبا یہ کہاں کا غبار ہے

(سوانح شاہ اودھ ص۷۱، ۷۲ تواریخ اودھ جلد دوم ص۹۱، مخزن اسرار سلطانی مطبوعہ سالنامۂ ادبی دنیا ستمبر ۱۹۳۱)

شیدا

شیدا بیگم نام تھا واجد علی شاہ کی ایک چہیتی محل تھیں اور واجد علی شاہ ان پہ ہزار جان سے والا و شیدا تھے، آپ کے بطن سے ایک شہزادی نگین آرا نواب رقیہ بانو بیگم تولد ہوئی جو تین ہی سال کی عمر میں انتقال کر گئیں۔

شیدا بیگم نہ صرف شعر ہی اچھے کہتی تھیں بلکہ بہترین نثار بھی تھیں، آپ کی نثر کے نمونے سالنامۂ ادبی دنیا بابت ۱۹۳۸ء میں "بیگمات اودھ کے خطوط" کے عنوان سے پیش کر چکا ہوں، یہ کلام آپ ہی کا ہے۔

کیوں ہم سے چھپاتے ہو تم اب از کی باتیں   ہم تم سے کسی بات کا پردا نہیں کرتے
کیوں یاد بھلائی مری شکوہ ہے یہ تم سے   جو چاہنے والے ہیں وہ ایسا نہیں کرتے
ڈھونڈھا تو بہت پائے بھی گلفام ہزاروں   ہمسا کوئی شیدا کبھی پیدا نہیں کرتے

یار کے ظلم و ستم کی نہ ملی داد مجھے   داد دیتا نہیں میری کوئی بیداد مجھے

بے گنہ گل سے چھڑاتا ہے عبث بلبل کو ایسی بدعت تری بھاتی نہیں صیّاد مجھے
دشت پیما ہوں کبھی اور کبھی کوہ نورد جانتا ہے کوئی مجنوں کوئی فرہاد مجھے

عیش کے دن تھے حسن کی راتیں ہوتی کس کس مزے کی تھیں باتیں

جسم کہتا ہے ٹھہر، جان ہی کہتی ہیں چلی رات دن رہتی ہے دلبراسی تکرار میں روح
قیس و فرہاد کے مانند تجسّس میں ترے کبھی صحرا میں کبھی پھرتی ہے کہسار میں روح

اے گل سہوں فراق کے صدمے میں کب تلک آؤ ملو گلے سے دن آئے بہار کے
آتا ہے یاد روز سرِ شام سے مجھے آنا تمہارا گیسوئے مشکیں سنوار کے
کنج قفس میں پھنس گئی آتے ہی فصلِ گل دیکھے ہزار حیف نہ جوبن بہار کے
جانی ترے فراق میں ہر شام و ہر سحر تھک تھک گئی زبان اجل کو پکار کے

ساقی ہو، صحن باغ ہو، ابرِ بہار ہو پہلو میں تم ہمارے بعزّ و وقار ہو
ساون کا تو مہینہ ہو اور دن ڈھلا ہوا اور ننھی ننھی بوندوں کی پڑتی پھوار ہو
جھولا پڑا ہوا ہو کسی شاخِ نخل میں اک سمت خوش گلو کوئی گاتا ملار ہو
کوئل کہو کہو کی صدا دے ہر ایک بار ٹپکا لگا ہوا انبہ کا فصلِ بہار ہو
اس وقت بول اٹھے جو پپیہا کہ پی کہاں اک تیر عاشقوں کے کلیجے کے پار ہو
بنگلہ صنوبری بھی چمن میں ہو وہ پڑا فردوس جس کے دیکھنے سے شرمسار ہو
جز گفتگوئے راز نہ ہو کچھ خیال اور بائین کی چھیڑ چھاڑ ہو بجتا ستار ہو
مہندی ہو ہاتھوں پاؤں میں اپنے رچی ہوئی اور عطر میں بسا ہوا ہر تار تار ہو
جوبن وہ تم پہ ہم پہ ہو اس وقت نوک کا حور و پری بھی آن کے جس پر نثار ہو
شیدا تمہاری آٹھ پہر رہتی ہے ملول اب دیکھئے یہ آرزو کب آشکار ہو

(سالنامۂ ادبی دنیا ۱۹۳۱ء، مخزن اسرار سلطانی، تواریخ اودھ ص۹ سوانح شاہ اودھ ص۱۴۲)

صدر

جان عالم کی یہ بھی ایک عزیز متوعہ تھیں اور جانعالم نے انہیں صدر محل خطاب سے سرفراز فرمایا تھا، صاحبِ تذکرۂ مشاہیر نسواں کا بیان ہے کہ "صاحبِ دیوان تھیں ایک دیوان "بادشاہ نامہ" اور ایک گلدستہ یادگار ہے۔" مگر افسوس ہے کہ نہ تو مجھے ان کا دیوان ہی مل سکا نہ گلدستہ اور نہ حالات زندگی ۱۲۹۳ھ میں زندہ تھیں۔

شعر نہایت اچھے کہتی تھیں۔ مجھے صرف ایک ہی غزل ملی ہے مگر حق یہ ہے کہ یہ غزل بجائے خود ایک دیوان ہے۔

جوشِ جنوں میں رات دن سب سے رہا الگ الگ میں ہوں جدا الگ الگ لوگ جدا الگ الگ
بیٹھے بلائیں لینے کو ہاتھ بڑھائے جب ادھر منہ کو پھرا کے یار نے مجھ سے کہا الگ الگ
شمع جلانے آئے ہیں آج وہ میری قبر پر چلیو خدا کے واسطے بادِ صبا الگ الگ
خاک ہو زندگی بھلا ہے مریضِ عشق کی میں ہوں دوا سے دور دور مجھ سے دوا الگ الگ
ہجر میں خوب خاک اڑی ان کو ہوا نہ کچھ اثر نالے گئے الگ الگ آہ رسا الگ الگ
حسرت و آرزوئے وصل درد مصیبت فراق سب کا ہے لطف الگ الگ سب کا مزا الگ الگ
صدرؔ وہ کم نصیب ہوں ہجر میں گر اٹھاؤں ہاتھ
بابِ قبول سے رہے میری دعا الگ الگ

(غنچۂ سرود حصہ دوم ص۵۸، مشاہیر نسواں ص۲۴۹، ماہ درخشاں ص۲، بہارستانِ ناز ص۲۳، چمن انداز ص۱۱۳، سوانح شاہ اودھ ص۷، تواریخ اودھ جلد دوم ص۱)

عالم

نواب بادشاہ محل بیگم صاحبہ عالم، نواب علی نقی خاں بہادر ابن شرف الدولہ بہادر ابن مدار الدولہ بہادر کی دختر نیک اختر تھیں ۱۲۵۳ھ میں اختر پیا سے شادی ہوئی اس وقت اختر پیا ولیعہد تھے، شادی کے بعد خاص محل خطاب ملا اور اختر پیا کے تخت نشین ہونے کے بعد نواب خاص محل صاحبہ ملکۂ مخدرۂ عظمیٰ نواب بادشاہ محل خطاب اور پنج ہزاری منصب سے سرفراز ہوئیں، ان کے بطن سے چار شہزادے مرزا نوشیرواں قدر بہادر، مرزا فلک قدر بہادر، مرزا کیوان قدر بہادر، مرزا بیدار بخت بہادر اور ایک شہزادی مرتضیٰ بیگم صاحبہ تولّد ہوئیں۔

عالم نہ صرف اچھے شعر ہی کہتی تھیں بلکہ عروض و قافیہ پر بھی خاصہ عبور تھا، ایک دیوان اور ایک مثنوی طبع ہو چکی ہے جس میں آپ کی شاعری کے بہترین نمونے ہیں۔

بدن لاغر ہے چہرہ فق، جگر زخمی ہے سینہ شق ہے چٹیل دشت لق و دق چلن اپنا ہے مستانہ
ستم جھیلے ترے سارے نہ نعرے آہ کے مارے کہے دیتے ہیں اے پیارے ابرا ہے دل کا تڑپانا
ستم کرنے لگے بے حد ہوئی عادت تمہاری بد مگر سننے لگے شاید صنم غیروں کا بھڑکانا

پلا تو بزم میں وہ جامِ خوشگوار مجھے کہ تا بہ حشر نہ ہو ساقیا خمار مجھے

وہ گُلِ تر مرے گھر آئے اگر آج کی رات ہو عیاں نخلِ تمنّا میں ثمر آج کی رات
کروں نظّارۂ دلدار بخوبی یا رب اتنی مہلت دے مجھے دردِ جگر آج کی رات
گھر حمک جائے ابھی برجِ قمر کی صورت جلوہ گر ہو جو مرا رشکِ قمر آج کی رات
کل شفا ہو گی جو تو آئے گا اے رشکِ مسیح تیرے بیمار پہ بھاری ہے مگر آج کی رات
ہے شبِ وصل مگر دل میں ہے دھڑکا عالم بول اٹھے نہ کہیں مرغِ سحر آج کی رات

مرتے ہیں جس کے عشق میں اُس کو خبر نہیں کیا آہ بے اثر ہے کہ مطلق اثر نہیں
آیا ہے کیا سمجھ کے مسیحا علاج کو میں ہوں مریضِ عشق، تجھے کچھ خبر نہیں؟
ہے چاندنی بھی تابشِ خورشید سے زیاد پہلو میں میرے جب سے وہ رشکِ قمر نہیں
کیا ناصحا ڈراتا ہے مرنے سے تو مجھے عاشق وہی ہے جان کا جس کو خطر نہیں
بس جاں بلب تو کر چکا کیا چاہتا ہے اور اب بھی تجھے قرار جو دردِ جگر نہیں
ہم مثلِ سروِ باغِ جہاں میں ہیں نا امید سر سبز دیکھنے میں ہیں لیکن ثمر نہیں
عالم یہ عمر بھر نہیں جاتا وہ درد ہے
بے عشق ڈھونڈئیے تو کوئی بھی بشر نہیں

ہنستے ہو میرے حال پہ کیا جائے رحم ہے اللہ اس طرح نہ کسی کا پھنسائے دل
دیوانہ کوئی کہتا ہے وحشی کوئی ہمیں سب کچھ سنیں گے شکر ہے جو کچھ سنائے دل
تا چند سنگدل! یہ دل آزاریاں تری رنجیدہ اس قدر نہیں کرتے پرائے دل
جو کچھ کرو ستم وہ سزاوار ہے تمہیں قابل اسی کے ہم ہیں یہی ہے سزائے دل
بے وجہ آنکھ آپ نے عالم سے پھیر لی
خونِ جگر نہ آنکھوں سے کیونکر بہائے دل

عالم وہ طلبگار ترے ہوں گے اُسی دن جب تازہ ستم اور کوئی ایجاد کریں گے

یا درِ رخ گیسو میں سدا ہم نے بسر کی رو رو کے کبھی شام کی اور گاہ سحر کی

زمانے میں نیکی کا بدلہ بدی ہے سوا دل جلانے کے کیا کیجئے گا

پھر شوق سے حضور سنا لیتے گالیاں ثابت کیا تو ہوتا ہمارے قصور کو

• (غنچۂ سود حصہ دوم ص۲۲ تا ۳۴، سخن شعرا ص۳۵۷، چمن انداز ص۱۲۹، ماہ درخشاں ص۱۱۹، مشاہیر نسواں ص۳۹۱، بہارستان ناز ص۲۵۶، شمیم سخن ص۳۲۳، ادبی دنیا ۱۹۳۰ء، سوانح شاہ اودھ ص۸۶، تواریخ اودھ ص۵۰،

محل خانہ شاہی ص۲۷ تا آخر، حزن اختر ص۷۵، تذکرۃ الخواتین ص۱۲۱، مثنوی عالم، دیوان عالم)

عشرت

جانعالم کی ممنوعہ تھیں اور عشرت محل خطاب تھا عشرت تخلّص کرتی تھیں، حالات معلوم نہ ہو سکے، صرف دو شعر ملے ہیں،

گرمیٔ عشق مانعِ نشو و نما ہوئی میں وہ نہال تھا کہ اُگا اور جل گیا

شعلۂ عشق لگا آگ نہ دل میں میرے یہ تو اللہ کا گھر ہے کسی دشمن کا نہیں

(ماہ درخشاں ص۲۴، آئینِ انداز ص۱۳۱، مشاہیر نسواں ص۲۹۶، بہارستان ناز ص۶۷، تذکرۃ الخواتین ص۱۲۱)

فاطمہ بیگم

جان عالم کی ممنوعہ اور شاعرہ تھیں صرف ایک شعر مجھے ملا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ خوب کہتی ہوں گی۔

پھر وہ چرچے ہوں پھر وہی باتیں دن ہوں عشرت کے عیش کی راتیں

(رسالہ ادبی دنیا ۱۹۳۰ء، مخزنِ اسرار سلطانی ص۹۳)

قمر

حیدری بیگم نام اور اختر پیا کی منکوحہ تھیں جب محل میں داخل ہوئیں تو ماہ طلعت بیگم خطاب پایا، شہزادہ مرزا ہمایوں بخت کی دختر اور مرزا محبوب علی قدس کی بہن تھیں، بے حد ذہین اور خوش مزاج، بذلہ سنج اور لطیفہ گو تھیں، مؤلف تذکرۃ النسا کا بیان ہے کہ جانعالم کے بعد آپ نے عبد الغفور نساخ سے عقدِ ثانی کیا تھا، عشقیہ شعر نہایت اچھے کہتی تھیں ۱۲۸۰ھ میں انتقال ہوا،

دلِ ناشاد کو تم نے نہ کبھی شاد کیا بھول کر بیٹھے ہمیں پھر نہ کبھی یاد کیا

ہو گئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام میں نے نالہ جو کسی رات سرِ شام کیا

دعویٰ تھا عبث یار مسیحائی کا تم کو اچھا نہ ہوا ایک بھی بیمار تمہارا

مر کے بھی خو نہ گئی بادہ کشی کی زاہد حشر میں ساقیٔ کوثر کا نہ داماں چھوٹا
روز و شب کرتی ہے بلبل یہ قفس میں فریاد ہائے کیا فصلِ بہاری میں گلستاں چھوٹا
لے گیا قیس پہ بھی فوق تمہارا وحشی مر کے بھی دستِ جنوں سے نہ گریباں چھوٹا

داغ سودا سر پہ ہے پاؤں میں زنجیرِ شعاع
ہے پرپرو نیری الفت میں یہ حالِ آفتاب

گر آب زندگی بھی تو برسائے اے فلک
کشتِ امیدِ وصل نہ ہوئی بہار سبز

اے مینا شو تکلف ساقی تو دیکھنا
شیشے میں سرخ جام مے خوشگوار سبز

گل سودا شگفتہ ہیں یہ فیض اشکباری ہے
نسیمِ آہ کا جھونکا یہاں بادِ بہاری ہے

نہ پوچھ اے ہمنشیں ہم سے شبِ فرقت کی بیتابی
الم ہے درد و حسرت ہے فغاں ہے آہ و زاری ہے

گرے ہیں اتنے ستارے گنش سے تیرے سہ تاباں
روش گلزار کی ہر ایک فرشِ زرنگاری ہے

(تذکرۃ الخواتین صفحہ ۱۲۶، ۳۱۳، مشاہیرِ نسواں صفحہ ۲۷۴، سخن شعرا صفحہ ۵۷۹، قلم دلاور ۱۹۳۶ء چمن انداز)

محبوب

واجد علی شاہ کی محبوب منکوحہ تھیں پہلے زینت محل اور پھر محبوب محل خطاب پایا، جناب آسی اپنی کتاب تذکرۃ الخواتین میں لکھتے ہیں کہ سلطان جہاں بیگم نام محبوب تخلص تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ محبوب محل کی طبیعت شعر و شاعری سے فطری مناسبت رکھتی تھی، افسوس ہے کہ مجھے ایک ہی غزل مل سکی یہ غزل واقعی روح کو مضطرب کرتی ہے۔

اُٹھا سکی نہ مصیبت فراقِ یار میں روح
نکل گئی تنِ لاغر سے انتظار میں روح

ہزار مرتبہ تجھ پر سے میں فدا کرتی
اگر یہ ہوتی مرے پیارے اختیار میں روح

جو آنا ہو تجھے مدِ نظر تو آ ظالم
نکل نہ جائے کہیں تیرے انتظار میں روح

نہ نکلی حسرتِ دل ایک بھی کہ موت آئی
ہمیشہ تڑپا کی تیرے لئے مزار میں روح

نہیں ہے گور کی تنگی سے کچھ ہمیں دہشت
رہے گی بعد فنا کے بھی کوئے یار میں روح

جو آئے نزع کے بھی وقت وہ مسیح جمال
مریضِ ہجر کے آجائے جسمِ زار میں روح

ترے فراق میں یوں زندگی گذرتی ہے
ہے کرب قبر میں پیارے اور اضطرار میں روح

ہے آرزو ترے ہاتھوں سے قتل ہوں جب بھی
لگی ہوئی ہے تری تیغِ آبدار میں روح

اُسی کے حکم میں ہے موت و زندگی محبوب
حقیقتہً ہے دلا دستِ کردگار میں روح

(نغمہ سرور حصہ دوم صفحہ ۱۱، سوانح شاہ اودھ صفحہ ۲۰، تواریخ اودھ صفحہ، تذکرۃ الخواتین صفحہ ۱۱۹، مشاہیرِ نسواں صفحہ ۲۶۹)

مہدی بیگم

جانعالم کی پیاری محل تھیں اور شہزادہ قمر حسن مرزا انہیں کے بطن سے

تھے۔ جانعالم کلکتہ گئے تو یہ لکھنؤ ہی میں رہیں، آپ کا صرف ایک ہی شعر مل سکا۔

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا
ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا

(حزن اختر صفحہ ۹۰، مخزن اسرار سلطانی، سالنامہ ادبی دنیا ۱۹۳۸ء، سوانح شاہ اودھ صفحہ)

نوروزی بیگم

نوروزی بیگم نام تھا جانعالم کی چہیتی ممتوعہ تھیں، جانعالم کے ساتھ کلکتے میں تھیں، افسوس ہے کہ نہ تو تفصیلی حالات ہی مل سکے اور نہ سوائے ایک شعر کے کچھ کلام ہی ملا،

دل بہت بے قرار ہے صاحب
رات دن انتظار ہے صاحب

حیرت ہے کہ شیدا بیگم کا بھی ایک شعر ایسا ہی ہے صرف ردیف بدلی گئی ہے وہ کہتی ہیں۔

دل بہت بے قرار رہتا ہے
رات دن انتظار رہتا ہے

یہ بھی بڑے مزے کا توارد ہے۔

(حزن اختر صفحہ ۹۴، مخزن اسرار سلطانی، سالنامہ ادبی دنیا ۱۹۳۸ء)

وزیر پری

نواب خاص محل اور رنبیر وزیر خواجہ سرا کی معرفت محل میں داخل ہو کر جانعالم کے سامنے اپنے ناچ اور گانے کے ایسے جوہر دکھائے کہ جانعالم نے انہیں محلات میں شریک کر لیا، اور وزیر پری خطاب سے مفتخر و ممتاز فرمایا، تخت نشینی کے بعد نواب خورشید محل خطاب اور دو ہزار ماہوار سے سرفراز ہوئیں،

محل میں داخل ہونے سے پہلے سکھ بدن والی کے نام سے مشہور تھیں اور مجرے کرتی تھیں، اختر پیا کی صحبت اور جانعالمی اکھاڑے میں آنے کے بعد شعر نہ کہنا تعجب انگیز تھا، چنانچہ شعر کہنے لگیں۔

مرے گل پیرہن سلطانِ عالم
مرے غنچہ دہن سلطان عالم

تو ہی ہے خسرو ملکِ معانی
مرے شیریں سخن سلطان عالم

تمہارے ہجر میں ہم نے اٹھائے
بڑے رنج و محن سلطان عالم

(محل خانہ شاہی صفحہ ۵۲، مخزنِ اسرار سلطانی مطبوعہ، سالنامہ ادبی دنیا ۱۹۳۸ء، تواریخ اودھ جلد دوم صفحہ ۳۱)

اس مضمون میں میں نے بڑی جستجو سے جان عالم کی ان بیگمات اور ممتوعات کے حالات اور کلام کے نمونے فراہم کئے ہیں جو اردو شعر کہتی تھیں، ان میں سے کئی ایک صاحبِ دیوان ہیں اور سب کی سب بڑے اچھے شعر کہنے والی ہیں۔ جانعالم کا یہ احسان اردو پر تاقیامت رہے گا کہ انہوں نے نہ صرف اردو کے حسن کو نکھارا بلکہ حرم میں بھی اردو کو داخل کر دیا۔

جان عالم سے پہلے تک خواتین اور معزز پردہ نشین بیگمات شعر کہنا بُرا سمجھتی تھیں، جان عالم کی محلات کی شاعری کا عالم کا؛ دیوان اور مثنوی دیکھ کر اودھ اور وادی گنگ و جمن کی عورتوں کو شاعری کا اشتیاق پیدا ہوا اور وہ اس طرف متوجہ ہوئیں، آج جو ادبی چہل پہل اور شعری ذوق ان میں پایا جاتا ہے اس کا سہرا بڑی حد تک جانعالم ہی کے سر ہے۔

تسکین عابدی

نسیمِ شوق

وہ برقِ ناز گریزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
مگر شریکِ رگِ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہزار دل ہے ترا مشرقِ مہ و خورشید
غبارِ منزلِ جاناں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکونِ دل تو کہاں ہے مگر یہ خوابِ سکوں
نثارِ زلفِ پریشاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

گذر چکی تری کشتی ہزار طوفاں سے
ہنوز حسرتِ طوفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہارِ گلکدۂ ناز دلکشا ہے، مگر
نسیمِ شوق خراماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہے خلوتِ دلِ ویراں ہی منزلِ محبوب
یہ خلوتِ دلِ ویراں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر ایک سانس ہو آتشکدہ تو کیا حاصل
گدازِ شعلۂ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بغیرِ عشق ہے رودادِ زندگی تاریک
یہ لفظ زینتِ عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

بہت بلند ہے دل کا مقامِ خودداری
مگر شکست کا امکاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

سکونِ شوق ہو یا اضطرابِ شوق روشؔ
اگر بمنزلۂ جاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

روشؔ صدیقی

مہدی حسن افادی الاقتصادی کا اسلوبِ نگارش

اردو نثر میں جدید اسلوب کا آغاز

از مجنوں گورکھپوری

(مہدی حسن مرحوم نے اُردو نثر میں اپنے اسلوبی اختراعات اور اپنے بے مثل طرزِ انشار سے چند ایسے نقوش چھوڑے جو آج تک اُردو اربابِ نثر کے لئے تخئیل بنے ہوئے ہیں اور اُن کے اسالیب کی تہذیب و تحسین میں حصے رہے ہیں "خوابِ طفلی اور آرزوئے شباب" کے مصنّف گورکھ پور کے رہنے والے تھے۔ لیکن اوائلِ شباب سے لے کر آخری ایّام تک اُن کی زندگی کا بہت کم حصّہ گورکھپور میں گزرا سرکاری ملازمت کے سلسلے میں اُن کو اپنی عمرِ عزیز کا بیشتر حصّہ پردیس کی نذر کر دینا پڑا۔ اور وہ بھی ایسی فضا میں جس کو ایک انشار پرداز کے لئے کسی طرح حوصلہ افزا یا نشاط انگیز نہیں کہہ سکتے۔

ملازمت کی تاب شکن اور رُوح فرسا پابندیوں نے مرحوم کی ادبی شخصیت کا گلا گھونٹنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔ منصبی زندگی کی مصروفیتوں نے اُن کو کبھی اتنی مہلت اور آزادی نہ دی کہ وہ تامّل اور اطمینان کے ساتھ کوئی مستقل کتاب تصنیف کرنے کی طرف متوجّہ ہوتے اور کوئی زبردست تعمیری ادبی خدمت اپنی یادگار چھوڑتے۔ حوصلے اور ارادے بہت کچھ تھے۔ لیکن "دہند شوق وے رخصتِ نظر نہ دہند" کی مجبوریاں بھی عبرتناک ہوتی ہیں۔ مرحوم اپنے "متبطِ اوقات" (یہ انہیں کی ترکیب ہے) سے بدقّت تمام اِتنی فرصت نکال سکتے تھے کہ وقتاً فوقتاً اخبار و جرائد میں کسی عصری بحث پر قلم برداشتہ کچھ لکھ سکیں یا پھر کسی تخیل یا کسی رُومانی جذبہ کو پھیلا کر انشائے لطیف کی صُورت میں پیش کر سکیں۔ افادی الاقتصادی نے جن دم گھٹا دینے والی زحمتوں اور بندشوں میں اپنی زندگی بسر کی اُن کو نظر میں رکھئے تو ماننا پڑتا ہے کہ اگر فطرتاً اُن کی طبیعت میں ایک جمالیاتی کیفیت اور ایک ابداعی اُپج نہ ہوتی تو اُن سے یہ متفرقات بھی یادگار نہ رہتے جو اس وقت رہ گئے ہیں۔ پھر جس شخص کو فطرت نے صنّاع پیدا کیا ہو وہ ہمارے لئے جو کچھ بھی کر جائے اس کو غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ نقّاد کا کام معدُوم سے نہیں بلکہ وجود سے بحث کرنا ہوتا ہے۔ ایک صنّاع جو کچھ کر گیا ہم کو اسی پر اپنے فیصلہ کی بنیاد رکھنا چاہیئے۔ افادی الاقتصادی اپنی زندگی کے جتنے لمحے ادب و انشار کو دے سکتے تھے دیتے گئے۔ اور وہ ہماری ہر باز پُرس پر یہ جواب دینے کا حق رکھتے ہیں۔

"از نفس آں چہ داشتیم صرفِ ترانہ کردہ ایم"

اس سے انکار نہیں کہ افادی الاقتصادی نے جتنے مقالات لکھے ہیں اور جو "افاداتِ مہدی" کے نام سے ایک مجموعہ کی صُورت میں شائع ہو چکے ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہیں جن کو وقتی یا موسمی کہنا پڑتا ہے۔ لیکن ان کا قلم واقعی ایک صنّاع کا قلم تھا جو بیجان سے بیجان چیز میں زندگی پیدا کر سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ "تمدنِ عرب پر ایک کھلی چٹھی" "علامہ شبلی کا ماہوار رسالہ" "شبلی سوسائٹی" "نامی پریس کانپور کی لٹریری خدمات" "نقاد پر ایک غیر ستائشی جنبشِ لب"۔ اور اسی قسم کے اور عصری مضامین کو "افاداتِ مہدی" میں آج بھی پڑھیے تو وہی لذت ملتی ہے۔ جو اب سے ۲۵، ۳۰ سال پہلے ملتی۔ حالانکہ ان عنوانات میں بجائے خود زندہ رہنے کی مطلق صلاحیت نہ تھی۔

اردو نثر کی تاریخ میں میر امن کے بعد شبلی تک مجھے سوا آزاد کے کوئی ہستی ایسی نظر نہیں آتی جس کے صرف اسلوب میں اتنی زندگی ہو جتنی افادی الاقتصادی کے اسلوب میں ہے۔ اور محض اپنے اسلوب کی بنا پر تاریخِ ادب میں ایسی مستقل حیثیت کا مالک اور ایسی

پائدار زندگی کا مستحق ہو۔ شبلی کے اسلوب کو موضوع کی اہمیت اور
وقعت سے الگ کر لیجئے تو اس میں کچھ زیادہ رہ نہیں جاتا۔ ان کا
اسلوب اپنے تمام تر حسن اور آہنگ کے باوجود فاضلانہ طرزِ تحریر
سے سرِ مو آگے نہیں بڑھتا۔ حالی کا اندازِ تحریر سلیس، بے تکلف، پختہ اور
نرم ہے مگر اس کے اندر کوئی خالص جمالیاتی کیفیت بہت کم ملے
گی۔ نذیر احمد کے اسلوب میں ایک البیلا پن ہوتا ہے۔ جو صرف
کسی افسانہ نگار کو زیب دے سکتا ہے۔ افادی الاقتصادی کے اسلوب
کی اہمیت موضوع کی اہمیت سے بالکل الگ ایک چیز ہے۔ اور
بڑے مرتبہ کی چیز ہے۔ ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خصوصیت
جمالیت (Aesthticism) ہے ان کے اندر ایک خداداد
ذوقِ جمال تھا جو ان کی تحریروں میں بھی اسی طرح نمایاں اور محسوس رہتا تھا
جس طرح کہ ان کی روزمرہ کی زندگی میں۔ خود شبلی ان کے معترف
ہیں۔ اور یہ اعتراف محض زبانی یا رسمی نہیں ہے۔ ایک خط میں لکھتے
ہیں "کاش شعر العجم کے مصنف کو ایسے دو فقرے لکھنے بھی نصیب
ہوتے۔ دائرہ ادبیہ کا لکھنے والا شبلی کا معتقد ہو یقین کرنے کی بات نہیں"
ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

"البشیر میں ایک مضمون دیکھا نیچے تمہارے نام کی دستخط تھی
حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزاپوری دوست ہیں یا نذیر احمد اور آزاد کی
دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا اور
احباب کو دکھاتا رہا"

شبلی کی نظر نذیر احمد اور آزاد کے دائرے سے باہر نہ جا سکی
ان کو یہ احساس نہ ہو سکا اور کیسے ہوتا۔ کہ دراصل والٹر پیٹر Walter
Pater رسکن (Ruskin) اور آسکر وائلڈ Oscar Wilde
کی روحوں نے ہندوستان میں آ کر ایک اردو انشاپرداز کا جنم لیا ہے
مجھے اردو نثر نگاروں میں کوئی ایسا نظر نہیں آتا جس کو افادی الاقتصادی
کا ہم زبان قرار دیا جائے اور جس کے اسلوب سے ان کے اسلوب کا
موازنہ کیا جائے۔

" ذوقِ فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں "
" با ظہوری و صائب محو ہمزبانیہا است "

افادی الاقتصادی کے "ہمزبان" کچھ غیر ملکوں ہی میں ملتے ہیں
افسوس ہے کہ زمانے نے اُن کو اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ کوئی مستقل
اور منضبط تصنیف چھوڑ جاتے جو موضوع کی اہمیت اور خیالات کی
گرانمایگی کے اعتبار سے اسی قدر وقیع اور عظیم الشان ہوتی۔ جس قدر کہ
ان مغربی انشاپردازوں کی تصنیفیں ہیں۔ اس وقت زیادہ وثوق کے
ساتھ یہ کہا جا سکتا تھا کہ مرحوم پیٹر اور رسکن کے حریف تھے۔ لیکن
جہاں تک ذوق و نظر اور انداز و اسلوب کا تعلق ہے میں بلا خوف
تردید کہہ سکتا ہوں کہ مہدی حسن مرحوم انہیں مشاہیر روزگار کی جماعت
میں شمار کئے جانے کے لائق تھے۔ قبل اس کے کہ میں ان کے متعلق
کچھ اور کہوں مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی عبارت کے کچھ نمونے
آپ لوگوں کے سامنے پیش کروں۔ تاکہ یہ کہنے کی گنجائش نہ رہ جائے
کہ میں صرف خلا میں باتیں کر رہا ہوں۔ "حالی و شبلی کی معاصرانہ چشمک"
میں ایک جگہ ضمنی طور پر لکھتے ہیں۔

"یہی بلاغت تھی جس نے کسی زمانہ میں "حیدرآباد دکن کے
بسمارک" کو نذیر احمد کا شیدائی بنا رکھا تھا۔ سرسالار جنگ اول اسٹیٹ
ڈنر پر ہیں۔ طلائی تابوں کا دور چل رہا ہے۔ چھری کانٹوں کی دھیمی
موسیقیت میں دفعتاً سرکاری ڈاک کے آنے کی اطلاع ہوتی ہے۔
ارشاد ہوتا ہے "نذیر احمد کی کوئی مراسلت ہو تو فوراً پیش کی جائے۔"
ایک منٹ کے بعد جلیل القدر میزبان شام کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہوتا
ہے۔ برقی روشنی کی جگمگاہٹ میں شائقِ ادب امیر الامراء کی نگاہ
نقوشِ حرفی پر دوڑ رہی ہے۔ اور چہرے پر رہ رہ کر وہ کیفیت طاری ہو
رہی ہے۔ جسے تبسم زیرِ لب کی ہلکی لہریں کہئے۔ نذیر احمد کے خوانِ ادب
کا یہ لقمۂ تر تھا جس سے شاہی میز بھی بے نیاز نہ رہ سکی۔ لیکن اب یہ
ہمارے گلے میں پھنسنے لگا ہے۔ جسے ہم اگلنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ
بے نمکی روایاتِ سابقہ کے لحاظ سے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی۔۔"

آپ نے دیکھا انشائے لطیف کسے کہتے ہیں۔ ایک لفظ کو
اپنی جگہ سے ہٹا دیجئے یا اس کی جگہ کوئی دوسرا لفظ رکھ دیجئے۔ سارا
آہنگ بگڑ کر رہ جائے گا۔ تشبیہہ کس قدر دل نشیں اور برمحل ہے
اور کس سلیقہ کے ساتھ شروع سے آخیر تک نباہی گئی ہے۔ نثر میں
تشبیہات و استعارات کو اس لطف کے ساتھ نباہنا نہایت دشوار
کام ہے اسلوب کی یہ لطافتیں ہم کو "افاداتِ مہدی" کے ہر صفحہ پر ملتی
ہیں۔ "دائرہ ادبیہ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"مہرالنساء جو ان بیوہ کی حیثیت سے شاہی محل میں رہنے سہنے

لگی ہے۔ لیکن ہائے وہ حسنِ افسردہ جو خود اپنی قوتوں سے واقف ہو۔ خوب جانتی تھی بجلی کدھر گرے گی۔ . . . . جہانگیر ایک روز اس کے کمرہ میں جا نکلا۔ جو ضیائے حسن سے "شیش محل" ہو رہا تھا۔ حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے۔" فطرت کی لاڈلی "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز" نہایت سادہ باریک لباس میں تھی۔ لیکن شیشہ کی طرح صاف شفاف جسم جھلک رہا تھا۔ . . . . .
مقیاس الشباب کی سرکشی بتا رہی تھی۔ کہ وہ دستانے کی طرح چھپی ہوئی ہرم سے زیادہ اُودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے۔ اس پردہ کا نوری برہنہ حصہ افقی! خیال کے لئے کیا باقی رہا؟" یہ اسی "دائرۂ ادبیہ" سے اقتباس ہے جس کی طرف شبلی نے اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔

"ترکوں کی معاشرت" کے سلسلہ میں فرماتے ہیں۔

"یونانیوں کا تخیل صرف تکمیل انسانیت تھا۔ یعنی وہ ہستئی موجود سے آگے نہیں جاتے تھے۔ ان کے خیال میں قوائے فطری کی نشوونما اور ان کا معتدل استعمال۔ بس یہی غائتِ زندگی تھا۔ یہی خیال شاگردانہ حیثیت سے یورپ نے حاصل کیا۔ یورپ کا موجودہ تمدن اسی خیال کا نتیجہ ہے۔ برخلاف اس کے ہم آج تک یہ سمجھ رہے ہیں۔ کہ ہماری ہستی جو گہوارہ سے شروع ہوتی ہے۔ اور بہ حیثیت موجودہ یقینی قبر سے پہلے ختم ہو جائے گی۔ ایک حرفِ غلط ہے۔ ترقی کا افتتاح آغوشِ لحد میں پہنچ کر ہوگا۔ میں نہیں جانتا ان خیالات کے ساتھ کوئی قوم دنیا میں کہاں تک متمدن اقوام سے ہم سطح ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ . . . . ."

"علامہ شبلی کا ماہوار علمی رسالہ" میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "اردوئے خاصہ" کی داد ملتی جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر انگلیاں اٹھتی تھیں آج اس لائق کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے۔ جوانیوں پر آئی ہوتی نچلی نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ مدتوں شعراء سے گانٹھا اتحاد رہا۔ اقتضائے سن، بری طرح کھل کھیلی۔ ہاتھ پاؤں نکالے اور بہتیرے بنائے بگاڑے۔ کیونکہ ایک زمانہ شیدائی تھا۔ لیکن یہ باتوں ہی باتوں میں سب کو ٹالتی رہی۔ بعض جگہ بے آبروئی کے سامان ہو کر رہ گئے۔ اور بال بال بچی۔ آخر آخر میں ملک کے منچلے یعنی ناول نویس یہاں تک ہاتھ دھو کر پیچھے پڑے کہ اس کی پردہ دری میں کچھ اٹھا نہیں رکھا تھا۔ . . . . . لیکن دفعتاً اس کی حالت نے پلٹا کھایا۔ کثرتِ فواحش باعثِ سنجیدگی ہوگئی۔ اچھے دن آتے ہیں تو بگڑی بن جاتی ہے۔ اب وہ مقدس علماء کی کنیزوں میں داخل ہے۔ لیکن سُنا گیا ہے۔ خوش اوصاف شبلی سے زیادہ مانوس ہے۔ اور قریب قریب انہیں کے تصرف میں رہتی ہے۔ . . . . ."

اس قسم کے نوادرِ ادب سے "افاداتِ مہدی" بھرے پڑے ہیں۔ یہ تو مشتے نمونہ از خروارے تھا۔ اس سے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ صاحبِ اسلوب کی حیثیت سے افادی الاقتصادی کا ہمسر اردو نثر نگاروں میں مشکل ہی سے کوئی نکل سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ حالی، آزاد، نذیر احمد، شبلی سبھی کے دل سے معتقد تھے۔ اور ان کے ساتھ غلو کو راہ دیتے تھے۔ اور خاص کر شبلی کو تو وہ خدا فرد ادب سمجھتے تھے۔ اور پوجتے تھے۔ بہت ممکن ہے اُنہوں نے اپنے خیال میں اردو نثر کے ان عناصر اربعہ سے اپنی ادبی قوت کی تربیت میں مدد بھی لی ہو۔ لیکن جہاں تک میں خود مطالعہ کر سکا ہوں۔ میں نے افادی الاقتصادی کی تحریر میں ان میں سے کسی ایک کی بھی تقلید کے کوئی آثار نہیں پائے ہیں۔ نذیر احمد اور آزاد سے ان کو تھوڑی بہت نسبت دی جا سکتی ہے لیکن پھر یہ نسبت اتنی ہی دور کی ہوگی جتنی کہ بتوں کو کعبہ سے ہو سکتی ہے۔ نذیر احمد کا اسلوب اپنی تمام نسائی دلآویزیوں کے باوجود اس رُومانی کیفیت سے بیگانہ ہے جو صرف مغرب کی چیز ہے۔ اور جو صاحبِ "افادات" کی امتیازی خصوصیت ہے۔ آزاد کے اسلوب میں رنگینی اور بانکپن جس قدر بھی ہو وہ اس قابل نہیں کہ بلیغ اور گہرے اشارات کا حامل ہو سکے۔ یعنی ان کے اسلوب میں معنویت نہیں ہے۔ برخلاف اس کے افادی الاقتصادی کا اسلوب محض تخیلی (Imaginative) نہیں ہے۔ اس میں معنویت کے تمام امکانات موجود ہیں۔ ان کا اندازِ تحریر دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ بلیغ بھی ہے۔ جس میں گہری سے گہری بات کہی جا سکتی ہے۔ اور یہ یقیناً مغرب کی دین تھی۔ مہدی مرحوم نہ صرف مغربی طرزِ معاشرت کے قائل تھے۔ بلکہ شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی طرزِ فکر اور طرزِ بیان سے بھی متاثر تھے۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے مغربی نثر نگاری کے اسالیب و صور کو حل اور جذب کر کے اردو نثر کے فطری عناصر بنائے۔ اس کا شاید بہت کم لوگوں کو احساس ہو کہ

اُردو نثر میں گذشتہ تیس سال سے جو مغربی طرز رائج اور مقبول ہے اس
کے موجد نہ حالی تھے نہ شبلی بلکہ خوش اسلوب افادی الاقتصادی تھے ۔
تواریخ و سیر اور تحقیق و تنقید میں حالی و شبلی کا مرتبہ مسلّم ہے اور اس اعتبار
سے ان لوگوں کی برابری کا دعویٰ کوئی نہیں کر سکتا کہ انہوں نے سب سے
پہلے تاریخ و تنقید کو جدید اصول فن کی رُو سے وسیع بنایا ۔ لیکن اردو کے
جدید اسلوبی میلانات کو متاثر و متعین کرنے میں اُن کا وہ حصّہ نہیں ہے
جو افادی الاقتصادی کا ہے ۔ اردو نثر کے موجودہ اسلوب کا سنگِ بنیاد
یقیناً افادی الاقتصادی نے رکھا ۔ اگرچہ ان کے بعد پھر کوئی ایسا نظر نہیں
آتا جس کو صحیح معنوں میں ان کا مقلّد کہا جا سکے ۔ لیکن اس کا سبب یہ
ہے ۔ کہ آزاد کی طرح ان کا اسلوب بھی بیک وقت باعثِ رشک اور
اور ناقابلِ تقلید تھا ۔ ۱۸

افادی الاقتصادی نے نہایت غیرت دار طبیعت پائی تھی ۔
وہ غیروں کا ممنون رہنا پسند نہ کرتے تھے ۔ یہ خصوصیت اُن کی
تحریروں میں بھی نمایاں رہتی ہے ۔ وہ حتی المقدور انگریزی الفاظ کے
استعمال سے پرہیز کرتے ہیں ۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ تحریر اور
تقریر دونوں میں جا بجا انگریزی الفاظ استعمال کرنا لوگ فخر کی بات
سمجھتے تھے ۔ حالی اور شبلی بھی جو انگریزی زبان پر کوئی دسترس نہ رکھتے
تھے ۔ اس علّت سے بچے نہ رہ سکے افادی الاقتصادی نے اگر کہیں
انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ مجبور ہو گئے
ہیں ۔ ورنہ وہ عموماً ترجمہ کر دیتے تھے ۔ اور اس کے لئے ان کو اپنے
"مادۂ اختراعی" سے کام لینا پڑتا تھا ۔ ان کے بیشتر ترجمے یادگار ہیں ۔
اور اردو کے ذخیرہ میں مستقل اضافوں کا اثر رکھتے ہیں ۔ مثلاً
Classics کے لئے "ادب الاساتذہ" (Specialist) کے لئے "اختصاصی"
(Higher Criticism) کے لئے "تنقید عالیہ" (Standard) کے لئے
"ٹکسالی" (Evening host) کے لئے "اختراعِ فائقہ" (Masterpiece) کے لئے
"میزبان شام" (Programme) کے لئے ضبطِ اوقات ۔ ابھی میں نے
"مادۂ اختراعی" کی جو اصطلاح استعمال کی ہے وہ بھی انہیں کی دی ہوئی ہے
جس کو وہ انگریزی لفظ (Originality) کی جگہ استعمال کیا کرتے
تھے "افادی الاقتصادی" بھی انہیں کی بنائی ہوئی اصطلاح ہے ۔ یہ
دراصل (Utilitarian) کا ترجمہ ہے ۔ جس کا اب صرف
"افادی" ترجمہ کیا جاتا ہے ۔ چونکہ یہ اصطلاح اس وقت بالکل غیر مانوس
تھی اور پھر چونکہ مہدی حسن "فلسفہ افادیت" کی معقولیت کے معترف بھی
تھے ۔ اس لئے بعض بے تکلف احباب مذاق میں ان کو "افادی الاقتصادی"
پکارنے لگے ۔ یہاں تک کہ ادبی دنیا میں "افادی الاقتصادی" ان کے نام
کا ایک جزو بن گیا ۔

"افادی الاقتصادی" کی تحریروں کی امتیازی شان وہ نفاست اور
نزاکت ہے جو ان کی فطرت ثانی تھی ۔ اور جو صرف مغرب میں نظر آتی ہے ۔
ڈاکٹر محی الدین قادری اپنی قابلِ قدر تصنیف "اسالیب بیان" میں لکھتے
ہیں ۔ "مہدی رسکن کی طرح الفاظ کے خوشنما بیل بُوٹے بنا کر پیش کرتے
ہیں "۔ آگے چل کر اسی مصنّف کی رائے ہے کہ "ان کی عبارتیں انگریزی
کہانیوں کی طرح خوشنما ہونے کے علاوہ سہل الہضم بھی ہوتی ہیں "۔
لیکن مجھے "افادی الاقتصادی" والٹر پیٹر سے زیادہ قریب نظر آتے
ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ اُن کی عبارت میں جو تغیری آہنگ اور اُن کے اسلوب
میں جو بلیغ ترنّم ہوتا ہے وہ کافی حد تک رسکن کی یاد تازہ کرتا ہے ۔ لیکن پھر
مصنّف کے اپنے تیور اور اس کا اپنا زاویۂ نگاہ بھی کوئی چیز ہے ۔ رسکن
کے اندر جو واعظانہ رنگ غالب رہتا تھا اس کی کوئی علامت مہدی مرحوم
میں نہیں پائی جاتی ۔ رسکن کے خیال میں جمالیاتی حُسن بجائے خود کوئی قدر
و قیمت کی چیز نہیں ۔ وہ جمالیات کو اخلاقیات کی روشنی میں دیکھتا ہے
اور حُسن کو خیر کے ماتحت تصوّر کرنا چاہتا ہے جس سے حُسن کی اپنی قدر
گھٹ جاتی ہے ۔ برخلاف اس کے پیٹر جو پری رفائلائٹ
(Pre-Raphaelite) صناعوں اور فرانسیسی مدرسۂ جمالیات
سے متاثر ہو چکا تھا ۔ حُسن اور وہ بھی حُسن صورت کو حاصلِ کونین سمجھتا تھا ۔
جس کے ساتھ اس کے والہانہ جذبات عبودیت کی حد تک پہنچے ہوئے
تھے ۔ اس کے خیال میں حُسن کے لئے کسی قسم کے خارجی اعتبارات کی
ضرورت نہیں ۔ حُسن اگر حُسن ہے تو سب کچھ ہے ۔ یہی انداز افادی کا
ہے ۔ انگریزی کے جوانمرگ شاعر کیٹس کی طرح ان کے لئے بھی "حسین چیز
ایک ابدی مسرّت ہے" ۔ وہ خالص حُسن اور خالص صناعی کے قائل ہیں
اسی لئے ان کو اسلوب کا اتنا ہی تیز اور شدید احساس ہے جتنا پیٹر کو
تھا ۔ یا جتنا اس کے بعد اس کے پیرو آسکر وائلڈ کو رہا ۔

"افادی الاقتصادی" نے جتنے مقالات لکھے ہیں اُن میں سے
بیشتر تنقیدیں ہیں ۔ اس کا اعتراف ہے کہ یہ تنقیدیں زیادہ تر وقتی اور
سرسری ہیں ۔ لیکن ہیں بہرحال تنقیدیں ۔ بہ حیثیت تنقید نگار کے بھی وہ

بہت کچھ پیٹر ہی کی یاد دلاتے ہیں۔ پیٹر کا تنقیدی اسلوب محاکاتی یا ارتسامی (Impressionistic) ہوتا ہے۔ جس کو ہیزلٹ اور لیمب کا رنگ سمجھنا چاہیئے۔ افادی الاقتصادی کا انداز تنقید بھی یہی ہے۔ اُردو میں وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے تنقید کو ادب لطیف بنایا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ کہ پیٹر کی طرح انہوں نے بھی تنقید کو شاعری اور وہ بھی غزل کے مرتبہ کی چیز بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی وقتی باتوں میں اس قدر ہمیشگی پیدا کر سکے ہیں۔ کہ آج بھی ہم اُن سے اسی طرح کیف اندوز ہوتے ہیں۔

جن انگریزی انشا پردازوں کا ذکر میں نے کیا ہے۔ ان سب میں ایک عنصر مشترک یہ بھی تھا کہ ان کی تحریریں ان کے ذاتی میلانات اور ان کے اپنے مزاج و طبیعت کا آئینہ ہوتی تھیں۔ افادی الاقتصادی کی بھی ایک خصوصیت یہ ہے۔ کہ ان کی تحریروں میں ان کی انفرادی زندگی کے آثار ہر لمحہ بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب رہتے ہیں۔ ان کے مزاج کی نفاست اور ان کی فطری شرافت ان کے ایک لفظ میں جھلکتی ہوتی ہے

افادی الاقتصادی فنِ مکتوب نگاری میں بھی آپ اپنی نظیر ہیں۔ غالب کے بعد اردو میں ایسا خط لکھنے والا نہیں پیدا ہوا۔ یوں تو اکثر مشاہیر ادب اردو ایسے نکلیں گے جن کے مکتوبات کو ہم آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ لیکن خطوط مہدی کی بات ہی کچھ اور ہے۔ ان کو پڑھئے تو معلوم ہوگا کہ دراصل خط لکھنے کا سلیقہ کیا ہے۔ اور ہندوستانی ابھی اس سلیقہ سے کس قدر بیگانہ ہیں۔ مجھے تو "عود ہندی" اور "اردوئے معلٰے" میں بھی وہ بات نہیں ملی۔ جو خطوط مہدی میں ہے۔ غالب کے خطوط سے تکلف اور اہتمام کی بُو آتی ہے۔ میں بعض جدید نقادوں کی طرح یہ کہنے کے لئے تو تیار نہیں کہ غالب واقعی محنت و کاوش کے ساتھ خط لکھتے تھے۔ اور یہ سمجھ کر کہ ممکن ہے آئندہ ان کے خط شائع ہو جائیں لیکن پڑھنے والوں کو اس قسم کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط کا مجموعی آہنگ وہی ہے جس کو خود غالب کی زبان میں "سادگی و پُرکاری" یا افادی الاقتصادی کی اصطلاح میں "پیدا کردہ بیساختہ پن" کہیں گے لیکن خطوط مہدی کا طرۂ امتیاز وہ بے تکلفی اور معصومیت ہے جو فطری ہوتے ہوئے بھی خالص صناعی کا حکم رکھتی ہے۔ وہ اردو مکتوب نگاری کے کاؤپر (Cowper) ہیں۔ ان کے خطوط بھی اسی طرح خلوص اور صداقت سے معمور اور ریا و تصنع سے خالی ہوتے ہیں۔ جس طرح کہ کاؤپر کے خطوط۔ وہ جانتے ہیں کہ روز کی معمولی باتوں میں ندرت اور

ساختہ بے ساختگی

تازگی کیسے پیدا کی جائے۔ اور اہم اور غیر معمولی باتوں کو خلوص، سادگی اور تاثیر سے بھر کر عوام کے لئے دلچسپ کیونکر بنایا جائے۔ کاؤپر کی طرح وہ بھی خطوط میں اپنی ساری شخصیّت کو بے نقاب کر دیتے ہیں لیکن کہیں سے خودی یا انانیت یا کسی قسم کے عصبی تناؤ کا احساس نہیں آنے دیتے انہوں نے روزمرّہ کی زندگی کو اپنے خطوط میں رومان بنا دیا ہے۔

ان کے خطوط ابھی عوام کے سامنے نہیں آئے ہیں۔ لیکن مہدی بیگم جنہوں نے اب سے پندرہ برس پہلے "افادات مہدی" سے ہم کو رُوشناس کرایا تھا۔ ان کے خطوط کو بھی مرتب کر کے مطبع کے سپرد کر چکی ہیں اور اب عنقریب شائع ہو کر اہل ذوق کے ہاتھوں میں ہوں گے۔ اس کے لئے ہم جس قدر بھی مہدی بیگم کے ممنون ہوں کم ہے کہ اُنہوں نے ان ادبی موتیوں کو محنت کر کے ہمارے لئے اکٹھا کر دیا۔ اس وقت اس مجموعہ کا کوئی خط میرے سامنے نہیں ہے۔ کہ میں اس میں سے مثال پیش کر سکوں۔ لیکن دو چار خط مجھے مل گئے ہیں۔ جن کے لئے میں خان بہادر مولوی محمد ذکی صاحب اور ان کی بیگم یعنی مرحوم کی بڑی لڑکی کا ممنون ہوں۔ یہ خط مجموعہ میں شاید اس لئے شامل نہیں ہیں کہ وہ بے انتہا "نجی" اور ذاتی ہیں۔ لیکن میری غرض انہیں سے پُوری ہو سکتی تھی۔ اس لئے کہ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ مرحوم ضرورت سے زیادہ "نجی" اور معمولی باتوں کو بھی سب کی دلچسپی کی چیزیں کیسے بنا دیتے تھے اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک ہی خط میں لکھتے ہیں۔ اور اس میں اپنے دو خورد سال بچّوں کے حرکات و سکنات کی یوں مصوّری کرتے ہیں۔

"ایک لڑکا آگے آگے بھاگا جاتا ہے۔ ایک بچّہ اس کے پیچھے لگا ہُوا ہے کچھ اختلاف ہو گیا ہے۔ اس لئے دانت کاٹنے کی فکر میں ہے دری کے فرش تک تو یہ گھینٹوں چلا۔ (جسے تم بکیّاں کہتی ہو) اس کے بعد ٹاٹ کی رگڑ سے بچنے کے لئے یہ چھوٹا سا دو ٹانگ کا حیوان "چوپایہ" بن گیا ہے۔ اور اب شاہد کی پنڈلی پر دانت جمایا چاہتا ہے۔ لیکن مدد پہنچ گئی۔ نافذ کا وار خالی گیا!

اپنی بڑی لڑکی کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"تمہارے ہاتھ کی کھجوروں نے الہ آباد کی زندگی یاد دلائی۔ کبھی یکجائی شرطِ زندگی تھی۔ تم نے نئے سر سے زندگی پائی۔ خدا کرے اس درمیان میں تم نے پُوری ترقی کر لی ہو اور اس قابل رہو کہ تمہارے خیال سے دل بہلاتا رہوں!"

اسی لڑکی کو ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں ۔

"خدا پر بھروسہ رکھو اور ذرا بھی دلگیر نہ ہو۔ یہ فطرت کے معمولی عوامل ہیں جو ہوتے رہتے ہیں۔ خدا میری ہیرا تراش بیٹی کو تلف نہیں کرے گا۔ ثبوت یہ ہے کہ تم نے ایک غیر علاج پذیر مرض سے معجزانہ شفا پائی ہے اگر تم واقعی مجھے چاہتی ہو تو دل چھوٹا نہ کرو۔"

پھر دوسرے خط میں لکھتے ہیں ۔

"آج کل گرمی میں کچھ کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ یہاں تک کہ میں نے کھانا بھی چھوڑ رکھا ہے۔ کبھی ولائتی دلیا دو انڈے کے ساتھ کھا لئے۔ کبھی مچھلی کا ایک ٹکڑا، الہ آباد سے آئی ہوئی ڈبل روٹی اور مکھن کے ساتھ بشرطیکہ نارنگی کا جام بھی ہو۔ غرض ٹالتا رہتا ہوں۔ دال بھات کی مقداری ترکیب آج کل کے موسم کے لئے کس قدر ناموزوں ہے۔"

ان خطوط کو پڑھ کر ہم کو یقین ہو جاتا ہے۔ کہ سچی رومانیت (Romanticism) اور سچی تخئیلیت (Idealism) اگر ہم کو کہیں مل سکتی ہے تو وہ صرف روز مرہ زندگی کی معمولی باتوں میں جن کو عموماً ہم اس قدر بے کیف اور غیر دلکش پاتے ہیں۔ میں اب صرف چند اقتباسات اور دینا چاہتا ہوں۔ اور اس کے بعد آپ لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔

خان بہادر محمد ذکی صاحب کو لکھتے ہیں۔

"مدت کے بعد آپ کا خط دیکھا۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ آپ مطمئن رہیں۔ میری طرف سے کوئی غیر عاقلانہ پیش قدمی نہیں ہوگی۔ آپ لوگوں کو میں نے جو کچھ لکھا وہ میرے احساسات کا اظہار تھا۔ اور یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ میں اپنے جذبات کو چھپاؤں۔ . . . ."

اپنے دوست مولوی محمد افراغ صاحب مرحوم کو لکھتے ہیں۔

"میری ترقی میں کچھ دیر ہوئی جس قدر میری تمدنی رفتار تیز تھی۔ اقتصادی مشکلات پر جلد غالب نہ آسکا۔ اس خیال سے کانپ اٹھتا تھا کہ کمند اگر لب بام پہنچ کر ٹوٹی تو اس حیثیت سے افسوس رہ جائے گا۔ کہ توسیع میعاد کی درخواست یعنی "کاسۂ گدائی" ہاتھ میں ہوگا۔ اور میں "بے مانگے موتی" چاہتا تھا۔ جن کا اپنی قابل رشک زندگی میں ہزار موانع کے ساتھ بھی عادی رہا۔ بہرحال بخیر گذشت . . . . . ."

خان بہادر محمد ذکی صاحب کو لکھتے ہیں۔

"عبد الماجد کی نئی تصنیف یعنی "فلسفۂ اجتماع" آپ نے دیکھی "فلسفہ جذبات" کے بعد یہ دوسری کتاب ہے جو ایک نہایت ضروری موضوع پر لکھی گئی ہے۔ اور دراصل اردو لٹریچر میں ایک قیمتی اضافہ ہے۔ ڈاکٹر لیبان نے جو حکمائے عصر میں ایک زندہ مصنف اور زبردست عالم نفسیات ہیں۔ فرنچ میں رُوح الاجتماع پر ایک ضخیم کتاب لکھی ہے۔ جس کا ترجمہ مصریوں نے عربی میں کیا ہے۔ یہ کتاب بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ ۶ مہینے میں آپ کی عربی اتنی ہو سکتی ہے۔ کہ آپ بے تکلف ادب الاساتذہ (کلاسیکل لٹریچر) سے فائدہ اٹھا سکیں۔ کاروباری زندگی میں کیا آپ اتنا وقت نکال سکیں گے۔ دل پر رکھ لینے کی بات ہے۔ خاص کر جدید عربی تو کچھ ایسی بڑی بات نہیں۔ رسائل اور لغت سے پورا کلام نکل جاتا ہے۔ . . . "

ایک اور خط میں بڑی لڑکی کو یوں سمجھاتے ہیں۔

"اپنی رفاقت، دلسوزی اور ہمدردی سے بار فکر کم کرتی رہو۔ جس کے لئے کامل شائستگی کی ضرورت ہے۔ تمہاری ذرا سی کج ادائی یا کسی وقت معمولی اخلاق کی کمی بڑے سے بڑا جرم ہے۔ جو کوئی خاتون (لیڈی) کر سکتی ہے۔ اور جس کا فرض غم کا بھلا دینا ہے۔"

اسی خط میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

"موسم بہت سخت ہے۔ کھانے پینے کا خیال رکھنا۔ کوئیں کا پانی جب شہر میں بیماری کی شکایت ہو قابل اطمینان نہیں ہوتا۔ اس لئے ابال کر کورے الواسوں میں ٹھنڈا کر کے پیو۔ کھانے میں کوئی چیز ثقیل نہ ہو۔ ٹھنڈی غذا، ٹھنڈا دودھ استعمال نہ کرو۔ ہر چیز بشر گرم ہونی چاہئے۔ جس میں کالرا کے جرمس اگر ہوں گے بھی تو فنا ہو جائیں گے۔ خاص کر "قاتل انسان" یعنی مکھی سے کھانے کی چیزوں کو بچاؤ یعنی وہ جس غذا پر بیٹھے سمجھ لو متاثر ہو گئی۔ ایک بات کا اور خیال رکھنا عبدیا ڈیڑھ ڈیڑھ پاؤ کے نوالے دن رات میں اگر بارہ دفعہ بھی حلق سے اتارے تو کچھ حرج نہیں۔ لیکن بی صفیہ آنکھ بچا کر شریک نہ ہو "

اسی لڑکی کو ایک خط میں تدبیر منزل کا سبق اس لطیف پیرایہ میں دیتے ہیں۔ گویا کسی نہایت پر کیف شعر کے رموز سمجھا رہے ہیں۔

"لکڑی مل گئی۔ آج بھی جاتی ہے۔ اتنی اچھی ہے کہ جلانے کے عوض کھانے کو جی چاہے گا۔ سب باہر نہ رکھواؤ۔ نمک حرام غائب کر دے گا۔ یا بے ضرورت پھونک دے گا . . . . "

ایک دوست کے خط میں لکھتے ہیں۔

"دنیا کو ایسے ناپاک وجود سے خالی ہونا تھا۔ جو بے ضرر اشخاص کی جائز آزادی اور قدرتی سکون و عافیت میں مخل ہو۔ میں تیسرے درجہ کی مخلوق کو اخلاقی حیثیت سے ہمیشہ قابل نفرت سمجھتا رہا۔ لیکن ایسی سخت وحشیانہ مثال اس سے پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی۔ ۔ ۔"

آخر میں پھر ایک بار دہرانا چاہتا ہوں کہ افادی الاقتصادی کے اندر ایک خداداد ذوقِ جمال تھا اور ان کی نگاہ حسن شناس تھی۔ وہ ادنیٰ سے ادنیٰ چیز کے اندر اس حسن کو دیکھ لیتے تھے۔ جو اس کی سطحی کثافتوں میں چھپا ہوتا تھا۔ اور ان کا پیغام یہ تھا۔ کہ حسن مقصود بالذات ہے۔ اور حسین چیز اپنی زندگی کے لئے کسی دوسری چیز کی دست نگر نہیں +

مجنوں گورکھپوری

غزل

لگایا موت نے کچھ ایسا قہقہہ حیات پر
کہ چھا گئی فسردگی سی رنگِ کائنات پر

یہ میرے ذوقِ آگہی کی ابتدا کا حال ہے
کہ دامِ جستجو بچھا رہا ہوں شش جہات پر

نئی مصیبتوں میں پھر اُلجھ گیا ہوں کیا کروں
میں کر رہا تھا غور ابھی گذشتہ واقعات پر

مری بلند ہمتی کہیں شکست کھا نہ جائے
کہ بے سبب جھڑک رہے ہو مجھ کو بات بات پر

اُٹھائی ہیں کڑی مصیبتیں وہ راہِ عشق میں
مسرتوں کا ہے گماں جہاں کے حادثات پر

یہ کیا کیا کہ تو نے اپنا اعتبار کھو دیا
ہنسا ہے زخمِ دل تری نگاہِ التفات پر

شرارِ عشق کے سبب عطا ہوئیں وہ تابشیں
کہ چھا گیا ہے دل مرا تری تجلیات پر

ہوا ہے کشفیؔ ستم نصیب بے نیازِ غم
کہ ہنس رہا ہے دم بدم ہجومِ مشکلات پر

کشفیؔ ملتانی

بستر پہ

(دماغ میں دو قسم کی لہریں حرکت کرتی ہیں - ایک اوپر کی لہریں، دوسری نیچے کی لہریں۔ جب ہم کسی سے بات کر رہے ہوتے ہیں تو وہ باتیں اُوپر کی لہریں ہوتی ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم اپنے دل میں بھی کچھ سوچتے جاتے ہیں - یہ نیچے کی لہریں ہوتی ہیں - اس مکالمے میں نیچے کی لہریں قوسین میں بند ہیں)۔

ماں :- "اکبر سو گئے ہو تم؟" - (میرا خیال ہے کہ اکبر سے اب اُس بات کے متعلق پوچھوں) -

اکبر :- "نہیں اماں" - (صغرا کا خیال مجھے جلد کب سونے دیتا ہے) - "ابھی تک جاگتا ہوں - کیا بات ہے؟"

ماں :- "کچھ نہیں یونہی" - (پوچھوں یا نہ پوچھوں؟ کہیں ناراض نہ ہو جائے کہ ماں نے یہ بات کہاں سے سُن پائی - جوان بیٹا ہے - مگر جوان بیٹے کو سمجھانا ماں باپ کا فرض نہیں؟ میں اس سے ذکر کئے ہی دیتی ہوں) - "اکبر!"

اکبر :- "ہاں اماں! میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ کیا بات ہے" - (ماں یونہی میرے تصوّرات میں خلل انداز ہو رہی ہے "کل صبح مجھے ضرور ملتے جانا" "میری جان ضرور ملوں گا!" کس بہانے سے جاؤں؟ پٹواری سے کہوں گا - کہ لکھنے کے لئے رف کاغذ دو - آپ نے اُس دن کہا تھا کہ دیں گے") -

ماں :- "بیٹا اب تم کبھی پٹواری کے گھر نہیں گئے؟" (آہستہ آہستہ بات چھیڑوں گی) -

اکبر :- "دیر سے کبھی اُس طرف نہیں گیا" - (ماں کو کیا خبر کہ بستر پر لیٹنے سے پہلے اُدھر ہی سے آیا ہوں اور دن میں جب تک دو تین چکر اُدھر کے کاٹ نہ لوں چین نہیں پاتا!)

ماں :- "آج دوپہر کو اُس کی لڑکی ہمارے ہاں آئی تھی" - (اس کے متعلق تم سے کچھ کہوں گی) -

اکبر :- ..... بات کاٹ کر ..... "کس کی لڑکی؟" (ہیں! صغرا جب میں سکول گیا ہوا تھا تو ہمارے ہاں آئی تھی! اُس نے تو مجھے بتایا ہی نہیں - مگر نہیں اُس کو تو آج بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا، پٹواری گھر پر تھا)

ماں :- "پٹواریوں کی صغرا" - (تم اُس کو خوب جانتے ہو)

اکبر :- (کمبخت نے کہیں بتا نہ دیا ہو - کہ اکبر شام کو ہمارے ہاں آیا تھا) -

ماں :- "یہ لڑکی کس قدر چالاک ہے - کس قدر باتیں کرتی ہے - ابھی کل کی بات ہے جب پٹواری ہمارے گاؤں میں آیا تھا تو بات کرنا نہیں جانتی تھی - دیکھتے ہی دیکھتے بڑوں کے کان کترنے لگ پڑی" - (ابھی ہے کہیں کی زلیخا - ہمارے بیٹے سے آنکھ مٹکا شروع کر دیا)

اکبر :- "کیا کہتی تھی؟" - (بھلا اُسے کس نے کہا تھا کہ ہمارے گھر آؤ - بیوقوف، دنیا والوں کی نگاہوں سے بچ کر رہنا سخت مشکل ہے)

ماں :- "دفع کرو بیٹا ایسی بلاؤں کو" - (تم کوئی دیوانے تھوڑے ہی ہو)

اکبر :- "دفع کرو ان بلاؤں کو" ہیں! یہ کیا؟" میں ان بلاؤں کو کیا کہتا ہوں اماں؟"

ماں :- "یونہی میں نے سوچا شاید تم سے کہیں باتیں نہ کیا کرتی ہو" (فاطاں کہتی ہے کہ میں نے کئی دفعہ دونوں کو مسکرا مسکرا کر باتیں کرتے دیکھا ہے)

اکبر :- "مجھ سے باتیں کرنے کا کیا مطلب ہے؟ عجیب بات ہے - (شاید ماں کو خبر ہو گئی!) - "میں نے تو کبھی اُس کی شکل تک نہیں دیکھی" - (میرے دل میں ہر وقت وہی بستی ہے) - "اور مجھے کیا غرض؟ مجھے کیا

پڑی ہے کہ اُس سے باتیں کروں ؟" (کچھ نہ کچھ ضرور ظاہر ہوگا۔ اصل میں گلی میں اور شام کو باہر جاکر ہمیں باتیں نہیں کرنا چاہئیں، ممکن ہے کسی نے دیکھ لیا ہو)۔

ماں ۔"اس قسم کی چالاک لڑکیاں بات کرنے کے سَو ڈھنگ جانتی ہیں" (معلوم نہیں کیا کچھ کہہ سُن کر اُس نے تمہیں قابو میں کر لیا ہے!)۔

اکبر ۔"مگر اماں مجھے اس کی باتوں سے کیا؟ بھاڑ میں جاتے وہ اور اس کی باتیں۔ ہم لڑکوں کو ان سے کیا؟"۔ (مجھے نیند کا بہانہ کرنا چاہئے، مگر اماں کی باتیں ذرا سنیں تو سہی!)۔

ماں ۔"بیٹا پٹواریوں کے ہاں نہ جایا کرو۔ اپنے محنت کیا کرو، امتحان نزدیک ہے"۔ (لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والے لڑکے پاس نہیں ہُوا کرتے)۔

اکبر ۔ (یا الٰہی خیر!) "مَیں کب جاتا ہوں؟"۔ (صغرا نے ضرور بتا دیا کہ اکبر آیا کرتا ہے۔ اچھا صبح اُس سے پُوچھوں گا۔ اچھی طرح پوچھوں گا کہ یہ کیا کیا؟)۔

ماں ۔"اس محلّے کے رہنے والے سب کے سب اندھے تھوڑے ہی ہیں۔ آج ہی حمیدے نے کہا تھا کہ بھائی جی ہماری گلی سے روز گزرا کرتے ہیں"۔ (اور تم صاف مُکرتے ہو۔ مَیں سب کچھ جان گئی ہوں)

اکبر ۔"جھُوٹ کہتا ہوگا وہ سُور کا بچہ"۔ (مگر ماں کو اتنی تحقیق کی ضرورت ہی کیوں پیش آئی؟)۔

ماں ۔"نا بیٹا! بچوں کو گالیاں دینا بُرا کام ہے"۔ (وہ جھُوٹ کیوں بولتا؟ بچہ ہی تو ہے، نادان!)

اکبر ۔ حرامی!"۔ (کل جب ہم کھڑے باتیں کر رہے تھے تو ہمارے پاس کھڑا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ باتیں کر رہے تھے) "کیا کہتا تھا وہ؟"۔

ماں ۔"کہتا تھا کہ کل بھائی جی اور پٹواریوں کی صغرا کنوئیں پر ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ اس وقت حامد آگیا اور صغرا پانی لے کر چلی گئی"۔ (جیسے ایک دُوسرے سے واقف ہی نہیں ہوتے)۔

اکبر ۔"اگر کوئی کنوئیں کے پاس کھڑا ہو تو کئی لوگ پانی لے کر جاتے ہیں"۔ (حرام زادہ حمیدو!)

ماں ۔ (اور کئی بغیر ضرورت کے پانی لانے کے بہانے گھر سے بھاگ آتے ہیں!)۔ "مگر تم تو کہتے ہو کہ میں اس گلی میں کبھی گیا ہی نہیں؟

اکبر ۔"کنواں تو درمیان میں ہے۔ اس سے آگے اُن کی گلی شروع ہوتی ہے"۔ (حمیدو کو سیدھا کر کے چھوڑوں گا چغل خور، کتا!)۔

ماں ۔"اچھا تو کیا باتیں ہوتی تھیں کنوئیں پر؟"۔ (کب تک چھپاؤ گے اس داستان کو؟)۔

اکبر ۔"کچھ نہیں مجھ سے تو کوئی بات نہیں ہوئی اور کسی لڑکے سے کرتی ہوگی"۔ (یہ بات ہے تو مَیں اس سے ملنا ہی چھوڑ دوں گا، مگر اُس بیچاری کا کیا قصور؟)۔

ماں ۔"مگر حمیدو تو کہتا تھا کہ صغرا نے کہا مَیں آپ کو ہر وقت یاد کرتی رہتی ہوں سوتے میں بھی! اور بھائی جی نے کہا تم سے زیادہ مَیں تمہیں یاد کیا کرتا ہوں"۔ (صاف صاف کیوں نہ کہہ دوں!)۔

اکبر ۔"لاحول ولاقوۃ۔ بچّوں کی بکواس پر یقین کرنے لگی ہو؟" (میرے دل کو کمبخت حمیدو کا وہاں پاس کھڑا ہونا ہی کھٹکتا تھا۔ وہی ہُوا پانچ سال کا چھوکرا اور اس قدر حافظہ تیز!)۔

ماں ۔"اچھا وہ تو بچّہ ہی سہی، فاطاں تو بچّی نہیں، وہ کہتی تھی کہ مَیں نے انہیں مُسکراتے اور اشارے کرتے کئی دفعہ دیکھا ہے"۔

اکبر ۔"یا اللہ ساری دنیا میری چغلیاں کیوں کھانے لگ گئی؟" (ہم سمجھتے تھے کہ کسی کو خبر نہیں اور یہاں بچہ بچہ ڈھنڈورچی بنا ہُوا ہے۔)

ماں ۔"بیٹا بُرا نہ ماننا۔ میری بات مانو تو اس چنڈالن کی شکل نہ دیکھو۔ ایسی باتوں میں دھرا ہی کیا ہے، سوائے مفت کی بدنامی کے ..... تم اپنا پڑھو لکھو۔ باپ دادا کا نام روشن کرو۔ جس چیز کی ضرورت ہو مانگو۔ مہیّا نہ کریں تو دین دار۔ کھاؤ۔ پیو، پہنو اور بھُولے سے بھی ایسی باتوں کی طرف توجّہ نہ دو۔ تمہارے ابا کو خبر ہوگئی تو بہت بُری بات ہوگی۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بَیری اُن کو خط لکھ دے .... ایسی باتوں کی طرف بھُولے سے بھی توجّہ نہ کرو۔ ......"

اکبر ۔ (میری توجّہ سے ان کا معلوم نہیں کیا بگڑتا ہے۔ مَیں نے کون سا گناہ کر لیا جو بدنام ہوتا پھروں گا؟)۔

ماں ۔"...... مَیں نے تو صغرا سے بھی آج کہہ دیا تھا کہ جوان لڑکیاں آرام سے گھر میں بیٹھا کرتی ہیں۔ بیٹی رانی! بُرا نہ ماننا تمہیں گھر سے نکلنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ......"

اکبر ۔ (اور گھر کیا میں نہیں جا سکتا؟ ایک نظر اُسے دیکھنا ہی ہے، دیکھ لیا کریں گے)۔

ماں :۔ "... اللہ رکھے تیرا چھوٹا بھائی حامد کونسا کام نہیں کرسکتا اب توجوان ہے خیر سے "

اکبر :۔ "وہ گھر سے باہر نکلے یا نہ نکلے ۔خواہ کنوئیں میں گر جائے مجھے اُس سے کیا ؟" ۔ (زمانہ بہت بُرا ہے اِدھر کسی سے بات ہوئی اور اُدھر گھر گھر چرچا شروع ہُوا ۔ بات شاید چل نکلی ہے ۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا ؟) ۔

ماں :۔ "کیوں کسی کی بیٹی کنوئیں میں گرے ؟" ۔ (کنوئیں میں گر جائے تو تمام جھگڑے ہی ختم ہوجائیں) ۔ بیٹا مجھے تو تمہیں سمجھانے سے غرض ہے ۔ تم بچے نہیں ہو ۔ دسویں جماعت میں پڑھتے تمہیں دو سال ہو گئے ۔ تمہارا دل صاف ہوگا تو دنیا پڑے کنوئیں میں . . . . بیٹا نماز پڑھا کرو ۔ اور خدا سے نیکی کی دُعا مانگا کرو ۔"

اکبر :۔ "آگے مَیں کونسی بدی کر رہا ہوں ؟"

ماں :۔ "بدی کرو یا نہ کرو ۔ نیکی کا طالب ہر وقت ہونا چاہیئے ۔"

اکبر :۔ "اچھّا اماں مجھے نیند آرہی ہے ۔" (خوب ہوئی ! مجھے معلوم نہیں تھا کہ اماں میرا تمام کچاّ چٹھّا کھول کر آگے رکھ دے گی ۔ یہ کچھ تو زبانی ایک دو باتوں کی بابت ہُوا ۔ امّاں کو اگر وہ رومال لینے ، پھُولوں کا ہار دینے ، انگشتری خرید کر دینے اور دوپہر اور چاندنی راتوں میں دیر دیر تک ملنے کا علم ہوجائے تو شاید مجھے گھر سے ہی نکال دیں . . . .) ۔

ماں :۔ "اچھّا بیٹا سو رہو ۔" (خدا انہیں نیک ہدایت دے) ۔ "صبح جلد اُٹھ کر سکول جانا ہے ۔"

اکبر ۔ (اصل میں ہمیں بہت احتیاط سے کام لینا چاہیئے تھا ۔ زمانہ بہت چالاک ہے ۔ دو شخص مسکرا کر جائیں کہاں ؟ یا اللہ ایسا نہ ہو کہ ہمارا عشق ہیر رانجھے کی طرح رسوائے عالم ہوتا پھرے ۔ مگر رانجھا تو ہیر کے لئے سب کچھ چھوڑ چکا تھا ۔ اور علاّنیہ ہیر کی پرستش کرتا تھا ۔ ہیر بھی تو حد درجہ وفادار ثابت ہوئی تھی ۔ وہ کھیڑوں پر لات مار کر واپس اپنے رانجھے سے آملی تھی ۔ کل کلاں اگر صغرا کی شادی ہوجائے تو وہ تو میرے لئے اگلا گھر نہیں چھوڑ سکے گی ۔ نہیں ، وہ کیا کرسکتی ہے ؟ دنیا ہی کچھ نہیں کرنے دے گی ۔ لوگ کہیں گے پٹواری کی لڑکی نے تو خاندان کی ناک کاٹ دی ۔ مگر ہمارا خاندان بھی تو ساتھ ہی دھر لیا جائے گا ۔ کیا ہی اچھّا ہوتا اگر ہم ایک ہی خاندان سے ہوتے ہماری شادی ہوجاتی اور مزے سے زندگی کے دن بسر کرتے ۔ . . . . . میری منگنی شہر میں ہوئی ہے ۔ شہر کی لڑکیاں تو بہ ہی بھلی ۔ . . . . . ویسے ہی وہ ہوگی . . . . . مَیں نے اُسے دیکھا تو نہیں مگر سُنا ہے کہ بہت سگھڑ اور سیانی ہے ۔ ہوگی ۔ . . . . . صغرا ابھی تو کہتی تھی کہ جب شہرن تمہارے گھر آجائے گی تو ہماری طرف بھول کر بھی نظر نہیں اُٹھاؤ گے ۔ مَیں نے کہا جب تک دم میں دم ہے تمہاری یاد سے غافل نہ رہوں گا ۔ کہنے لگی زمانہ بدل جایا کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہی طبیعتیں بھی اور ہوجایا کرتی ہیں ۔ . . . . مَیں نے کہا تمہاری طبیعت بدل جائے تو بدل جائے ۔ آخر تم بھی تو کہیں بیاہی جاؤ گی نا ۔ کہنے لگی میں شادی ہی نہیں کروں گی بھلا یہ کبھی ہوسکتا ہے ۔ . . . . شادی نہیں کروں گی . . . . اور پٹواری اس دن بڑھئی سے پلنگ بنوانے کو کہہ رہا تھا ۔ . . . . سُوکھی سیاہ شیشم کی لکڑی نظر میں رکھنا ۔ بائیں دو ایک درخت کٹوا دیتا ہوں ، اُن کے تنے کاٹ لینا ۔ اگلے سال تک خوب سُوکھ جائیں گے ۔ لڑکی کے لئے پلنگ کے علاوہ ایک دو کرسیاں بھی نکل آئیں گی ۔" . . . . . . اگلے سال ہمارا امتحان چھوڑ نتیجہ بھی نکل گیا ہوگا ۔ دوسرا سال ہے خدا کرے کہ پاس ہوجاؤں ۔ اصل میں یہ کمبخت ریاضی ہی مجھے لے ڈوبتی ہے ۔ جیومیٹری کے تو خیر مسئلے رٹ لوں گا ۔ یہ الجبرا اور حساب بہت ستاتے ہیں ۔ کہیں سے کوئی گیس پیپر مل جائے تو خوب رہے ۔ پچھلے سال والا گیس خوب تھا ۔ مَیں نے سوچا یونہی ہوگا ۔ پرچہ دیکھا تو گیس والے تمام قاعدوں کے سوال تھے ۔ معلوم نہیں یہ گیس بنانے والے پرچہ بنانے والوں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں ۔ . . . . اچھّا اس وقت رشید کو لاہور خط لکھوں گا کہ گیس پیپر کی تاک میں رہے ۔ . . . . . رشید کی بیوی کس قدر خوبصورت ہے ۔ شہرن ہے نا ۔ اس کا انگوری رنگ کا دوپٹہ اور گورا چہرہ اب بھی میری آنکھوں کے سامنے پھرتا ہے ۔ . . . . . مَیں تو یونہی ان کے گھر کے باہر سے گزرا تھا ۔ تھوڑا سا دروازہ کھُلا ہُوا تھا ۔ سامنے وہ بیٹھی تھی ۔ مَیں نے غور سے اُسے دیکھ لیا ۔ آٹھ دس دن یہاں رہے تھے ۔ ایک دفعہ بھی اس نے باہر قدم نہ نکالا ۔ کس قدر پردے کی پابند تھی ۔ یہ شہری عورتیں کس قدر نازک ہوتی ہیں ۔ معلوم نہیں عقلمند بھی ہوتی ہیں یا نری جاپانی گڑیاں ۔ . . . . . میری بیوی شہرن ہے ۔ . . . صغرا تو بہت عقلمند ہے ۔ چالاک بھی ہے ۔ شہریوں کا کیا ہے ؟ صغرا بھی اگر باہر پھرنا چھوڑ دے ۔ اُجلے اُجلے کپڑے پہنتے رہے ۔ ہاتھ پاؤں میں مہندی لگائے رکھے ۔ دن میں کئی کئی دفعہ صابن سے ہاتھ مُنہ دھوئے ۔ اور

سُرمہ لگائے اور رامو کہتا تھا کہ ہونٹ سُرخ کرنے کے لئے شہر کی عورتیں گلابی رنگ کی ڈلیاں ہونٹوں پر ملتی ہیں۔ . . . . مگر رنگ تو کڑوا ہوتا ہے نہ نہ میٹھا بھی ہوتا ہے جو شادی پر نائی چاولوں میں ڈالتے ہیں۔ صغرا کی جب شادی ہو جائے گی تو معلوم نہیں وہ مجھے یاد رکھے گی یا نہیں . . . سال چھ ماہ کے بعد کہیں سُسرال سے آیا کرے گی۔ میں تو اس کے بغیر اُداس ہی رہا کروں گا۔ اچھا۔ . . . . (لمبا سانس کھینچتا ہے اور کروٹ بدلتا ہے) . . . . . . صبح حساب کے دس سوال دکھانے ہیں۔ چار نہیں تین۔ ایک کا جواب غلط نکلا تھا۔ تین نکالے ہیں۔ ذرا پہلے جا کر موہن سے کاپی مانگیں گے اور اُتار لیں گے۔ . . . . . . یہ سیکنڈ ماسٹر یہاں سے تبدیل ہو جائے تو اچھا ہے۔ ٹھگنا سا ہمیشہ مجھی پر ڈانٹ پیستا رہتا ہے۔ . . . . . . اچھا میرا کیا بگاڑے گا . . انتہا ہو گئی! میرے پیچھے تو دنیا ہاتھ دھو کر پڑ گئی ہے۔ نمبردار بھی مُنہ پھُلائے پھرتا ہے۔ کیا ہوا جو ایک گنّا توڑ لیا؟ پٹواری کے گھر تو وہی گنے گٹھوں کے گٹھے جاتے ہیں۔ پٹواریوں کو بھی کیا مزا ہوتا ہے۔ ساگ، پات، مولیاں شلغم، گنّے، رس، گڑ شکر کیا کچھ نہیں آتا رہتا۔ اسی واسطے تو صغرا کہتی تھی کہ تم پٹواری بن جاؤ۔ میرا ابّا کہتا تھا کہ جو پٹواری دس جماعتیں پڑھا ہوا ہو وہ جلد ہی گرداور بن جاتا ہے۔ . . . . . . اس کا ابّا ٹھیک کہتا ہو گا۔ وہ تو کہتا تھا کہ حامد کو ضرور میٹرک پاس کروائیں گے۔ وہ تو پھر ضرور گرداور بن جائے گا۔ نائب صاحب اور تحصیلدار ان کی مان لیں گے . . . . صغرا ایک دن کہتی تھی کہ میرا ابّا تحصیل میں گیا ہوا ہے . . . . تحصیلدار سے ملنے گیا ہو گا۔ . . . . اس دن ہی اصل میں ہماری محبت بڑھی۔ میں اُن کے گھر گیا۔ پٹواری تحصیل کو گیا ہوا تھا۔ . . . . . . نہیں اس سے پہلے بھی مجھے اُس کا خیال تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے دیکھا کرتی اور میں اُس کو۔ پار سال میلے پر ہنگوڑے میں بیٹھی تھی۔ ہنگوڑے کی مشین بھی تو موٹر کی مشین جیسی ہوتی ہے۔ اُسی طرح ہینڈل گھماتے ہیں۔ . . . . . یہ ہنگوڑے والے بھی بہت پیسے کماتے ہیں۔ . . . . . لانبی لانبی سلاخوں کے آگے ڈولیاں بندھی ہوتی ہیں جب وہ ترچھی ہو کر تیزی سے گھومتی ہیں تو عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ . . . . صغرا ہنگوڑے میں بیٹھی تھی۔ میں اُدھر سے گزرا، میں نے اُسے نہیں دیکھا، وہ مجھے متوجہ کرنے کے لئے دُوسری لڑکیوں کو اونچے اونچے پکارنے لگی۔ "اری داراں!" میں تو ایسی باتوں کو فوراً جان لوں اور اس کی آواز کو تو ہزار لڑکیوں کی آوازوں میں بھی پہچان لوں۔ میں نے نظر اُٹھائی تو مُسکرا کر منہ پھیر لیا۔ پھر جب ہنگوڑا چلا اور میں ہر چکر میں اسے دیکھتا تو مجھے ہی دیکھ رہی ہوتی۔ وہ اُتری تو میں چڑھا۔ اور میں بھی چلتے ہنگوڑے میں اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مُسکرایا۔ سب لوگ ہنس رہے ہوتے ہیں، کسی کو کیا خبر۔ . . . . . پھر میلے میں اس کے پاس سے گزرتے وقت میں نے آہستہ سے کہا "کوئی چیز لینی ہو؟ تو بتاؤ" . . . "آپ بتائیں" میں نے کہا "لی جائے گی؟" "ہاں" . . . . "میں تو تمہیں چاہتا ہوں" بولی "تو مجھے کندھے پر اُٹھا لیں اور لے چلیں۔ مزے سے میلہ دیکھیں گے"۔ میں نے کہا "ہم خود نہ میلہ بن جائیں گے"۔ میں نے مسکرا کر اُسے دیکھا اور اس کے بازو میں ایک چٹکی لی۔ وہ چُپ رہی . . . . . اور میلے سے بھی پہلے . . . . کیا؟ . . . ہاں یاد آیا۔ ایک دن کنوئیں پر پانی نکال رہی تھی میں نے کہا تھوڑا سا پانی پلا دو۔ وہ یوں گھر کو چلی گئی جیسے میری بات سُنی ہی نہیں۔ دوبارہ نظر اُٹھائی تو لسّی کا گلاس لئے اپنی ڈیوڑھی میں کھڑی تھی۔ میں وہاں گیا، ادھر اُدھر دیکھ کر۔ جب پی چکا تو بولی "اور کیا چاہیئے؟" جب میں خاموش رہا تو بولی "آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" "میں ناراض کیوں ہونے لگا؟ . . . تجھ سے کبھی بات ہی نہیں کی" "پانی جو مانگا ہے"۔ . . . "یہ کیا، پیاس لگ رہی ہو گی" میں نے کہا "نہیں، سچ مانو، پیاس نہیں تھی تم سے بات کرنے کا بہانہ تھا" . . . . "اچھا؟ . . . . . تو کبھی کبھی ایسے بہانے بنا لیا کرو"۔ "میں تو یہی چاہتا ہوں"۔ وہ بولی "میری اتنی قسمت کہاں جو آپ مجھ سے ہر روز باتیں کریں"۔ "نہیں نہیں، میرا تو، ایمان کی بات ہے تم سے باتیں کرنے کو بہت دل چاہتا ہے"۔ . . . "میرا تم سے بھی زیادہ" . . . . . اس ڈیوڑھی کی باتوں سے پہلے . . . . ہاں پہلے بھی باتیں تو نہیں اُسے دیکھا ضرور کرتا تھا۔ . . . . . . وہ مجھے، میں اُسے . . . . جب پہلے پہل وہ ہمارے گاؤں میں آئے تھے تو میں نے اُسے کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ یہیں کھیلتی پھرا کرتی تھی۔ . . . . . . "ڈیوڑھی کی باتوں سے پہلے . . . . . . ہاں ہاں ایک دفعہ میں اُن کے گھر کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ایک جاٹ پٹواری سے ملنے آیا۔ مجھے کہنے لگا "بلا دو۔" میں دروازے میں ہی تھا کہ صغرا باہر نکلی۔ میں نے کہا "پٹواری صاحب اندر ہیں؟" . . . . . . "جی نہیں۔ نمبردار کے ہاں ہوں گے"۔ . . . . جی نہیں۔ جی . . . . جی کتنا پیارا لفظ ہے؟ . . . . . . "جی نہیں، نمبردار کے گھر ہوں گے۔ کیا کام ہے؟" ایک آدمی ملنے آیا

تھا۔“ ۔ ۔ ۔ میں مڑا۔ ایک دو قدم چل کر جانے کیوں میں نے اچانک پیچھے مڑ کر دیکھا۔ ۔ ۔ ۔ صغرا میری طرف ٹکٹکی باندھے وہیں کھڑی تھی۔ مجھے کچھ خوشی سی محسوس ہوئی۔ ۔ ۔ ۔ میں چلا آیا۔ کنوئیں کے پاس آکر پھر دیکھا تو وہیں تھی۔ ۔ ۔ ۔ اس بات کو تو سال سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا ہوگا۔ آٹھ نو مہینے تو میلے کو ہو گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (کروٹ بدلتا ہے) ۔ ۔ ۔ دل کھول کر باتیں تو ہم نے اس دن کیں جب پٹواری تحصیل کو گیا ہوا تھا۔ بھری دوپہر میں بھلا کون باہر پھرتا ہے۔ لوگ سو رہے تھے۔ ۔ ۔ ۔ اس کی ماں بھی سو رہی ہوگی۔ میں سکول سے آیا تو ڈیوڑھی میں بیٹھی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ”میں تم پر قربان جاؤں۔“ میں نے کہا۔ میں تمہارا غلام ہوں۔ اس نے کہا جی چاہتا ہے۔ ہر وقت اکٹھے بیٹھے رہیں۔ میں نے اُسے انگوٹھی دی۔ اس نے مجھے (قمیص کی اندرونی جیب میں سے رومال نکال کر اُسے چومتا ہے) ۔ ۔ میں نے کہا۔ اب ہم زندگی بھر ایک دوسرے کو نہیں بھلائیں گے۔ ہر وقت ایک دوسرے کو یاد رکھیں گے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایمان کی بات ہے میں اسے کبھی نہیں بھولا۔ ہر وقت یاد رکھتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ چاندنی راتوں کی ملاقاتیں۔ ۔ ۔ ۔ وہ سہیلیوں کے ساتھ کھیلتی اور گاتی۔ ۔ ۔ ۔ دوراں اور عمری بھی مجھے غور سے دیکھا کرتی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ میں پاس سے گزرتا۔ ۔ ۔ صغرا ایک دن مجھے آتا دیکھ کر ذرا سڑک کی جانب آئی میں نے بالکل پاس سے گزرتے وقت پھولوں کا ہار اس انداز سے پھینکا کہ عین اس کے گلے میں پڑا۔ ۔ ۔ ۔ جیسے دیر سے پہن رکھا ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ موتیے کے پھولوں کی کیسی بھینی بھینی خوشبو ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ آج کل تو موتیا کہیں ملتا ہی نہیں۔ البتہ گیندا بہت ہوتا ہے گیندے کے پھول خوبصورت بہت ہوتے ہیں۔ ہمارے سکول میں کس کثرت سے اُگے ہوئے ہیں جب انسپکٹر آیا تھا تو اس کے گلے میں کتنے ہی ہار پہنا کر فوٹو لیا گیا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ میں بھی ضرور اپنا فوٹو کھچواؤنگا اور ایک فوٹو صغرا کو دوں گا۔ وہ بہت خوش ہوگی۔ مگر اُسے تاکید کر دوں گا کہ اسے خوب حفاظت سے چھپا کر رکھے۔ ۔ ۔ ۔ کسی کو اس کی خبر نہ ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ فوٹو کہاں سے کھچوائیں کبھی شہر جائیں تو وہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (کروٹ بدلتا ہے) ۔ ۔ ۔ میلے پر بھی ایک فوٹو کھینچنے والا آیا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میلہ کونسا دور ہے۔ اڑھائی تین مہینے رہ گئے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سال شاید میلے پر مال مویشی کی منڈی بھی لگے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ابا سے کہیں گے کہ ایک بھینس خرید دیں گائے کا دودھ کیا ہوتا ہے؟ پتلا جیسے پانی ۔ ۔ ۔ پانی جیسا پتلا کچی لسی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بھینس اچھی ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ گاتے ۔ ۔ ۔ لسی ۔ ۔ ۔ (سو جاتا ہے)

محمد صادق قریشی

ایک نظم اور ایک غزل

طلوعِ سحر

جلوے نے صبح نیند سے مجھ کو جگا دیا ۔۔۔ میں بھی سحر کے ساتھ ذرا مسکرا دیا

رگ رگ میں ایک کیف کی بجلی چمک اُٹھی ۔۔۔ کس نے حریمِ ناز کا پردہ اُٹھا دیا؟

پارس سے کم نہیں ہے کرن آفتاب کی ۔۔۔ ہر ایک شے کو جس نے طلائی بنا دیا

ہر رنگ کی شراب سے بھر کر صراحیاں ۔۔۔ پیرِ مغاں نے طاقِ اُفق کو سجا دیا

نیلم کا ایک جام ہے اوندھا گیا ہُوا ۔۔۔ یاقوت کا ہے جس کو کنارا لگا دیا

رتبے میں بڑھ گیا ہوں میں رندِ ازل سے بھی
خود شاہدِ قدیم نے ساغر پلا دیا۔

غزل

کوئی میرے دل کا اُس دلبر سے افسانہ سُنے، ۔۔۔ یا زبانِ شمع سے احوالِ پروانہ سُنے

رہن اک ساغر میں رکھی ہے قبا ساقی کے پاس ۔۔۔ کھُل گیا مستوں کا پردہ سارا میخانہ سُنے

یوں نگاہوں ہی نگاہوں میں بہم ہو گفتگو ۔۔۔ میں سنوں اور تو سنے، کوئی نہ بیگانہ سُنے

نغمۂ عشرت سے ہے گونجی ہوئی ساری فضا ۔۔۔ کون اُس کوچے میں آوازِ فقیرانہ سُنے؛

اب خدا شاہد ہے کوئی رازداں ملتا نہیں،
مجھ سے دیوانے کی باتیں کون دیوانہ سُنے!

مسعود شاہد

تین قطعے

جوانی کا راز

دُور تک پھیلے ہوئے تاریک سایوں کے تلے
دفن ہے میری جوانی کا وہی رازِ حسیں،
جس کی تُم نے اپنے گیتوں سے کبھی تخلیق کی
اور اب تم جس کے مرقد پر بھی آ سکتیں نہیں

سہمی ہوئی چاندنی

دامنِ موجِ ہوا میں سو رہی ہیں نکہتیں
ہر طرف بکھری ہوئی ہیں نور کی آبادیاں
چاندنی کے جسم پر طاری ہیں کیسی لرزشیں
دستِ فطرت تو نہیں کرتا کہیں گستاخیاں؟

ایّامِ ہجر

اُنگلیاں جیسے مغنّی کی رُکیں مضراب پر
ہو کے تازہ دم نئے نغمے لُٹانے کے لئے
ہجر کے لمحات بھی بالکل یونہی اے ہمنشیں!
جا کے آجاتے ہیں پھر واپس نہ جانے کے لئے

تابش صدّیقی

امتیازِ ہند و فرنگ

خودی ہے میری ہمیشہ کی طرح شوخ و شنگ بدل سکا نہ کوئی انقلاب اس کا رنگ
زمانہ مجھ سے ہے بے سود آج برسرِ جنگ کب اس کے زور سے دبتی ہے میرے دل کی اُمنگ

اُبھر رہا ہوں، اُبھرنا مرا یقینی ہے
خودی سکھاتی ہے خود ہی ترقیوں کا ڈھنگ
جسے نصیب خودی ہے نہ دو زینی ہے
شعور اُس کا حوادث کی زد سے ہے دلتنگ

مئے خودی کا بدل جس کے واسطے ہے بھنگ دکھائے خاک وہ افسردہ حال اپنی ترنگ؟
مئے خودی سے ہوں بے شبہ میں تو متوالا قسم خدا کی خودی دوست ہے خدا والا
مقدّرات نے بے خود جسے بنا ڈالا، ہے اُس کے عزم کی دنیا سدا تہ و بالا

تُلا ہوا ہے عزیمت فروشیوں پہ جو آج!
وہ شخص خود بھی اپاہج ہے اُس کا عذر بھی لنگ
خدا کے فضل سے ہر سُو ہے اب خودی کا راج
خدارسی ہے نشاطِ خودی سے ہم آہنگ

خود اعتماد ہیں خوش دل بغیر بادہ و چنگ! یہ خوش دلی بخدا ہے طفیلِ نام و ننگ!
جو بے خودی کے اثر سے بشر مبرّا ہے چمک دکھانے پہ آمادہ ذرّہ ذرّہ ہے
خودی کے نور سے اب کس کا دل معرّا ہے؟ سفید رنگ پہ کیا اب کسی کو غرّا ہے

حیات کی ہے وہ رَو ہو کہیں کا بھی پانی
خوش اس کی لہر سے ہیں اہلِ دانش و فرہنگ
شراب اس کو سمجھ کر ہوئی پشیمانی!
وہی ہے ٹیمس کا پانی وہی ہے آبِ گنگ

نہ ہونے دے گی مساوات پر خودی اب دنگ کہ اُٹھ چکا ہے قدیم امتیازِ ہند و فرنگ

علی منظور

سیف ڈیپازٹ
آپ کو آنے والے نہ معلوم خطرات سے بچائے گا !
SAFE DEPOSIT
Protects you against
EARTH QUAKE
FLOOD
FIRE
BURGLARY
ROITS
AIR RAIDS
AND
HUNDREDS OF OTHER
UNFORESEEN RISKS.
ٹیلیفون نمبر ۲۱۳۲
لاہور سیف ڈیپازٹ ہر قسم کی قیمتی اشیاء روپیہ۔ جواہرات۔ کاغذات۔
کفالتیں۔ ایجادات۔ ریکارڈس۔ اگریمنٹ۔ ٹھیکہ جات۔ بانڈز وغیرہ کو ہر ایسے خطرات سے
جن سے ان کو نقصان پہنچنے یا تباہ ہونے یا گم ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ بچاتا ہے کیونکہ اس کی بنیاد وساخت میں کنکریٹ سیمنٹ
کے ساتھ لوہا کافی مقدار میں استعمال کیا گیا ہے۔ لاہور سیف ڈیپازٹ وولٹ ہر قسم کے حملوں مثلاً آگ۔ چوری۔ زلزلہ۔ لوٹ مار۔ ہوائی
حملے اور جنگ سے بچانے میں لاثانی ہے۔
شرح کرایہ
دس روپے سالانہ فی لاکر (بکس) ـــــــ آپ اشیاء کو ہر وقت بغیر کسی زائد اخراجات کے نکال یا رکھ سکتے ہیں
چیئرمین :۔ آنریبل رائے بہادر لالہ رام سرنداس سی آئی ای ممبر کونسل آف سٹیٹ
تشریف لا کر ملاحظہ کیجئے۔ ہم بڑی خوشی سے آپ کو اپنے وولٹ کا ملاحظہ کرائیں گے۔
the LAHORE SAFE DEPOSIT Co. Ltd.
لاہور سیف ڈیپازٹ کمپنی لمیٹڈ (بالمقابل سنٹرل ٹیلیگراف آفس میکلوڈ روڈ) ـــ لاہور

خضر مرزا صاحب سے میری ملاقات

گزشتہ سال موسم گرما کی تعطیلات میں غالب کی شاعری اور سوانح زندگی کے بعض پہلوؤں کی تفتیش کی غرض سے مجھے ہندوستان کے چند بڑے شہروں کے سفر کا اتفاق ہوا۔ واپسی پر صلاح الدین احمد صاحب کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ اس سفر کے حالات "ادبی دنیا" کے سالنامے کے لئے قلم بند کروں۔ مجھے اس میں کچھ تامل تھا کہ آیا ان حالات کا بیان کرنا عام دل چسپی کا موجب ہوگا یا نہیں۔ اسی گومگو نے مجھے گذشتہ سالنامے کے لئے کچھ لکھنے سے محروم رکھا۔ اس مرتبہ ایڈیٹر صاحب نے مکرر فرمائش کی تو مجھ پر اُن کے ارشاد کی تعمیل لازم ہوئی لیکن اس کے ساتھ یہ بات بھی میرے ذہن میں آئی کہ اپنی دو مہینے کی ہندوستان نوردی کی تمام تفصیلات کو ایک ہی مضمون میں جمع کرنا غیر موزوں بلکہ ناممکن ہوگا۔ اس لحاظ سے مطبوعہ ذیل مضمون میں اپنے سفر کی پہلی منزل' دہلی کے فقط ایک واقعے کے بیان پر اکتفا کیا ہے۔ یہ واقعہ جن بزرگ کے ساتھ میری ملاقات پر مشتمل ہے اُن کی ذاتِ گرامی اور اُن کا خاندان دونوں ہماری قدیم تہذیب اور دہلی کی پرانی شرافت کی یادگاروں میں سے ہیں۔ اسی بنا پر میں شخصیات کے اس تذکرے کو "ادبی دنیا" کے ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

اس مضمون کا آغاز لازماً میرے دوست شیخ محمد امین صاحب (لائبریرین اسلامیہ کالج) کے ذکر سے ہونا چاہیئے۔ مغلیہ تمدن کے آخری دَور کے مطالعے میں شیخ صاحب میرے پُرانے رفیق اور مددگار ہیں۔ شاید دو برس کا عرصہ ہوا، اُنہوں نے مجھ سے ایک مرتبہ باتوں باتوں میں کہا "دلّی میں ایک بڑے سن رسیدہ نواب صاحب ہیں، کوئی نوّے برس کی عمر ہوگی، میں دلّی جاتا ہوں تو اُن کی خدمت میں ضرور حاضر ہوتا ہوں۔ ایک دن گفتگو میں اُن سے سنا تھا کہ وہ غالب کے خاندان سے ہیں۔ آپ اُن سے جا کر ضرور ملیں۔ عجب نہیں غالب کے متعلق کوئی نئی بات ہاتھ آئے۔" شیخ صاحب کو یہ یاد نہیں تھا کہ غالب کے خاندان سے نواب صاحب کا کیا رشتہ ہے۔ اِدھر مجھے بھی اپنی قسمت سے اتنا حسنِ ظن نہ تھا کہ غالب کے متعلقین میں سے کسی ایسے شخص تک اپنی رسائی ممکن سمجھتا جس نے غالب کو اپنی آنکھوں دیکھا ہو۔ اس لئے مجھے اعتراف ہے کہ شیخ صاحب کی اس روایت کو میں نے شبے کے اُسی موہوم احساس کے ساتھ سنا جس سے ہم اس اخباری عہد کی ہر دلچسپ خبر کو سننے کے عادی ہوگئے ہیں۔ تاہم جولائی ۱۹۳۶ء میں جب میں دہلی پہنچا تو سب سے پہلے میں نے اُس تعارفی رقعے سے کام لیا جسے شیخ محمد امین صاحب نے میرے لئے نواب صاحب کی خدمت میں پہنچنے کا ذریعہ بنایا تھا۔ اس رقعے نے پہلے مجھے شیخ سردار علی صاحب سینٹ سٹیونز سکول اور پھر محمد اکرم صاحب دہلوی سے متعارف کیا۔ ان دونوں صاحبوں کے خلق و مہربانی سے مجھے دہلی میں کئی لحاظ سے بڑی مدد ملی۔ میں لاہور سے سن آیا تھا اور اُنہوں نے بھی مجھے یہی بتایا کہ خضر مرزا صاحب زیادہ تر دہلی سے باہر مہرولی میں قیام کرتے ہیں۔ اس لئے اُن سے ملنے کو ہمیں کسی دن وہیں چلنا ہوگا۔ خضر مرزا نواب صاحب کا نام ہے اور دہلی پہنچتے ہی میں نے بھی اپنے آپ کو اُن کے مقربین میں شمار کرکے اُن کا ذکر اسی نام سے کرنا شروع کر دیا۔

وسط جولائی کی ایک دوپہر کو میں سردار علی صاحب اور اکرم صاحب کے ساتھ مہرولی کو روانہ ہوا۔ ایسے وقت میں روانہ ہونے سے ہماری غرض یہ تھی کہ جب تک خضر مرزا صاحب قیلولہ کے بعد ظہر کی نماز کے لئے اُٹھیں ہم مہرولی پہنچ جائیں۔ مہرولی دہلی کے مضافات میں قطب سے متصل ایک قصبہ ہے۔ آبادی کسی صورت دو چار ہزار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ بادشاہی عہد میں یہاں برسات کے دنوں میں بڑی رونق رہتی تھی۔ خود بادشاہ لال قلعے کو چھوڑ کر دو مہینے کے لئے مہرولی چلے آتے تھے اور اُن کے ساتھ دہلی کے شرفا اور عوام کی ایک خاصی تعداد برسات کا لطف اُٹھانے کے لئے یہیں منتقل ہو جاتی۔ اب بھی برسات کے زمانے میں لوگ آتے ہیں لیکن اکثر پرانے مکانات کا اُجڑا اُجڑا نقشہ اور شمسی تالاب کی ویرانی کا عالم ماضی و حال کا فرق صاف بتا رہا ہے۔ دہلی میں اجمیری دروازے کے باہر قطب اور مہرولی جانے والی لاریوں اور تانگوں کا اڈا ہے۔ ہم نے آدھ گھنٹے کا یہ سفر لاری میں طے کیا۔ ڈیڑھ بجے لاری والے نے ہمیں مہرولی کے مینا بازار میں لا اُتارا مینا بازار مہرولی کا ایک ہی بازار ہے۔ اس میں سے گزرتے ہوئے ہم ایک

بڑی عمارت تک پہنچے جس کے ایک حصے میں خضر مرزا صاحب بطور کرایہ دار رہتے تھے۔ اُن کے حصے کا ایک دروازہ عمارت کی بڑی ڈیوڑھی کی طرف کھلا تھا ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو اس دروازے کے سامنے ایک شریف صورت پیر مرد پلنگ پر محوِ استراحت نظر آئے۔ گلے میں کُرتا نہیں تھا۔ صرف ایک تہمد بندھا ہوا تھا ہم مکان میں داخل ہوتے اور بڑی خاموشی سے جا کر دالان میں بیٹھ گئے۔ تاکہ وہ ہمارے شور سے بیدار نہ ہوں۔ ان کے ملازم عبداللہ سے دو ایک باتیں کیں (بعد میں مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا کہ عبداللہ ملازم سے ان کا سلوک نوکروں کا سا نہیں بلکہ اپنے بچوں کا سا ہے) میں نے یہاں بیٹھے بیٹھے مکان کی عام ہیئت کا جائزہ لیا۔ وہی طرز تھی جو دہلی کے مکانات میں عام طور پر (اور لاہور میں بہت کم) ملتی ہے۔ ہمارے سامنے صاف ستھرا کشادہ صحن تھا جس کے ایک طرف باورچی خانہ اور غسل خانہ نظر آرہا تھا۔ پھر دالان اور اس کے بعد دالان در دالان اور دونوں کی بغل میں کوٹھڑیاں۔ انہیں میں سے ایک میں خضر مرزا صاحب اس وقت سو رہے تھے۔ دالان سے متصل صحن میں ایک طرف نماز کے لئے تخت لگا تھا۔ لوٹا اور چلمچی، جانماز اور تسبیح ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر موجود تھی جس دالان میں ہم بیٹھے تھے۔ اس میں چاندنی کا اُجلا فرش تھا۔ طاقوں میں حسبِ دستورِ قدیم بڑے یا چھوٹے آئینے بطور آرائش لگے ہوئے تھے اور ان کے سامنے جابجا چینی اور بلور کے برتن قرینے سے سجے تھے۔

ہمیں یہاں بیٹھے کوئی آدھ گھنٹہ ہوا ہوگا کہ ڈاکیا ڈیوڑھی کی طرف آیا اور بے تکلف "نواب صاحب! نواب صاحب!" کہہ کر آوازیں دینے لگا۔ وہ ایک خط دینے آیا تھا جو بعد میں ہم نے خضر مرزا صاحب کے ہاتھ میں دیکھا۔ بہرحال ڈاکئے کی ہاؤ ہُو سے وہ بیدار ہو چکے تھے، ملازم نے ہمارے آنے کی اطلاع کی، اور انہوں نے ہمیں فوراً بلا لیا۔ وہ بدستور پلنگ پر بیٹھے رہے۔ ہم تینوں سامنے فرش پر بیٹھ گئے۔

ابتدائی مزاج پُرسی کے بعد میرے دونوں دوستوں نے میرا تعارف کرایا اور میرے حاضر ہونے کا مقصد بیان کیا۔ اس سلسلے میں جوں ہی غالب کا نام لیا گیا۔ خضر مرزا صاحب نے فرمایا "ہاں، میرے دادا تھے"۔ ظاہر ہے کہ صرف یہ تشریح میرے لئے کافی نہ تھی۔ اس لئے میں نے کچھ مزید تفصیل کے لئے اُن کی خدمت میں درخواست کی۔ معلوم ہوا کہ مرزا غالب کی بیگم صاحبہ کی حقیقی بہن بنیادی بیگم خضر مرزا کی دادی تھیں۔ مرزا زین العابدین خاں عارف جن سے غالب کو حد درجہ اُنس تھا۔ انہیں بنیادی بیگم کے فرزند اور خضر مرزا کے حقیقی تایا تھے۔ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ عارف کے علاوہ بھی بنیادی بیگم کے کوئی بیٹے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ عارف کے ایک حقیقی چھوٹے بھائی تھے جن کا نام مرزا حیدر حسن خاں تھا۔ خضر صاحب اُنہی حیدر حسن خاں کے بیٹے ہیں۔ عارف جان اور قاسم جان کی اولاد کا ملا جُلا شجرۂ نسب اگر سامنے رکھ لیا جائے تو یہ تمام کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ ذیل میں صرف اُن اشخاص کے نسب کی توضیح کی گئی ہے۔ جن کا اس مضمون سے براہِ راست تعلق ہے۔

خواجہ محمد امین

عارف جان — قاسم جان

نواب احمد بخش خاں — مرزا الٰہی بخش خاں معروف — فیض اللہ بیگ خاں جاگیردار پرگنہ ہتین (شرف الدولہ)

امراؤ بیگم = مرزا اسداللہ خاں غالب — بنیادی بیگم = غلام حسین خاں مسرور (سہراب جنگ)

شمس الدین — امین الدین — ضیاء الدین (نیر رخشاں) — ماہ رخ بیگم = مرزا حیدر حسن خاں — مرزا زین العابدین خاں عارف

مرزا محمد حسن خاں عرف خضر مرزا — مرزا محمد حسین خاں (لاولد)

(جن سے میری ملاقات کی کیفیت اس مضمون میں بیان ہوئی ہے)

شاکر حسین خاں (بیرسٹر ایٹ لا) — ریاض حسین خاں (رسالدار)

سعیدالدین احمد خاں طالب — معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم (بقید حیات ہیں) = باقر علی خاں — حسین علی خاں (لاولد)

دختر — دختر

خضر مرزا صاحب نے اپنے متعلق فرمایا کہ "میری پیدائش ۱۸۵۲ء کی ہے" لیکن ساتھ ہی یہ کہا کہ "سعیدالدین احمد خاں بھی اسی سال پیدا ہوئے۔ وہ مجھ سے چھ دن بعد پیدا ہوئے تھے"۔ اس پر میں نے عرض

کیا کہ سعید الدین احمد خاں کا سال پیدائش غالباً ۱۸۵۳ء ہے۔ فرمایا۔ "پھر میرا بھی وہی ہوگا"۔ اگر ۱۸۵۳ء کو خضر صاحب کی پیدائش کا صحیح سال تسلیم کر لیا جائے تو اس وقت اُن کی عمر چھیاسی ستاسی[1] برس کی ہونی چاہیے اور قیافے سے بھی اتنی ہی معلوم ہوتی ہے۔ اس حساب سے غالب کی وفات کے وقت ان کا سن سولہ برس کے لگ بھگ ہوگا۔ گزشتہ سال جب میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس بڑھاپے کے باوجود ان کے ہوش وحواس بالکل درست اور برقرار تھے۔ حافظہ اب تک جوانوں کے حافظے کی طرح کام دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ زندگی کے ساتھ ان کی دلچسپی اب بھی پورے جوش سے قائم ہے۔ تصوّف کے حقائق ہوں یا دنیاداری کے لطائف، وہ ہر چیز سے حظِ وافی اُٹھا سکتے ہیں اور اُٹھاتے ہیں۔ ظرافت کا احساس ابھی تک ویسا ہی تیز ہے۔ اسی لئے بوڑھے اور جوان سبھی اُن کی گفتگو سے یکساں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اتوار کے اتوار اُن کے مہرولی کے مکان میں دوستوں اور عقیدت مندوں کا اچھا خاصا جمگھٹا لگ جاتا ہے اور یہ ہفتہ وار مجلس اُن کی زندگی کے لوازم میں سے ہے۔ اُن کی گفتگو بالعموم طریقت کے نکات اور اولیا و مشائخ کی کرامات کے متعلق ہوتی ہے۔ لیکن میری درخواست پر جب غالب کا تذکرہ چلا تو غالب کے دور کے چشم دید واقعات بیان کرتے ہوئے اُن کے مُنہ سے ایسی پھلجھڑیاں چھوٹیں کہ وہ خود بھی محظوظ ہوئے اور مجھے بھی لطف آگیا۔ یہ واقعات اُنہوں نے مجھے پرانی بے جان روایتوں کی طرح نہیں سنائے۔ بلکہ ہر قول کو دہراتے ہوئے اپنے لب و لہجے میں موقع محل کے لحاظ سے مناسبت پیدا کرکے گویا مردہ روایات کو زندہ کر دیا۔ کاش ان چھپے ہوئے حرفوں میں ان کی آواز کا زیر و بم بھرا جاسکتا اور میں اس نقل کے مطابقِ اصل ہونے کا دعویٰ کرسکتا۔

مرزا خضر صاحب کا اصلی نام مرزا محمد حسن خاں ہے۔ لیکن جیسا کبھی کبھی ہوتا ہے یہ اپنے بھائی مرزا محمد حسین خاں کے نام پر مشہور ہوگئے یہاں تک کہ ۱۸۷۶ء میں جب یہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوئے تو سرکار میں اُن کا بھی نام (مرزا محمد حسین خاں) درج ہوا۔ اس صدی کے آغاز میں تحصیلداری کے عہدے سے وظیفہ یاب ہوکر سبکدوش ہوئے۔ اب عرصے سے یادِ خدا میں مصروف ہیں اور ذکر و فکر ہی زندگی کا مشغلہ ہے۔ بچپن سے ان کا عرف خضر مرزا لوگوں کی زبان پر چڑھا ہوا ہے۔ اور عرف اصل نام سے کہیں زیادہ مشہور ہے۔ یہ عرف دراصل ان کی پیدائش کے دن سے ان کے ساتھ ہے۔ ان کی والدہ ماجدہ نے ان کو بڑی منتیں مان کر پایا اور ان کی زندگی کے لئے ایک خدا رسیدہ بزرگ سے دعائیں کرائیں۔ ان بزرگ نے اس نومولود کو ہاتھ میں لے کر کہا کہ "یہ بچہ بڑی لمبی عمر پائے گا۔ اس کو خضر سمجھو، خضر"۔ اُس دن سے اس بزرگ کا دیا ہوا خطاب مقبولِ خاص و عام ہوا اور اب سرکاری کاغذات کے سوا ہر جگہ اسی سے معروف ہیں۔ مجھ سے ہنس کر فرماتے تھے کہ "لڑکپن میں مرزا غالب میرے کان پکڑ لیتے تھے اور ساتھ ہی ساتھ لَے سے کہتے جاتے تھے۔ "خضر خاں کی گُمٹی! خضر خاں کی گُمٹی!" اور کبھی کان ہلا ہلا کر یہ بھی "خضری جوان، تیرے لمبے لمبے کان! خضری جوان، تیرے لمبے لمبے کان" مرزا خضر خاں کے تایازاد بھائیوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو تو مرزا غالب نے اپنے بیٹے بنا لیا تھا اور خضر صاحب کی روایت ہے کہ وہ بھی غالب کو ابّا کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے ساتھ مرزا کا دلی تعلق محتاجِ تشریح نہیں لیکن خضر صاحب کے کانوں پر مرزا کی جو عنایات تھیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی اُن کی محبت آمیز توجہ اور بزرگانہ شفقت سے محروم نہ تھے۔ چنانچہ خضر صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ "گلشنِ عشق میں نے اور سعید الدین احمد خاں نے مرزا صاحب ہی سے پڑھی۔ خوب سمجھا کر پڑھاتے تھے اور ساتھ ہی مصدر وغیرہ اچھی طرح کھول کر بتاتے جاتے تھے"۔

خضر صاحب نے اپنے اور حسین علی خاں کے متعلق ایک چھوٹا سا لطیفہ مجھے سنایا۔ فرمایا "ایک دن میں چلا جاتا تھا۔ بھائی حسین علی خاں بھی گلی میں سے جا رہے تھے۔ مرزا صاحب نے ہمیں دیکھا اور آواز دی۔ "ابے لمڈو۔ یہاں آؤ"۔ ہم پہنچے تو مرزا صاحب نے ہمارے لئے مُٹھی بھر بادام طشتری میں ڈال دیئے۔ میں نے ہاتھ بڑھایا تو مرزا صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "ابے یہ کیا! مُنہ سے کھاؤ۔ میرے مرغی کے بچّے یوں ہی چگا کرتے ہیں"۔ اس آخری فقرے پر خضر صاحب بے اختیار ہنسے اور

---

[1] خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی کی عمر خضر مرزا صاحب سے کچھ کم ہی ہوگی لیکن اگست ۳۸ء میں جب میں لکھنؤ میں اُن سے ملا تو ان سے گفتگو کرنے اور اُن کی بات سمجھنے میں مجھے بہت دقت پیش آئی۔

اسے دُہرا کر بار بار ہنستے رہے۔

لوہارو کے خاندان سے مرزا غالب کو دوستی اور دشمنی کا جو تعلق تھا اس سے اب ایک دنیا واقف ہے۔ لوہارو کے پہلے رئیس نواب احمد بخش خاں کے متعلق خضر صاحب نے بعض واقعات سنائے۔

"احمد بخش خاں نواب بننے سے پہلے مہاراجہ الور کے وکیل تھے۔ خوش عقیدہ آدمی تھے اور خاص طور پر مولانا فخرؔ صاحب سے انہیں بہت ارادت تھی۔ ایک رات احمد بخش خاں مولانا فخرؔ صاحب کی خدمت میں حاضر تھے اور (عقیدت مندی کی راہ سے) ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ رات زیادہ گذر گئی تو مولانا نے فرمایا "جاؤ نواب! اب آرام کرو"۔ اس پر احمد بخش خاں نے عرض کی" حضرت نواب تو یہاں کوئی نہیں ہے، یہی خاکسار حاضر ہے"۔ مولانا نے فرمایا" ہاں تمہیں سے کہتا ہوں، تمہیں نواب ہو" اس کے بعد احمد بخش خاں گھر چلے آئے۔ اُس وقت تک اُنہیں یہ معلوم نہ تھا کہ فیروز پور جھرکا اور لوہارو کی نوابی ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے۔ زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا کہ انگریزوں کو بھرت پور کا معرکہ پڑا۔ احمد بخش خاں بھی انگریزی فوج کے ساتھ تھے۔ فوج کا جرنیل گورنر جنرل کا داماد تھا۔ اتفاق کی بات کہ ایک گولا انگریز جرنیل کے آن کر لگا۔ اور وہ زخمی ہو کر گر پڑا۔ نواب احمد بخش خاں یہ ماجرا دیکھ رہے تھے۔ لپک کر بڑھے اور جرنیل کو اپنے گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ دشمنوں کے نرغے میں سے بچا لے گئے۔ ظاہر ہے کہ جرنیل اُن کی اس بروقت امداد سے بہت شکر گزار ہوا۔ اُس نے احمد بخش خاں کو گورنر جنرل کے نام ایک چٹھی لکھ دی جس میں اُن کی کارگزاری کا پورا قصہ بیان کر کے ان کی بہت تعریف کی۔ پھر یہ چٹھی احمد بخش خاں کو دے کر کہا کہ جب گورنر جنرل آکر دربار کریں تو یہ چٹھی ان کی خدمت میں پیش کرنا۔ الغرض جب گورنر جنرل کا دربار ہوا تو احمد بخش خاں انگریز جرنیل کی چٹھی لے کر پہنچے۔ گورنر جنرل نے اپنی خوشنودی کے اظہار کے لئے اُسی وقت فیروز پور جھرکا کا علاقہ انہیں عطا فرمایا۔ اس پر مہاراجہ الور اُٹھے اور اُنہوں نے کہا۔ لوہارو کا پرگنہ میری طرف سے اس پر اضافہ سمجھو۔ اس طرح احمد بخش خاں لوہارو اور فیروز پور کے نواب بنے۔

" نواب احمد بخش خاں کے بھائی مرزا الٰہی بخش خاں جن کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے بعد میں مرزا غالب کی شادی ہوئی۔ اُن کی ایک الگ داستان ہے۔ وہ بڑے عیش پسند خوش پوش اور خوش باش تھے۔ اسی وجہ سے "شہزادۂ گلفام" کہلاتے تھے۔ ایک دفعہ جب جاڑا شروع ہوا تو ان کے لئے نئی رضائی بن کر آئی۔ دُھنیئے کی غفلت سے کہیں ایک بنولا روئی میں اٹکا رہ گیا۔ الٰہی بخش خاں رات کو رضائی اوڑھ کر سوئے مگر اُف رے نازک مزاجی کہ اُنہیں نیند نہ آئی پر نہ آئی وہ ایک بنولا رات بھر کھٹکتا رہا۔ صبح اُٹھ کر داروغہ پر بگڑے، نوکر کو پیٹا اور کیا کچھ تھا جو نہ کیا۔ لیکن اس ایک ٹھ قصے نے اُن کی زندگی پلٹ دی جس طرح مولانا فخرؔ نے اُن کے بھائی کو دنیوی وجاہت کی نوید سنائی تھی اسی طرح اُن کو بھی ملک فقر کی ریاست بخش دی۔ ابتدا میں الٰہی بخش خاں پیروں فقیروں سے کوئی میل جول نہیں رکھتے تھے۔ اس لحاظ سے دونوں بھائیوں کی طبیعت میں بڑا فرق تھا۔ احمد بخش خاں جس قدر خوش اعتقاد تھے۔ اُسی قدر الٰہی بخش خاں کو مشائخ کی صحبت سے گریز تھا۔ احمد بخش خاں انہیں بار ہا مولانا کی خدمت میں حاضر ہونے کی ترغیب دیتے لیکن الٰہی بخش خاں ہر بار انکار کرتے یا ہنسی میں ٹال دیتے۔ مولانا فخرؔ کے مرید اکثر بطور نذر و نیاز لڈو ساتھ لاتے اور مولانا کی خدمت میں پیش کرتے۔ مولانا ان لڈوؤں کو حاضرین مجلس میں تقسیم کر دیتے۔ کبھی کبھی احمد بخش خاں یہ لڈو لے کر گھر پہنچتے تو الٰہی بخش خاں ہنستے اور کہتے ناں صاحب! یہ لڈو پیڑے آپ ہی کو مبارک رہیں۔ یا تو یہ حالت تھی اور یا خدا جانے کیا دھیان آیا کہ ایک جمعے کو اپنے بھائی کے ساتھ مولانا فخرؔ صاحب کے حضور میں جا پہنچے۔ مولانا ان کو دیکھ کر احمد بخش خاں سے مخاطب ہوئے کہ اس درویش کو یہاں کیوں لے آئے؟ یہ تو درویش ہے درویش! خدا جانے ان لفظوں میں کیا تاثیر تھی کہ الٰہی بخش خاں پر ایک کیفیت طاری ہو گئی۔ زار و قطار رونے لگے۔ حضرت سے بیعت کی درخواست کی جو منظور ہوئی اور اُسی وقت حلقے میں شامل ہوئے۔ اب مولانا نے

ا؎ مولانا فخر الدین شاہجہان آبادی سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مشائخ متاخرین میں سے تھے۔ ان کا زمانہ ۱۱۲۶ھ سے ۱۱۹۹ھ کا ہے۔ "خزینۃ الاصفیا" میں ان کے بہت سے مناقب اور کراماتیں نقل کی گئی ہیں۔ مرزا الٰہی بخش خاں معروفؔ کو ان سے جو عقیدت تھی اس کے متعلق "دیوانِ معروف" میں جو مرزا نصر اللہ خاں صاحب نے طبع کرایا ہے مختلف جگہ اشارے ملتے ہیں۔ ایک غزل کا مطلع ہے ؎

قبلہ و کعبۂ صاحب نظراں فخر الدین　　فخرِ دیں، فخرِ زمیں، فخرِ زماں فخر الدین

مسکرا کر اپنے ایک مرید کو اشارہ کیا اور فرمایا "ہاں تو بھئی وہ لڈو پیڑے
ان کے لئے بھی لاؤ ناں!" یہاں سے رخصت ہو کر گھر آئے مگر واپس
آتے ہی سچ مچ کے درویش بن گئے۔ عیش عشرت کا سب سامان
فقیروں مسکینوں میں لٹا دیا۔ ماں نے بہتیری منتیں سماجتیں کیں
مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ کمبل کندھے پر ڈالا اور حضرت نظام الدین
اولیاء کی درگاہ میں ایک حجرہ سنبھال کر بیٹھ گئے۔ اسی درویشی کے
عالم میں انہوں نے باقی زندگی گزار دی۔"

جن لوگوں نے غالب کی پنشن کے جھگڑے کا مطالعہ کیا ہے
ان کو معلوم ہے کہ نواب احمد بخش خاں اور ان کے بڑے بیٹے شمس الدین خاں
کے ساتھ اپنے چچا کے ترکے کے متعلق مرزا غالب کے اختلافات کس
طرح شروع ہوئے اور اس نزاع کی تلخی کو مرزا غالب نے کس درجہ
محسوس کیا۔ ۱۸۳۵ء میں جب شمس الدین خاں نے فریزر کے قتل
کے الزام میں پھانسی پائی تو دہلی میں بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ جائیداد
کے تصفیئے کا انتقام لینے کے لئے مرزا غالب نے شمس الدین خاں
کے خلاف مخبری کی ہے۔ مجھے خیال گذرا کہ اگر اس الزام میں صداقت
کا کوئی شائبہ ہے تو لوہارو والوں اور ان کے متعلقین میں اس کے متعلق
اچھا خاصا چرچا رہا ہوگا۔ میں نے خضر مرزا صاحب سے اس بارے میں
سوال کیا۔ انہوں نے فوراً کہا "مخبری؟ ہم نے تو کوئی ایسا ذکر کبھی سنا
نہیں۔ ہاں فتح اللہ بیگ خاں کا نام اس سلسلے میں لیا جاتا ہے۔
فتح اللہ بیگ خاں پھوپھی کے بیٹے تھے امین الدین خاں کے۔
ان سے شمس الدین خاں نے ایک دفعہ ہنسی ٹھٹھے میں کچھ ایسی چھیڑ
چھاڑ کی کہ وہ بگڑ گئے۔ ہوا یوں کہ فتح اللہ بیگ خاں نے ایک کابلی گھوڑا
خریدا۔ بڑے ٹھاٹھ کا گھوڑا تھا مگر ایک بات اس میں عجیب تھی۔ اتنے
بڑے بڑے فوطے تھے۔ شمس الدین خاں نے گھوڑا دیکھ کر قیمت پوچھی
فتح اللہ بیگ نے کہا 'ایک ہزار کو خریدا ہے'۔ اب بھلا شمس الدین خاں
کی زبان کو کون روکے۔ فوراً بولے "ہاں بھئی کیوں نہ ہو، ایک ہزار
کے تو اس کے خصیئے ہی ہیں، بس یہ بات تھی جس پر دونوں میں بگاڑ
ہوگیا اور فتح اللہ بیگ کا دل پھر کبھی اُن سے صاف نہ ہوا۔ یہی وجہ ہے
کہ جب فریزر کے قتل کے معاملے میں شمس الدین خاں پر آفت آئی تو
اُس وقت فتح اللہ بیگ خاں نے اُن سے دشمنی کی۔

"شمس الدین خاں مُدّی رنڈی کے بیٹے تھے۔ نواب احمد بخش خاں
کو مدّی بہت عزیز تھی۔ اس لئے شمس الدین خاں کو اپنے دوسرے بیٹے
سے زیادہ چاہتے تھے۔ شمس الدین خاں رنگین مزاج نوجوان تھے۔
اُن کے حسن و جمال کا دہلی بھر میں شہرہ تھا۔ جب یہ بازار میں سے گزرتے
تھے تو طوائفیں اُن کو دیکھنے کے شوق میں اپنی کھڑکیوں کے پردے اُلٹ
دیتیں اور اس انتظار میں بیٹھی رہتیں کہ کب نواب کی سواری ادھر سے
نکلے۔ جب اُنہیں پھانسی ہوئی ہے تو دہلی میں ان کا بڑا ماتم کیا گیا۔ مرزا
غالب نے ان کے مرنے پر ایک رباعی لکھی تھی مگر مجھے یاد نہیں ہے۔"

میں نے باقر علی خاں اور حسین علی خاں کے متعلق کچھ سوالات
کئے۔ فرمایا "یہ دونوں مجھ سے بڑے تھے۔ زین العابدین خاں مرنے
سے پہلے انہیں مرزا صاحب (غالب) کے سپرد کر گئے۔ دراصل
زین العابدین خاں کو اپنی بیوی کی موت کا بڑا صدمہ ہوا تھا۔ شاید نوشابہ بیگم
نام تھا، مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ زین العابدین خاں کو ان سے
بہت محبت تھی۔ بُت کی طرح سامنے بٹھائے رکھتے تھے۔ انہیں درد
گردہ ہوا اور مر گئیں۔ جہاں ان کی چارپائی تھی، زین العابدین خاں
چھ مہینے وہاں بیٹھے رہے مگر آنکھ سے آنسو نہیں چلا۔ اس حالت
میں بھلا کب تک جیتے؟ آخر اسی غم میں خود بھی گھُلنے لگے۔ مرنے
سے ایک دن پہلے مرزا غالب خیریت پوچھنے آئے تو اُن سے کہا،
دیکھو خالو میں تو جاتا ہوں۔ ان دونوں بچوں کو چھوڑے جا رہا ہوں۔
میرے بھائی ہیں، سو اُن کے اپنے بھی بچے ہیں۔ وہ اپنے بچوں کی
بھی اچھی طرح خبر نہیں لے سکتے۔ اُن سے کیا کہوں۔ یہ دونوں لڑکے
ہیں۔ بن ماں اور بن باپ کے ان کا کیا ہوگا۔ مرزا صاحب نے اتنا
سنا تھا کہ اُٹھ کر لڑکوں کا ہاتھ پکڑ لیا اور زین العابدین خاں سے کہا،
تم اس طرف سے خاطر جمع رکھو۔ یہ دونوں بچے میری جان کے ساتھ
رہیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔ مرزا صاحب نے ان کو بڑے لاڈ سے
پالا۔ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا ہے کہ حسین علی خاں ان سے شوخیاں
کرتے اور کبھی چھاتی پر چڑھ بیٹھتے تھے۔ پڑھائی کے معاملے میں بھی
ان کی بہت ناز برداری ہوتی۔ مرزا صاحب نے کہا "ارے حسین علی
آ کے پڑھ لے"۔ انہوں نے جواب دیا "دادا جان آتا ہوں"۔ اور دوسری
طرف نکل گئے۔ کھیل تماشے کا تو انہیں لپکا تھا۔ کٹھ پتلیوں کے تماشے
پر ایک دفعہ بیس روپے خرچ کر دیئے اور پھر منہ بسورتے ہوئے مرزا
صاحب کے پاس آئے کہ "دادا جان بیس روپے دلوا دیجئے"۔ مرزا صاحب

نے آواز دی 'کلّو ——!' کلّو آیا تو اس سے کہا 'بھئی انہوں نے ایک پتھر اور مارا۔ دے دے اور بیس روپے۔' جب ذرا سیانے ہوئے تو مرزا صاحب کے ساتھ مشاعروں میں بھی آتے جاتے تھے۔ ایک مشاعرے میں اُنہوں نے غزل پڑھی جس کا ایک شعر مجھے اب تک یاد ہے ؎

دیکھیں وہ اچھے ہیں یا شمع ہے بہتر اُن سے
رنگ کھل جائے گا اس کا بھی سحر ہوتے تک

"مرزا صاحب بھی موجود تھے۔ فرمایا" خوب چہک رہا ہے۔ پرانا ہو جائے گا تو بہت اچھا چنڈول نکلے گا۔' ان دونوں بھائیوں کے مزاج میں عجب فرق تھا۔ باقر علی خاں خاموش آدمی تھا۔ مزاج میں تمکنت اور غرور بہت تھا۔ مرزا صاحب کے ساتھ کبھی مشاعرے میں بھی نہ جاتے تھے۔"

اس موقع پر مجھ سے نہ رہا گیا۔ خضر مرزا صاحب لفظوں کا طلسم باندھ کر بھولے بسرے واقعات تصویر در تصویر مجھے دکھاتے چلے جاتے تھے اب مشاعروں کا ذکر جو ہوا تو میرا جی چاہا کہ مشاعروں میں مرزا غالب کی تصویر دیکھوں۔ پوچھا کہ کبھی مشاعرے میں مرزا صاحب کو غزل پڑھتے ہوئے آپ نے بھی دیکھا ہے؟ فرمایا" ہاں کیوں نہیں۔ کئی مرتبہ میں نے اُن کی غزل مشاعرے میں سنی ہے۔ اُن کا غزل پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ اول مصرع پڑھ کر ذرا ٹھیر جاتے۔ اب لوگ دیکھتے تھے۔ اس پر وہی پہلا مصرع مکرر پڑھتے۔ اور اس کے بعد دوسرا مصرع سناتے تھے۔ عام طور پر بڑے اطمینان اور تمکنت سے پڑھتے تھے۔ جب کوئی تعریف کرتا تو دایاں ہاتھ ذرا اوپر کو دو تین بار اُٹھاتے۔ میں کئی بار ان کے ساتھ مشاعرے میں گیا۔ قالین پر بیٹھتے تھے۔ مصلّے کی طرح کا قالین ہوتا تھا پیچھے تکیہ رکھ دیا جاتا۔ شمع سامنے آتی تو اپنی غزل سناتے تھے۔

"میں نے مرزا صاحب کو غزل لکھتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔ عام طور پر مے نوشی کے ساتھ ساتھ غزل کہتے تھے۔ شراب پینے میں ان کا دستور یہ تھا کہ داروغہ کلّو گلاس کو دھو کر آدھ پاؤ شراب اس میں ڈال دیتا۔ اور گلاس ڈھانک کر ان کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ موسم گرما میں شراب کا گلاس لال قند کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ کپڑے کو برف سے تر کر دیتے تھے۔ اتنا تر ہو جاتا کہ پانی ٹپکنے لگتا۔ مغرب کی اذان ہونے پر شراب پیتے تھے۔ ایک قاب میں بادام، نمک میں پڑے ہوتے، گھی میں تلے ہوئے بادام، پاس ہی پڑے رہتے تھے۔ چار بادام مُنہ میں ڈال لیتے اور شراب کا ایک گھونٹ پیتے۔ شراب پیتے اور ساتھ ساتھ غزل لکھتے جاتے تھے۔ شعر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے، پھر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

"شراب نوشی کے سلسلے میں ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے تو اب بھی ہنسی آتی ہے۔ موسم سرما میں ایک دن مرزا صاحب کے سامنے شراب رکھی تھی کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ملنے کو آ گئے۔ نواب صاحب مے نوشی سے تائب ہو چکے تھے مگر مرزا صاحب نے پھر بھی اُن کی صلاح کی۔ نواب صاحب نے معذرت چاہی اور کہا تم جانتے ہو میں توبہ کر چکا ہوں۔ یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے سینے میں دو ہتّڑ مارا اور کہا" ہئے ہئے! بھئی جاڑوں میں بھی توبہ! مجھے جو ہنسی آئی تو پردہ اُٹھا کر بھاگ گیا۔

"مرزا صاحب کے ملنے والوں میں مرزا تفتہ کو میں نے کئی دفعہ دیکھا ہے۔ کمر بندھی رہتی تھی۔ چُغہ گھٹنے تک آتا تھا۔ سر پر پرانے فیشن کی پگڑی۔ ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی رکھتے تھے جس کے سرے پر ایک موٹا سا لٹّو ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے ایک دن مرزا تفتہ اصلاح لے رہے تھے۔ شاید کچھ نثر لکھ کر لائے تھے۔ شام کا وقت تھا۔ اتفاق سے شمع گُل ہو گئی۔ مرزا صاحب نے آوازوں پر آوازیں دیں" کلّو! جلد آؤ۔ ارے میاں دیکھنا شمع گُل ہو گئی!

"ایک مرتبہ داروغہ کلّو نے آکر پوچھا کہ تیتر ذبح کرتے ہوئے اُس کی گردن اُڑ گئی، کیا حلال ہے یا نہیں؟ مرزا صاحب نے فوراً کہا "اُس کے حلال ہونے میں کیا شک ہے۔ ارے میاں، وہ تو اُسی وقت حلال ہو گیا جب اس کی گردن اُڑ گئی!"

"ہنسنا ہنسانا تو گویا ان کا کام ہی تھا۔ ایک دن میں کھڑا تھا کہ اُوپر سے اُترے۔ ہاتھ میں لکڑی تھی (اتنی بڑی لکڑی رکھتے تھے) ہاتھ میں دوسرا ہاتھ میرے کھوے پر رکھ کر کہا "آ تیری دادی کے گھر چلتا ہوں (یہ امراؤ بیگم کا ذکر ہے۔ میں بڑا ہو کر انہیں کے گھر جایا کرتا تھا۔ میری دادی تو مر گئی تھیں) اندر جا کر بستی ماما سے دادی کے متعلق پوچھا کہ کہاں ہیں معلوم ہوا نماز پڑھ رہی ہیں۔ مرزا صاحب بولے" جب آؤ نماز میں! ارے خضر تیری دادی نے تو گھر کو فتحپوری کر دیا!"

جتنی دیر میں یہ لطائف بیان ہوئے۔ مغرب کا وقت قریب آ پہنچا۔ دراصل یہ تمام گفتگو یوں مسلسل نہیں ہوئی جیسے میں نے بیان کی ہے۔ بیچ میں وقفے بھی آتے رہے۔ اگر مرزا غالب کے الفاظ استعمال

کئے جائیں تو خود خضر مرزا صاحب کا گھر ایک چھوٹے پیمانے پر مسجد فتحپوری کا کام دیتا رہا۔ اس اثنا میں ہمیں دو نمازوں سے سابقہ پڑ چکا تھا اور اب تیسری کے بعد ہمیں اپنے معزز میزبان سے رخصت ہونا تھا۔ اس موقع پر خضر مرزا صاحب نے ایسے حسنِ اخلاق سے کام لیا کہ میں اُن کی مہربانیوں سے آشنا ہونے کے باوجود حیران رہ گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ رخصت ہونے سے پہلے قطب صاحب کی درگاہ جاؤں اور لوہارو والوں کے مزارات دیکھ سکوں۔ اس غرض سے کسی واقف کا ساتھ ضروری تھا۔ خضر صاحب سے اس قسم کی درخواست کرنا سراسر گستاخی تھی، لیکن اُنہوں نے شاید میرا عندیہ بھانپ لیا اور خود بخود میرے ساتھ چلنے کا خیال ظاہر کیا۔ اس پیرانہ سالی میں میری خاطر اُن کا یہ تکلیف گوارا کرنا ایک نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہ تھا۔ اُنہوں نے ایک بڑی سی لکڑی ہاتھ میں لی اور اسے ٹیکتے ہوئے قطب صاحب کی درگاہ کو روانہ ہوئے۔ ہم تینوں بھی اُن کے ساتھ ہو لئے۔ خوش قسمتی سے ہماری منزلِ مقصود بہت دور نہ تھی۔ درگاہ کے احاطہ میں داخل ہونے سے قبل میں نے بہادر شاہ کی شکستہ حویلی کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ برسات کے دنوں میں بہادر شاہ جب مہرولی آتے تو اسی حویلی میں ٹھیرتے تھے۔ یہ عمارت اب جگہ جگہ سے ٹوٹ رہی ہے لیکن ڈیوڑھی کا رفیع الشان محراب دار دروازہ اب بھی برقرار ہے اور پہلی نظر میں بتا دیتا ہے کہ مغلوں کا فنِ تعمیر اپنے دورِ زوال میں بھی شکوہ و عظمت سے یکسر عاری نہ تھا۔ درگاہ کے صدر دروازے سے داخل ہو کر آہستہ آہستہ چلتے ہوئے ہم لوہارو والوں کے احاطے تک پہنچے۔ سب سے پہلے ہم نے اینٹ کی بنی ہوئی دو سادہ سی قبریں دیکھیں۔ دونوں قبریں بالکل ساتھ ساتھ بنی ہوئی ہیں۔ معلوم ہؤا کہ ایک قبر نواب احمد بخش خاں کے والد عارف جان کی ہے اور دوسری عارف جان کے بھائی قاسم جان کی جو خضر مرزا صاحب کے جدِ امجد نواب غلام حسین خاں مسرور کے دادا تھے۔ ان قبروں سے ذرا ہٹ کر نواب احمد بخش خاں کی زیادہ شاندار قبر ہے۔ اس پر سنگِ مرمر بھی سلیقے سے استعمال کیا گیا ہے۔ مولانا فخر الدینؒ کا مزار جو قریب ہی ہے اب بھی زیارت گاہِ عام ہے۔ لوہارو والوں کی چار پانچ نسلوں کی قبریں یہاں موجود ہیں اور خضر مرزا صاحب ہاتھ کے اشارے سے اِن ہمیشہ کی نیند سونے والوں کا تعارف مجھ سے کراتے جاتے تھے۔ شام کے پھیلتے ہوئے دھندلکے میں اُن کے ہاتھ کی ہر جنبش گویا ایک مٹی ہوئی دنیا کو میری آنکھوں کے سامنے لا رہی تھی۔ مغرب کی نماز کے بعد جب ہم یہاں سے لَوٹے تو سب خاموش اور اپنے اپنے خیالات میں محو تھے۔

حمید احمد خاں

لکھنؤ کے سبزہ زار

لکھنؤ! اے لکھنؤ! محبوب بستی، لکھنؤ!
زندگی کو کلفتیں بے کیف کر دیتی ہیں جب،
تیرے دامن میں سکوں پاتا ہوں میں!
تیری ہی جانب چلا آتا ہوں میں!

لکھنؤ، اے لکھنؤ!
ہند کی تاریخ کا تو گوہرِ تابندہ ہے،
جس کی ضَوافشانیاں
غازہ و رنگِ رُخِ تہذیبِ مشرق تھیں کبھی!

تیرے ایوانوں میں نغمے عشق کے خاموش ہیں،
جلوہ ہائے حُسنِ عالم سوز بھی روپوش ہیں،
گیسوئے اردو کی آرائش اسی محفل سے تھی،
شعریت کے رُخ کی زیبائش اسی محفل سے تھی،
اس فضا میں اب نہ وہ رعنائی شاہانہ ہے
شمع اُردو پر نہ وہ دل سوزیٔ پروانہ ہے
انقلابِ دہر کے ہاتھوں سے اب
لکھنؤ اُجڑی ہوئی یادوں کا اک ویرانہ ہے
مے چھلک کر گر چکی ہے اور تہی پیمانہ ہے۔

یہ مہکتے لالہ زار
جن کو پہناتی ہے قدرت شبنمی گوہر کے ہار
جن میں رقصاں ہے شعاعِ آفتابِ زرنگار،
اے دیارِ رنگ و بُو!
تیرے سینے پر یہ سب،
سبز مخمل کی حسیں شطرنج کے مانند ہیں
کھیلتا تھا جس پہ شاہانِ اودھ کا اقتدار!

آہ! لیکن، گردشِ لیل و نہار
لُٹ گیا شطرنج کا سارا سنگار!
یہ شکستہ اور ویراں سے محل
ہیں اُسی شطرنج کے مُہرے مگر ٹوٹے ہوئے،
سرنگوں ہیں، مضمحل ہیں، پائمال و سوگوار!
اب اُسی شطرنج پر ہیں منتشر
جس پہ شاہانہ تدبّر تھا کبھی مصروفِ کار!

دن گیا، اب مرغزاروں پر ترے چھائی ہے شام
ڈوبتے سورج سے بہتی ہے شرابِ لالہ فام
مضمحل سی بہہ رہی ہے اک طرف

گومتی کی ارغوانی جوئبار!
جس کی لہروں پر ہیں لرزاں ان سنہری گنبدوں کے دھندلے
دھندلے نقش ہائے زرنگار!
جس کے دامن میں ہے اب سوئی ہوئی
یادِ ماضی کے بچھونے پر گئی گذری بہار!

گومتی، میں، اور یہ منظر، سبھی خاموش ہیں،
دھندلکے ہیں شام کے
مضمحل سا جا رہا ہوں، سرنگوں،
اور سناٹے میں یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
لے رہا ہے سانس عہدِ رفتہ کا بے دم فسوں!

اُف! یہ غمگین نکہتیں،
جن کی عنبر بیزیوں میں اب نہیں لطفِ بہار،
اور قیصر باغ میں یہ سنگِ مرمر کے محل
ہیں جو تہذیبِ اودھ کے شاہکار
ان کے آغوشِ تجلی ریز میں۔
سو رہے ہیں آہ وہ گردوں وقار،
جو نہ تھے، افسوس! میدانِ سیاست کے سوار!
شب کی تاریکی میں اِن اُجڑے ہوئے محلوں میں ہی

ڈھونڈتی ہے کھوئی عظمت اُن کی روحِ بے قرار!
جگمگاتا ہے انہیں کے نام سے نامِ اودھ،
وہ نہیں باقی، ہے باقی صرف اب شامِ اودھ۔

آہ! اے شامِ اودھ!
اب پریشاں ہو رہی ہے تیری زلفِ مشکبار،
شوخی و سرخیِ اُفق کی تیرے اب ہے داغدار!
لیکن اے شامِ اودھ! ہوتا ہے تیرے نام سے
مرتعش اب بھی تخیل پر وہ کیف آگیں خمار
عشرتِ رنگیں کے افسانے ہوں جس سے آشکار۔

اے دیارِ حُسن و خوبی! غم نہ کر،
ہے یہ آئینِ جہاں!
تیرے گلشن میں بہارِ رفتہ پھر آجائے گی،
اور یہ بوڑھی کائنات،
وقت کے آنے پر اک لمحے میں پلٹا کھائے گی!
آج دل کو اپنے اس اُمید سے لبریز ہی پاتا ہوں میں،
لوٹ کر پھر آؤں گا، جاتا ہوں میں،
رخصت اے محبوب بستی اب سفر کرتا ہوں میں،
چند آنسو تیری حسرت کی نذر کرتا ہوں میں!

ساقی

غزل

شباب آیا، کسی بُت پر فدا ہونے کا وقت آیا
مری دُنیا میں بندے کے خدا ہونے کا وقت آیا

تکلّم کی خموشی کہہ رہی ہے حرفِ مطلب سے
کہ اشک آمیز نظروں سے ادا ہونے کا وقت آیا

اُسے دیکھا تو زاہد نے کہا، ایمان کی یہ ہے
کہ اب انسان کو سجدہ روا ہونے کا وقت آیا

خدا جانے یہ ہے اوجِ یقیں یا پستیٔ ہمت
خدا سے کہہ رہا ہوں ناخدا ہونے کا وقت آیا

ہمیں بھی آپڑا ہے دوستوں سے کام کچھ یعنی
ہمارے دوستوں کے بے وفا ہونے کا وقت آیا

نویدِ سربلندی دی منجّم نے تو میں سمجھا
سگانِ دہر کے آگے دوتا ہونے کا وقت آیا

ہری چند اختر

سفر پارہ

آچکا تھا نصف گردوں تک سوارِ آفتاب
لوٹتا تھا سرخ انگاروں پہ گرمی کا شباب

جا رہا تھا میں سہارن پور کو لاہور سے
درسِ عبرت لے کے خوابِ دوستی کے دَور سے

مونگ دلتی جا رہی تھی سینۂ صحرا پہ ریل
اک قیامت ڈھا رہی تھی سینۂ صحرا پہ ریل

بے زبان جنگل میں دَورِ علم کا اعلان تھا
وجد تھا باغوں پہ طاری رقص میں میدان تھا

کر رہی تھی دمبدم روشن چراغِ انہماک
پٹڑیوں کے سنگ پاروں کی صدائے نوحہ ناک

بن رہی تھی صاف میداں کی ہوا تپ تپ کے لُو
ہو کتا جاتا تھا انجن پھیلتی جاتی تھی بُو

بچھ رہے تھے ایسی چپ سادھے سلیپر راہ میں
جس طرح ساونت سینہ تان لے جنگاہ میں

پٹڑیوں کا ارغنوں تھا گھومتے پہیوں کی گت
چار تالی راگنی سے گونجتی جاتی تھی چھت

کوئلے کے ننھے ننھے ذرہ ہائے نیم جاں
برق رو جھونکوں کے بہتے دامنوں میں تھے رواں

لیکن آنکھوں کے دریچوں سے ہٹا جاتا تھا دل
یاد کوئی آ رہا تھا اور گھٹا جاتا تھا دل

احسانِ دانش

تیسری بہن

بعض صاحبوں کو یہ ڈرامہ بظاہر فلم کا ایسا منظر نامہ معلوم ہوگا جس میں منظر نامے کی فنی ہدایات موجود نہیں لیکن حقیقتاً یہ ایک خالص سٹیجی ڈرامہ ہے جسے ہدایات کی معمولی تبدیلی کے بعد گھومنے والی سٹیج پر بہت آسانی کے ساتھ دکھایا جا سکتا ہے لیکن ایسی سٹیج کا ہمارے ملک میں فقدان ہے اس کی کمی کو بیک وقت تین کمروں کے ذریعے سے پورا کیا جا سکتا ہے۔ (ڈرامہ نگار)

موہنی اور شیاما ———— دو گریجویٹ بہنیں

لیلا ———— ان کی چھوٹی بہن

بیوہ ماں ————

موہن ———— لڑکیوں کا ہمجولی جو بچپن سے ان کے ہاں آتا جاتا ہے

کامتا پرشاد سیٹھی ———— ایک دولت مند عیاش

سدرشن ———— ایک نوجوان سیٹھ

کامتا پرشاد اور سدرشن کے دوست اور نوکر وغیرہ

پہلا سین

(کلکتہ کے ایک نواحی قصبہ میں آبادی سے ذرا ہٹ کر ایک معمولی دو منزلہ مکان ہے۔ دوسری منزل پر ایک چھوٹے کمرہ میں دو تین کرسیاں اور میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان بے ترتیب پڑا ہے۔ بائیں دیوار میں ایک کھلی ہوئی الماری تک پہنچنے کے لئے پلنگ کو ایک طرف سے پرے ہٹا دیا گیا ہے۔ پلنگ پر چند ساڑھیاں۔ سلائیاں۔ فریم اور اسی قسم کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بکھری پڑی ہیں۔ دوسری الماری کے ایک خانے میں کتابوں کی ایک ترچھی قطار نظر آتی ہے۔ کمرے کے وسط میں ایک صندوق کھلا پڑا ہے اور اس کے پاس ایک بندھا ہوا بستر۔ سامنے ادھیڑ عمر کی ایک عورت اپنے مرجھائے ہوئے غمگین چہرہ کو داہنے ہاتھ کا سہارا دیئے کرسی پر بیٹھی ہے۔ ایک نوجوان حسین لڑکی زیر لب گنگناتی ہوئی اِدھر اُدھر کسی چیز کی تلاش کر رہی ہے)

عورت (ٹھنڈی سانس لے کر) نہ جانے مجھ سے کون سا پاپ ہوا تھا جس کی سزا بھگت رہی ہوں۔ لیلا! تمہارے باپ نے تم تینوں کو اس لئے پڑھایا تھا کہ مجھے ماں نہ سمجھو؟

لیلا:۔ ناحق بیٹھے غم کھا رہی ہو بھابی۔ کلکتے ہی تو جا رہی ہوں تم تو ایسے کرتی ہو جیسے۔۔۔۔۔۔۔۔

ماں:۔ (بات کاٹتے ہوئے جل کر) آخر تیری بہنیں بھی تو غریبی ہی سے تنگ آ کر کلکتے گئی ہوئیں وہ کتنا روپیہ لے آئیں جو اب تیری کسر باقی ہے۔ کیوں تو لکشمی کا اوتار ہے نا؟

لیلا (ایک کتاب جھاڑتے ہوئے) توبہ بھابی اب اُن کا پیچھا چھوڑو گی بھی!

ماں (جیسے کچھ سنا ہی نہیں) دیکھو کلجگ کی بات! میں اپنی جگہ بڑے چاؤ چوچلو سے ان کے لئے بر دیکھتی پھری۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری سندر پڑھی لکھی اور سگھڑ بیٹیاں کلکتے میں من مانے بیاہ بھی کر چکی ہوں گی۔ اب ایک روتی ہے اپنے بچے کو دیکھ کر، دوسری اپنی جان کو۔

لیلا (بڑی متانت سے) میں جی جی اور موہنی کا تو قصور سمجھتی نہیں بھابھی! میں اُن بے رحم مردوں کو گنہگار سمجھتی ہوں جنہوں نے دھن دولت اور زور کے مان پر دیوتاؤں کے روپ میں دو سیدھی سادھی لڑکیوں سے بیاہ کر لیا اور بعد میں اُنہیں دھتکار دیا۔

ماں (لجاجت سے) لیلا پرماتما کے لئے سوچو۔ ذرا غور کرو۔ پھر جب تم بھی جا رہی ہو تو دنیا میرے جنم پر تھوکے گی۔ میں کہاں کی رہوں گی۔

لیلا (جان بوجھ کر بات بدلتے ہوئے) معلوم نہیں میرا پہلا جمپر کہاں گیا ہے، تم تو نہیں جانتیں بھابھی؟

(ماں خاموش رہتی ہے)

لیلا (شوخی سے) اچھا نہ بتاؤ جی ہم کلکتہ جا کر اور بنوا لیں گے۔۔۔۔ ایک بستر۔۔۔۔۔۔ ایک مشین۔۔۔۔۔۔ دو۔۔۔۔ ارے جاتے ہی بھابھی کو خط لکھوں گی اور پہلے پتہ رکھنا بھول ہی گئی۔

ماں (ٹھنڈی سانس لے کر) تو بہت ہٹ کر رہی ہے لیلا! کون تجھے عقل دے ؟ تم سب نے میرے ہر دے کو اندر ہی اندر پھونک دیا ہے!

لیلا :- میں سب کچھ جانتی ہوں بھابھی۔ میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ اب تم بھی تو سوچو۔ غربت کے دن اور مفلسی کی راتیں کب تک یوں کٹیں گی۔ کبھی اس بات کا جواب تو نہیں دیا .... او نہہ یہ کمبخت سوٹ کیس تو بند ہی نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں کب کا ہے۔

ماں میں گھر بیٹھے غریبی کا دکھ جھیل سکتی ہوں۔ تم نہ جاؤ تو میں سب کچھ سہہ لوں گی لیلا۔ میری جان، میری آشا (پھر کرسی سے اٹھتے ہوئے بڑے لاڈ سے) چھوڑ دو سامان کو چاند سی بیٹی! لاڈوں میں پلی ہوئی جاکر پرایوں کا کام کیوں کرے۔ میں بھلا جانے دیتی ہوں تمہیں؟ پاگل کہیں کی ہٹ صندوق ٹھکانے لگاؤں۔

لیلا (ذرا ہنس کر) نہیں نہیں بھابھی، تم بیٹھی دیکھتی رہو۔ اس میں اتنی بہت سی چیزیں کیسے آتی ہیں۔ تم مجھے لاکھ سمجھاؤ میں جاکر رہونگی، بس میں نے کہہ دیا۔

ماں (تنگ آکر) آگ لگے اس گھڑی کو جب ان کے پتا نے انہیں لکھایا پڑھایا۔ سارا پیسہ انہیں پر خرچ کر دیا اور یہ نہ سوچا کہ میں مر جاؤں گا تو یہ بیٹھ کر ان لڑکیوں کو چاٹا کرے گی۔

لیلا (ہنس کر) اُفوہ! بھابھی آج تو تم بہت سُندر معلوم ہو رہی ہو۔ اور پھر جب میں اپنی بھابھی کے لئے اچھے اچھے کپڑے بھیجوں گی۔ .... بھابھی کو روپے بھیجوں گی۔

ماں (بات کاٹ کر) اور پھر جب بھابھی کے سر میں خاک ڈالوں گی۔

لیلا (گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) ارے پونے دو! اور موہن ابھی آیا ہی نہیں۔ کہا تھا ذرا سٹیشن تک پہنچا آتے۔

(اٹھارہ اُنیس سال کا ایک خوش شکل اور بھولا سا لڑکا اندر داخل ہوتا ہے)

موہن (مسکراتے ہوئے) کیوں سچ مچ تیار ہو گئیں۔؟

ماں موہن تم ہی لوگوں نے اس سر پھری کو کچھ سمجھایا ہوتا۔ میری تو سنی ان سُنی انہوں نے ایک برابر کر رکھی ہے۔

موہن (متانت سے) جی ہم لوگ تو انہیں بہت کچھ سمجھا بیٹھے۔ صبح ماتا جی بھی منتیں کرتی رہیں سُر بھا اسی وقت سے بیٹھی رو رہی ہے۔ اب یہ نہ مانیں تو . . . . .

لیلا (ہنس کر) اچھا مان لیا آپ لوگوں نے مجھے بڑی اچھی طرح سے سمجھایا۔ مگر معاف کیجئے اب دیر ہو رہی ہے۔ چلئے نیچے۔

(سب نیچے اُتر جاتے ہیں موہنی اور شیاما خاموش اور غمگین گھر کے بڑے دروازے کی طرف چلتی ہیں)

لیلا (موہن اور شیاما کی طرف دیکھتے ہوئے) اچھا جیجی، موہنی بہن گڈ بائی،

شیاما (روتی ہوئی آنکھوں سے لیلا کی طرف دیکھتے ہوئے) لیلا تم کسی طرح نہیں مان سکتیں کیا؟ تم ہمیں بالکل انجان سمجھتی ہو؟

لیلا (مسکراکر) نہیں تو جیجی

(شیاما کے ہونٹ کانپ کر رہ جاتے ہیں مگر وہ کچھ بول نہیں سکتی)

لیلا اچھا بھابھی نمسکار!

(ماں آنچل سے منہ ڈھانپ کر رونے لگتی ہے)

گھر کے لوگ بڑے دروازے میں کھڑے ہیں۔ قصبہ کی پرانی سی گاڑی درختوں کے سایوں میں گم ہو جاتی ہے۔

دوسرا سین

(کلکتہ کے مغرب میں شہر سے باہر ایک خوبصورت سی پرائیویٹ سڑک پر آمنے سامنے نئی طرز کی صاف ستھری اور عالیشان عمارتیں نظر آتی ہیں۔ مشرق کی طرف شروع میں آمنے سامنے کی عمارتیں سہ منزلہ ہیں۔ بائیں عمارت کے پیچھے ایک وسیع احاطہ ہے جس میں چھوٹے چھوٹے خوشنما مکان نظر آتے ہیں۔ ان سب مکانوں میں اوسط درجے کے سرکاری ملازم رہتے ہیں۔ انہیں مکانوں میں سے ایک کے باہر مقوے کا ایک پرانا ٹکڑا دھلگے سے لٹک رہا ہے جس پر جلی حروف میں ویریندر ناتھ آن لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ احاطہ میں چند بچے کھیل رہے ہیں۔ اور کبھی کبھی کوئی عورت احاطہ میں سے گزر کر ایک مکان سے دوسرے مکان میں جاتی نظر آتی ہے۔ دائیں طرف کی لمبی عمارت کے سب سے پہلے مکان کے اوپر انگریزی میں کامتا پرشاد بلڈنگ اور سب سے نیچے بڑے دروازے کے قریب پیتل کے ایک قیمتی بورڈ پر کامتا پرشاد سیٹھی لکھا ہے۔ باقی مکانوں کے چھوٹے چھوٹے بورڈ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اعلیٰ سرکاری ملازم رہتے ہیں۔)

(صبح کا وقت ہے مسٹر کامتا پرشاد سیٹھی جن کی عمر تقریباً پینتیس سال معلوم ہوتی ہے اپنے مغربی طرز کے قیمتی سامان سے آراستہ ڈرائنگ روم میں ایک صوفے پر بیٹھے "امرت بازار پتر کا" دیکھ رہے ہیں۔ پڑھتے پڑھتے غیر اختیاری طور پر اُن کے خوبصورت چہرے سے مختلف اثرات کا اظہار ہو رہا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخبار میں اُن کی دلچسپی کی کوئی خاص بات ہے۔ دفعتاً ایک نوکر داخل ہوتا ہے۔)

نوکر (بڑی اہمیت سے) بابو جی ایک بات سُنی آپ نے .... غضب ہو گیا

مسٹر سیٹھی (ماتھے پر شکن ڈال کر نوکر کی طرف دیکھتے ہوئے، کون سی بات ؟
نوکر (بڑے تعجب سے) حضور جانتے ہی نہیں - یہاں تو بڑے چرچے ہو رہے ہیں -
مسٹر سیٹھی (قدرے اضطراب سے) مگر کچھ کہو گے بھی !
نوکر:- (متانت سے) میں تو کہتا ہوں حضور بس اس سنسار کے بُرے دن آ گئے ہیں ......
مسٹر سیٹھی (بات کاٹتے ہوئے تنگ آکر) یہ انٹ سنٹ کیا بک رہے ہو کچھ اپنی سمجھ میں بھی آ رہا ہے -
نوکر (صرف آخری الفاظ کو سنتے ہوئے) ہاں حضور پہلے تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتا تھا - مگر اب جو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے تو.....
مسٹر سیٹھی (جھلا کر) ارے کمبخت یہ بھی تو بتا کہ تو کیا دیکھ کر میرا دماغ چاٹ رہا ہے -
نوکر (ایک قدم آگے بڑھ کر جیسے بڑا راز ہے) حضور پیارے لال والی بلڈنگ (بلڈنگ) اجی بالکل سامنے کرائے کے مکان میں ....
مسٹر سیٹھی (چل کر اونچی آواز سے) آگ لگ گئی ہے ؟
نوکر - جی بات تو آگ لگنے ہی کے برابر بن رہی ہے آپ پوچھیں گے کیوں ؟ (پھر خود ہی ایک قدم آگے بڑھا کر آہستہ سے) پیارے لال کے مکان میں .... یہ آپ کے سامنے ہی تو کھڑکی کھلی رہتی ہے - سینے سلانے کا کام کرنے والی کوئی لڑکی آئی ہے - بس حضور کوئی سُندر ہو تو ایسا ہو - میں نے جیون میں اتنا جوبن کسی کام کاج کرنے والی ناری پر نہیں دیکھا -
مسٹر سیٹھی (بے پروائی سے) ہوں آ گئی ؟
نوکر (ڈرتے ہوئے ذرا ٹھہر کر) حضور آ گئی تو کچھ نہیں -
مسٹر سیٹھی (غصہ سے فرش پر پاؤں مارتے ہوئے) چل پاگل کے بچے اپنا کام کر.... خواہ مخواہ حیران کر رکھا تھا کمبخت نے اسے بتا تو سہی درزیوں کی لڑکی آئی ہے تو پھر میں کیا کروں ؟
(نوکر مجوب ہو کر سر کھجاتے ہوئے چلا جاتا ہے)
مسٹر سیٹھی (اخبار کے شکن دور کرتے ہوئے اٹھے) گھنٹہ بھر کی جھک جھک کے بعد بات کیا بتائی ہے -
(پھر اخبار پڑھنے میں مشغول ہو گئے)

دوسرا دن

(صبح کا وقت ہے - مسٹر کامتا پرشاد سیٹھی اپنے کھانا کھانے کے شاندار کمرہ میں چائے پی رہے ہیں - میز پر چائے پینے کا پُر تکلف سامان پڑا ہے سامنے شیشے کی الماریاں چاندی کے برتنوں سے جگمگا رہی ہیں - وائیں جانب ذرا پیچھے ہٹ کر پھر وہی نوکر کھڑا ہے -
مسٹر سیٹھی (پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے) آج شام کو سب نوکر منشی سے تنخواہیں لے لیں .... ہاں اور دیکھو منشی سے کہہ دینا ابھی نو سو روپے میں سے یہاں کے کرایوں کا کل چھ سو روپیہ وصول ہوا ہے - بابو جے نرائن - بابو کشن چند - اور مسٹر شمیم تو اسی بلڈنگ میں رہتے ہیں ان کے چیک بھی اب تک وصول نہیں ہوئے سمجھے ؟
نوکر (آہستہ سے) کہہ دوں گا حضور -
(مسٹر سیٹھی چائے پینا شروع کر دیتے ہیں)
مسٹر سیٹھی (کچھ دیر ٹھہر کر) ارے رگھو! کہو اُس اپنی دوست سے بھی کچھ رشتہ ناتا بڑھایا ہے یا نہیں ——— ؟
نوکر (ہاتھ ملتے ہوئے) ہرے رام - ہرے رام - سچی بات ہے بابو جی ہم سے تو وِن کی جانب دیکھا بھی نہیں جاتا - کبھی آنکھ اُٹھ بھی جائے تو شرم کے مارے دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے
مسٹر سیٹھی - ہے تو بھی آفت کا پرکالا -
نوکر (جیسے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے) اجی نہیں بابو جی - ہم کس پانی میں ہیں - وہاں تو صاحب لوگ بھی پریشان ہو رہے ہیں - وہ بھی کیا کرے کھڑکی کھولے بنا چارہ بھی نہیں، ہوا نہیں آتی ہوگی پر یہ سامنے بیٹھنے والا معاملہ بڑا سخت ہو رہا ہے - اجی سنا ہے بابو ہرد یال جی کہیں دیکھ رہے تھے کہ ہاتھ کھڑکی میں پڑے ہوئے کیلے کے چھلکے پر سے باہر کو ہی پھسل گیا وہ تو کرم اچھے تھے کہ بچ گئے نہیں تو سڑک پر ہی جا کر دم لیتے - اُن کا وہ بوڑھا نوکر آپ نے دیکھا ہوگا - وہ تو نہیں جانتا تھا پر میں جھٹ سے تاڑ گیا کہ بیچ میں کیا بات ہے - اور پھر سنیئے ؟
مسٹر سیٹھی (حیران ہو کر) اچھا تو بابو ہرد یال بھی دیکھتے ہیں -
نوکر :- اجی بابو ہرد یال ؟ واہ ! سنئے ڈپٹی صاحب اور ڈپٹی صاحب جب دفتر چلے جاتے ہیں - تو ان کے لڑکے کنول صاحب - بابو کشن چند...... انہیں کیا کہتے ہیں جی..... ہاں بابو جے نرائن - مکان نمبر پانچ والے بابو جی، مسٹر شمیم سب کے سب نوکروں کو نکال کر کھڑکیوں سے لگے ہوتے ہیں -

مسٹر سیٹھی۔ اچھا تو اب سمجھا، جبھی مجھ سے ملنے کے لئے کوئی نہیں آتا ...... ہوں ... لیکن میں حیران ہوں کہ یہ لوگ ایک گھٹیا سی کام کرنے والی لڑکی .... (بات بدلتے ہوئے) یہ انڈے ٹھیک نہیں ابلے ہوئے

نوکر۔ (جیسے کچھ سنا ہی نہیں) اجی ابھی سنیئے تو کل کی بات ہے میں نے شام کے وقت رسوئی کی کھڑکی سے سر باہر نکالا تو بابو ہردیال اپنی کھڑکی میں کھڑے سامنے اسی لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور پھر آگے بابو جے نرائن تو اپنی کھڑکی میں ایسے کھڑے تھے جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ نہ جانے حضور صاحب لوگ آپ ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے ہوں گے پر میں نے دل لگی سے ذرا آگے کو جھک کر جو ان کی طرف نگاہ ڈالی تو دونوں صاحب ایک ساتھ جھٹ سے ایسے پیچھے کو ہوئے کہ میری ہنسی نکل گئی پر حضور اب میری جان خشک ہو رہی ہے کہ میں کیوں ہنسا۔

(پردہ)

(لیلا اپنے کمرہ کے وسط میں آرام کرسی پر بیٹھی پڑھنے میں مشغول ہے سامنے مسٹر سیٹھی اپنے مکان کے ایک کمرے کی آدھی کھلی ہوئی کھڑکی کے سامنے ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک معمولی قسم کا آدمی کمرے میں داخل ہوتا ہے اور چپ چاپ ایک قیمتی سنگار دان میز پر رکھتا ہے۔

لیلا (ماتھے پر شکن ڈال کر حیرانی سے) کہاں سے آئے ہو تم؟

نووارد (جواب میں ایک خط پیش کرتے ہوئے) حضور میں بابو ہردیال کا نوکر ہوں وہ سامنے (ہاتھ سے ذرا سا اشارہ کرتے ہوئے) اس طرف رہتے ہیں۔

(لیلا خط پڑھتی ہے اور نوکر سر جھکائے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھنے لگتا ہے)

لیلا (خط پڑھ کر سنجیدگی سے) دیکھو تحفے کے لئے میری طرف سے بابو جی کا شکریہ ادا کر دینا اور اُن سے کہہ دینا میں کسی سے ملا نہیں کرتی اور اب تم یہاں مت آنا سمجھے۔

(نوکر چلا جاتا ہے۔ لیلا سنگار دان کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھ کر پھر کتاب کھول لیتی ہے۔ کمرہ میں ایک اور آدمی داخل ہوتا ہے)

نووارد (بڑے آداب سے) بی بی جی نمستے۔

لیلا (حیران ہو کر مگر تحکمانہ لہجہ میں) کیا کام ہے تمہیں؟

(تپائی پر ایک لفافہ رکھ دیتا ہے۔ لیلا لفافہ کھول خط پڑھتی ہے۔)

لیلا (خط پڑھ کر فیصلہ کن لہجہ میں) بابو جی سے کہہ دینا یہاں آنے کی بالکل تکلیف نہ کریں۔ کیا کہو گے؟

نووارد (ہچکچا کر) کہ بابو جی .... یہاں آنے کی .... کہ بابو جی یہاں مت آئیں۔ پر حضور .... اُنہوں نے تو کہا تھا۔ بی بی جی سے پتر لے کر آنا۔

لیلا۔ (ذرا ترشی سے) بس کہہ دیا نہیں جاؤ۔

نووارد (آداب سے جھکتے ہوئے) اچھا بی بی جی نمسکار۔

(نووارد چلا جاتا ہے)

لیلا۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) کمال ہے!

(پھر پڑھنے میں مشغول ہو جاتی ہے)

(پردہ)

(ویرندر ناداں اپنے کمرہ میں ایک آبی رنگ سی دری پر بیٹھے کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں عمر تیئیس سال کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ شکل بہت معمولی ہے۔ فرش پر ادھر اُدھر چند پھٹی پرانی کتابیں اور بہت سے کاغذ بکھرے ہوئے ہیں۔ کمرے میں پرانی وضع کی تین کرسیاں پڑی ہیں۔ جن میں دو کے رخ دیوار کی طرف ہیں۔ ایک کرسی پر پتیوں اور کونپلوں سمیت مختلف قسم کے تر و تازہ حسین پھول رکھے ہیں۔ (سادہ سا لباس پہنے ہوئے ایک خوش شکل آدمی اندر داخل ہوتا ہے)

نووارد (داخل ہوتے ہی) کیوں ناداں صاحب کیا بات ہے اب آپ کبھی نظر نہیں آتے۔ اجی ہاں یہ بائیں طرف اوپر کے مکان سے کل ایک لڑکی کو اُترتے دیکھا وہ کون ہے۔ بھئی واہ! یہ اتنے پھول کہاں سے اٹھا لائے ہیں آپ۔

شاعر (متانت سے) معاف کیجئے مسٹر جگل میں اس وقت ایک گیت لکھ رہا ہوں اگر آپ .... میرا مطلب ....

نووارد۔ اوہو۔ مجھے معلوم نہ تھا میں آپ کے خیالات پریشان کر رہا ہوں اچھا تو آپ لکھئے میں تو یوں ہی آیا تھا۔

(نووارد چلا جاتا ہے اور شاعر ایک کاغذ اٹھا کر پڑھتا ہے)

روپ سُہانا پھولوں جیسا، من میرا اک بھنورا
تجھ کو دیکھ کے سب کچھ بھولا، بھولا ایک زمانہ۔
کالے بال گھٹاؤں جیسے جن کی برکھا میٹھی
دل کی جلن کو پل میں مٹائے اب میں نے پہچانا۔
آنکھیں جیسے کنول کٹورے نظریں جیسے کرنیں،
حیرانی ہے ان سے من کا اک پل میں کھل جانا۔

آؤ اب تو دیا کرو اور من کی پیاس بجھاؤ،
بیری جگ ملنے نہیں دے گا، کرلو کوئی بہانہ۔

(شاعر یہاں رک جاتا ہے اور باقی گیت خاموشی سے پڑھنے کے بعد کرسی پر پڑے ہوئے پھول اٹھا کر کہتا ہے اے حسین پھولو شاید! تم اسی کی یاد میں کملا رہے ہو۔ چلو میں تمہیں اپنی پریمیکا دکھاؤں تم شرماتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پھر کھل جاؤ گے تم نہیں جانتے وہ تم سے بھی سندر ہے۔)

(پردہ)

لیلا اپنے کمرہ میں آرام کرسی پر بیٹھی کچھ بن رہی ہے۔ شاعر کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور پھولوں سے بھری ہوئی چھوٹی سی خوبصورت ٹوکری سامنے میز پر رکھ دیتا ہے۔ اور ساتھ ہی لیلا کے ہاتھ میں ایک کاغذ دیکر کچھ کہنا چاہتا ہے مگر لیلا کاغذ لیتے ہی پڑھنا شروع کردیتی ہے۔ اور شاعر خاموش کھڑا رہتا ہے۔

لیلا۔ (چند سطریں پڑھ کر) خوب! شاعر صاحب گیت تو خوب لکھتے ہیں کون ہیں؟ کیا نام لکھا ہے ہاں .... ویر ندر ..... کیا؟

شاعر (ذرا مسکرا کر) ناداں۔

لیلا ہاں دیکھو بھئی اُن سے کہہ دینا میں اُن سے مل نہیں سکتی اور پھولوں کے لئے ان کا شکریہ۔

شاعر (ذرا ٹھہر کر) جی میں......

لیلا۔ بس جاؤ تمہیں جو پیغام دیا ہے اُنہیں دے دو۔

شاعر۔ مگر جی میں.....

لیلا (ذرا سختی سے) بڑے بدتمیز ہو، جاتے ہو یا نہیں؟

شاعر۔ بات یہ ہے کہ ......

لیلا (منہ پھیرتے ہوئے وہی سختی سے) توبہ کتنا ڈھیٹ نوکر ہے کسی کا۔

(شاعر کے چہرے پر کئی رنگ آتے جاتے ہیں کمرے سے باہر برآمدہ میں نکل کر وہ ایک لمبا سانس لیتا ہے اور اس کی چال سے ایسا ظاہر ہوتا ہے جیسے اس کے جسم میں چلنے کی سکت نہیں رہی)

(پردہ)

شمیم، ایک بانکا سجیلا خوبصورت نوجوان اپنے کمرہ میں ایک کتاب کھولے بیٹھا ہے۔ پاس ایک ادھیڑ عمر کی عورت میز کے سامان کو ترتیب دے رہی ہے۔

عورت (ایک کتاب جھاڑتے ہوئے) کیا بات ہے بیٹا تم کہیں بیمار تو نہیں ہو؟ کئی دن سے تم پریشان سے رہتے ہو۔

شمیم۔ (بے پروائی سے) نہیں تو ددّا اچھا بھلا ہوں۔

آپا۔ کوئی دوا لے آؤ نا۔ کہیں نامراد بخار و خار نہ آتا ہو، موئے دن بھی آج کل ایسے ہی ہیں۔

شمیم۔ (ہنس کر) لیکن ڈاکٹر سے جاکر کہوں کیا، "مجھے بخار نہیں آتا اور کوئی شکایت بھی نہیں مگر اچھی سی دوا دے دیجئے"۔

آپا۔ (متانت سے) دیکھو شمیم ہر بات کو مذاق میں نہ ٹال دیا کرو۔ خاں صاحب نے مجھے تمہاری خبرگیری کو اس لئے تو نہیں بھیجا تھا کہ تم میرا کہا نہ مانو۔ پھر تمہیں اپنی صحت کا خود بھی خیال ہونا چاہئے تمہارا امتحان بھی شروع ہونے والا ہے، میں تو جب دیکھتی ہوں تم چپ چاپ بیٹھے ہوتے ہو۔ اور ویسے بھی تمہارے چہرے پر وہ پہلی سی رونق نہیں رہی، اچھا تو نہ جاؤ ڈاکٹر کے پاس۔ آج خط لکھ دوں گی۔ پرسوں نہیں تو اگلے دن خاں صاحب خود آجائیں گے۔

شمیم۔ اوہو! ددّا تم تو خفا ہو گئیں۔ ابّا کو خط لکھنے کی ضرورت تو جب ہوتا کہ میں تمہارا کہا نہ مانوں تم اتنا کہہ رہی ہو تو چلا جاؤں گا ڈاکٹر کے پاس۔

آپا۔ (لاڈ سے) تمہارے بھلے ہی کی تو کہہ رہی ہوں بیٹا۔ پھر جاؤ تو ابھی ہو آؤ کونسا دور جانا ہے۔ جو کام ہو جائے وہی اچھا ہوتا ہے۔

(شمیم اٹھ کر دوسرے کمرے میں جاتا ہے اور وہاں سے دوا کی ایک صاف چھوٹی شیشی اٹھا کر اس میں تھوڑا سا نمک ڈالتا ہے اور پھر اسے پانی سے بھر کر باہر چلا جاتا ہے۔)

(پردہ)

لیلا کے مکان کے نیچے چند عورتیں کھڑی باتیں کر رہی ہیں۔

ایک عورت (متانت سے) بہن دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمارے وقتوں میں بہو بیٹیاں گھروں میں ہی شرم کے مارے سمٹی رہتی تھیں چوکھٹ سے باہر قدم نہ اٹھتا تھا۔ اب دیکھ لو مردوں کو پرے بٹھاتی ہیں۔ اب اس لڑکی ہی کی طرف دیکھ لو کس دھڑلے سے اتنے مردوں میں اکیلی رہتی ہے۔ پھر آج سامنے والوں کے ایک دو نوکر بھی اوپر پہنچ گئے یہ دیکھ کر الٹی میں پانی پانی ہوتی رہی پر اُسے ڈر نہیں لگتا۔

دوسری عورت۔ بہن بات چیت سے تو کسی بڑے شریف گھرانے کی معلوم ہوتی ہے۔ بات کرتی ہے تو ایسے معلوم ہوتا ہے

جیسے پھول جھڑ رہے ہیں ۔ بڑی پیاری لگتی ہے ۔ میں نے تو ہنسی ہنسی میں کہہ دیا تھا، بہن تجھے نگوڑے کپڑے سینے کی کیا پڑی ہے تو تو کہیں راج کرنے کے لائق ہے ۔ پھر جو وہ میری بات پر ہنسی تو جی چاہتا تھا آگے بڑھ کر چوم ہی لوں ۔

تیسری عورت ۔ آج میں بھی تو منے کا فراک لینے گئی تھی وہ سیتی رہی اور میں بیٹھی دیکھتی ہی رہی کہ پرماتما روپ دینے پر آیا ہے تو کتنا دیا ہے اور قسمت دی ہے تو کیسی ۔

(پردہ)

(شمیم اپنے کمرہ میں داخل ہوتا ہے)

آپا ۔ (حیران ہوکر) کیوں؟ نہیں ملا ڈاکٹر؟

شمیم ۔ (جیب سے شیشی نکالتے ہوئے) مل تو گیا تھا ۔ بیچارے نے سب سے پہلے مجھے دوا بنادی ۔ لاؤ تو پیالی ایک خوراک بھی پئے لیتا ہوں ۔

(دوا پیالی لے کر آتی ہے)

شمیم ۔ دوا ذرا شیشی اچھی طرح ہلا لینا ۔

(آپا شیشی ہلاکر ایک خوراک پیالی میں انڈیلتی ہے شمیم دوسری طرف منہ پھیر کر مسکراتا ہے ۔

شمیم ۔ (ایک ہی گھونٹ میں نمکین پانی پیتے ہوئے) اُف بہت کڑوی ہے ۔ شکر ۔ تھوڑی سی شکر ۔

آپا ۔ ہنستے ہوئے) کیوں کڑوی لگی ۔ لو اوپر سے دو گھونٹ پانی پی لو ۔ نگوڑے سے کہہ دیا ہوتا اتنی کڑوی نہ دیتا ۔ کیوں بخار ہی بتایا ہوگا ۔ اچھا اب دوسری خوراک اپنے دھیان سے ہی پی لینا بیٹا ۔ میں اوپر ہی ہوں شاید گھڑی دو گھڑی کے لئے آنکھ لگ جائے

(آپا چلی جاتی ہے مگر کچھ دیر سیڑھیوں کے پاس کھڑے ہوکر نیچے اُتر جاتی ہے)

شمیم ۔ (مسکراکر کرسی پر بیٹھتے ہوئے) محبت کی آگ بجھانے کے لئے نمکین پانی ....

(شمیم بیٹھے بیٹھے کسی گہری سوچ میں پڑ جاتا ہے ۔ باہر سڑک پر ایک چھوٹا سا لڑکا بوٹ پالش کی آوازیں دیتا جارہا ہے شمیم دفعتاً کھڑا ہو جاتا ہے اور کھڑکی میں جاکر لڑکے کو اشارے سے سیڑھیوں میں بلاتا ہے)

لڑکا ۔ (تین چار سیڑھیاں چڑھ کر) بابو جی تین پیسے ہوں گے کی وی کا پالش ہے بس چمکا دوں گا بوٹ ۔

شمیم ۔ ارے اوپر تو آؤ ۔

لڑکا ۔ اندر آجاؤں حضور ۔

شمیم ۔ ہاں آجاؤ (پھر اپنی کھڑکی کے پاس پہنچ کر) دیکھو پہلے ایک کام کرو، وہ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) وہ سامنے کھڑکی دیکھ رہے ہو نا !

لڑکا ۔ کہاں حضور ۔

شمیم ۔ ارے وہ دیکھو ۔ اِدھر دیکھو ۔

لڑکا ۔ ہاں حضور وہ جو آدھی کھلی ہے ۔

شمیم ۔ ہاں ہاں میں تمہیں ایک ڈبّا دیتا ہوں وہ لے کر وہاں اوپر چلے جاؤ سڑک پر سے ہوکر احاطہ کے اندر داخل ہو جانا اور پہلے ہی مکان کی سیڑھیوں پر چڑھ جانا ۔ پہلے برآمدہ آئے گا اس کے آگے کمرہ ہے بس آگے بی بی جی سینے کی مشین رکھے بیٹھی ہوں گی ۔ انہیں یہ دے دینا ۔

لڑکا ۔ (ہچکچاکر) مگر حضور!

شمیم ۔ (آہستہ سے) ارے آؤ گے تو چار آنے ملیں گے ۔ اور دیکھو تمہارے جیب ہے؟ ہاں ہے ۔ یہ کاغذ اس میں رکھ لو ۔ یہ بھی اُنہیں دے دینا ۔

لڑکا ۔ اچھا حضور ۔

شمیم ہاں دیکھو جلدی سے آنا ۔ میں سیڑھیوں میں کھڑا ہوں ۔ یہ اپنی صندوقچی بھی اٹھا لو راستہ میں بوٹ پالش کی آوازیں بھی دیتے جانا ۔ ارے یہ ڈبّا اس طرح نہ پکڑو ۔ ہاں چھپا کر ۔

(لڑکا چلا جاتا ہے)

(پردہ)

احاطہ میں شمیم کی دوا انہیں عورتوں میں کھڑی ہے ۔

ایک عورت ۔ میں تو چلتی ہوں ۔ شام ہو رہی ہے منے کے پتا جی نہ جانے ابھی تک کیوں نہیں آئے ۔

دوسری عورت ۔ میں بھی چلتی ہوں اب تو کھڑے کھڑے ٹانگوں میں درد ہونے لگا ہے ۔ ہم بھی جب سے کھڑی ہیں جگ بھر کی باتیں کر ڈالی ہیں ۔

شمیم کی آپا ۔ لو میں خواہ مخواہ ہی آئی ۔ سونے لگی تھی ہلاتے جاتے خیال آگیا ۔ چلو نیچے ہی ہو آؤں ۔

تیسری عورت ۔ تو چلو اندر بیٹھتے ہیں ۔

آپا :۔ نہیں تو پھر آؤں گی ۔

(عورتیں اپنے اپنے گھروں کو چلی جاتی ہیں۔ لڑکا احاطہ میں جاکر لیلا کے مکان کا راستہ بھول جاتا ہے۔ اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھتا ہے۔)

آپا ۔ (لڑکے کو پریشان دیکھ کر) کیوں؟ کس کا گھر ڈھونڈ رہا ہے ۔ پیسے لینے ہیں کسی سے ؟

لڑکا :۔ وہ بی بی جی جو سلائی کا کام کرتی ہیں اُن کا مکان کون سا ہے

آپا :۔ کیوں تمہیں کیا کام ہے ۔

لڑکا :۔ (ڈبا دکھا کر) یہ دینا ہے اُن کو ۔

آپا :۔ (ڈبا ہاتھ میں لے کر) کس نے دیا ہے بیٹا ۔

لڑکا :۔ (ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے) وُہ بابو جی جو اُدھر رہتے ہیں ۔

آپا ۔ (لڑکے کو ہاتھ سے پکڑ کر) آؤ تو بیٹا مجھے بتاؤ ۔

(لڑکا احاطے سے باہر نکل کر شمیم کے مکان کی طرف اشارہ کرتا ہے)

آپا ۔ (لڑکے کو پھر اندر سے جاکر پچکارتے ہوئے) کیوں بیٹا کچھ اور بھی دینا ہے

لڑکا ۔ (جیب سے کاغذ نکال کر) یہ بھی تو دوں گا ۔

آپا ۔ (خط کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے) تمہارا پیارا شمیم! ٹھہر تو لکھتی ہوں خاں صاحب کو کہ لڑکا لگا ہے نام روشن کرنے ۔ کرتی ہوں تیرا بندوبست ۔ میں ڈاکٹر کی طرف بھیجتی رہی۔ پوچھتی ہوں تا جاکر تو کس مرض کی دوا لایا ہے ۔

(لڑکا حیران سا ہو جاتا ہے۔ شمیم کی آپا ڈبے کو کھول کر دیکھتی ہے جو کیک چاکلیٹ اور ٹافیوں سے بھرا پڑا ہے)

شمیم کی دوا (حقارت سے) واہ کیا کہنے ہیں ننھے کے ۔ ٹھہر تو جا ۔ (لڑکے کو کیک اور بہت سی ٹافیاں دیتے ہوئے) لے بیٹا گھر جاکر کھا لینا ۔ صندوقچی میں رکھ لے ۔

(پھر باقی سب کچھ اپنی جھولی میں ڈال لیتی ہے) جاؤ بیٹا جاؤ شاباش! ڈبا انہوں نے میری طرف ہی بھیجا تھا ۔

(شمیم کی آپا پھر خط پڑھنا شروع کر دیتی ہے اور لڑکا چھلانگیں مارتا ہوا شمیم کی سیڑھیوں میں جا پہنچتا ہے ۔)

لڑکا ۔ (جاتے ہی) دے آیا بابو جی، بی بی جی نے نیچے ہی آکر لے لیا تھا ۔

شمیم ۔ شاباش ۔ لو چونی ۔ کل پھر آنا ۔ اتنے ہی پیسے ملیں گے ۔

(لڑکے کا چہرہ فرطِ مسرت سے تمتما اٹھتا ہے)

شمیم ۔ کچھ کہا تو نہیں تھا اُنہوں نے ؟

لڑکا ۔ حضور آپ کا مکان پوچھا تھا ۔ اور پھر جو کاغذ دیا تھا نا آپ نے اُس کی طرف دیکھ کر بی بی جی آپ ہی آپ باتیں کرتی رہی تھیں ۔

شمیم ۔ اچھا کل ضرور آنا ! سمجھے ؟

(لڑکا چلا جاتا ہے)

(پردہ)

(مسٹر سیٹھی اپنے ڈرائنگ روم میں صوفے پر بیٹھے کچھ سوچ رہے ہیں بیٹھے بیٹھے ۔ نوکر کو آواز دیتے ہیں نوکر آتا ہے ۔)

مسٹر سیٹھی :۔ دیکھو! قمیصیں تمام پھٹ گئی ہیں کپڑا تو میں لے آیا ہوں اب سلوائی کس سے جائیں ۔

نوکر ۔ (آقا کا مطلب سمجھنے کے باوجود) ابھی گھنشام داس ٹیلر ماسٹر کو ابھی بلائے لاتا ہوں ۔

مسٹر سیٹھی ۔ وہ کچھ ٹھیک کام نہیں کرتا ۔

نوکر ۔ جی نہیں کام تو بہت اچھا کرتا ہے ۔ ویسے آپ کی مرضی!

مسٹر سیٹھی ۔ پاگل کے بچے میں کہہ رہا ہوں وہ کام ٹھیک نہیں کرتا اور تو کہتا ہے نہیں کرتا ہے ۔

نوکر ۔ (جلدی سے) تو حضور پھر اس لڑکی کو بلا لاؤں ۔ سنا ہے وہ سب کام جانتی ہے ۔

مسٹر سیٹھی (بے پروائی سے) نہیں ...... اچھا ... اچھا جاؤ اس سے کہو ہماری قمیصوں کا ناپ لے جائے ۔

نوکر ۔ بہت اچھا حضور!

(نوکر دروازے سے نکل کر پھر آجاتا ہے)

نوکر ۔ بابو جی ایک اور بات سُنی آپ نے ؟

مسٹر سیٹھی ۔ پہلے جو کام تمہیں بتایا ہے اُسے کرو، سمجھے ؟

نوکر ۔ حضور میں تو یہ بتانے آیا تھا کہ بابو ہردیال ۔ بابو جے نرائن اور ان سب لوگوں نے اس کی طرف بڑی بڑی چیزیں بھیجی ہیں ۔

مسٹر سیٹھی ۔ (بڑے اشتیاق سے) ہاں ہاں کیا کیا ؟

نوکر :۔ تو بابو جی آپ بھی اگر کہیں تو کچھ پھل پھروٹ ہی لے جاؤں

مسٹر سیٹھی (ترشی سے) گدھے درزیوں سے کپڑے سلوانے جائیں تو ساتھ پھل لے جایا کرتے ہیں ۔ میں تو اس لئے کہتا ہوں کہ لڑکی ہے بیچاری کچھ پیسے اسے ہی مل جائیں ۔

نوکر۔ ہاں حضور یہ بات تو ٹھیک ہے۔

(مسٹر سیٹھی اپنے کپڑے پر نفیس سا عطر چھڑکتے ہیں اور پھر نوکر کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

(نوکر آتا ہے)

مسٹر سیٹھی۔ کیوں کب آئے گی؟

نوکر۔ (بڑی مایوسی سے) حضور وہ تو کہتی ہیں ہم نے کبھی دوسروں کے گھر جا کر ناپ نہیں لیا۔

مسٹر سیٹھی۔ بس یہی جواب دیا ہے؟

نوکر۔ حضور یہی کہا تھا۔ میں کچھ اور سننے کے لئے کھڑا تھا کہ انہوں نے کہہ دیا بس جاؤ۔

مسٹر سیٹھی۔ (بے رخی سے) اچھا جاؤ۔

(پردہ)

(مسٹر سیٹھی ایک اعلیٰ قسم کا سوٹ پہن کر قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے اپنے حسن کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ان کے خوبصورت ہونٹوں پر ایک ہلکا سا تبسم آتا ہے اور پھر ساتھ ہی بڑے انداز سے گھومتے ہوئے وہ کپڑے کا بنڈل اٹھا کر کمرے سے باہر چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

(لیلا اپنے کمرے میں بیٹھی ہے مسٹر سیٹھی داخل ہوتے ہیں لیلا کرسی پر بیٹھے ہوئے چونک سی جاتی ہے)

لیلا۔ (سر پر ساڑھی کا آنچل ڈالتے ہوئے) کس سے ملنا چاہتے ہیں آپ؟

مسٹر سیٹھی۔ (مسکرا کر) .... آپ ہی سے۔

لیلا۔ (سنبھل کر بیٹھتے ہوئے) مگر معاف کیجئے آپ اجازت کے بغیر....

مسٹر سیٹھی۔ (پھر مسکرا کر) تو کیا مجھے آپ سے ملنے کی اجازت ہے؟

(لیلا نہایت متانت سے خاموش رہتی ہے)

مسٹر سیٹھی۔ (کھڑے کھڑے اب ذرا تمکنت سے) میں یہاں سامنے کے مکان میں رہتا ہوں۔ یہ سب بلڈنگ میری ہی ہے ....

لیلا۔ (نہایت بے پروائی سے) آپ یہی بتانے آئے ہیں۔

مسٹر سیٹھی۔ (گھبرا کر) ...... بات یہ ہے کہ میں نے سنا ہے کہ ...... آپ ....

لیلا۔ (پلکیں سکیڑتے ہوئے) میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔

مسٹر سیٹھی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ...... میں آپ سے چند قمیصیں سلوانا چاہتا ہوں۔ سنا ہے آپ سلائی کا کام خوب جانتی ہیں۔ یہ کپڑا میں لایا ہوں۔ اس کے ساتھ ایک سلی ہوئی قمیص بھی ہے وہ دیکھ لیجئے۔

لیلا۔ (بے پروائی سے) کپڑا رکھ جائیے۔

(دستکاری کی کتاب کھول لیتی ہے)

مسٹر سیٹھی۔ (بیٹھنے کے لئے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے) میں نے آپ کو بلانے کے لئے تین بجے کے قریب اپنے نوکر کو بھیجا تھا مگر آپ تشریف نہ لائیں۔ میں تو یہی سمجھا کہ آپ اپنے کام میں بہت ماہر ہوں گی۔

لیلا۔ (کتاب کا ورق الٹتے ہوئے) جی نہیں ماہر تو میں بالکل نہیں ہوں۔

مسٹر سیٹھی۔ خیر اب انہیں تیار تو کیجئے۔ تو کب تک ہو جائیں گی؟ تین ہیں۔

لیلا۔ (ورق گردانی کرتے ہوئے) پرسوں تک نوکر کو بھیج دیجئے۔

مسٹر سیٹھی۔ ہاں نوکر ...... یا میں خود آجاؤں گا۔ لیکن اگر یہ ہو سکے ...... بات یہ ہے کہ میرا درزی ...... بہت اچھا

لیلا۔ (بات کاٹتے ہوئے جلدی سے) تو بہتر یہی ہے آپ اسی سے سلوا لیجئے۔ مجھ سے کہیں خراب نہ ہو جائیں۔

مسٹر سیٹھی۔ اوہو! نہیں۔ نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں۔ میں تو یہ کہنا چاہتا تھا کہ میرا درزی اچھا کام نہیں کرتا۔ (پھر کچھ دیر خاموش کھڑے رہ کر) اچھا تو مجھے اب اجازت دیجئے۔

(مسٹر سیٹھی چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

(مسٹر ہردیال مسٹر جے نرائن کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ مسٹر جے نرائن داخل ہوتے ہیں)

مسٹر جے نرائن۔ (داخل ہوتے ہیں) اوہو کہئے مسٹر ہردیال! آپ کدھر سے راستہ بھول گئے! کہاں وہ دن کہ اکٹھے بیٹھے بیٹھے جی نہ بھرتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ کئی روز سے آپ کی شکل ہی نہیں دیکھی۔ میں تو آج خود جناب کی خدمت میں حاضر ہونے والا تھا۔ میں دل میں کہتا تھا کوئی قصور ہو گیا ہوگا معافی ہی مانگ آئیں۔

مسٹر ہردیال۔ سوال تو یہ ہے کہ پچھلے دنوں آپ کون سا قلعہ فتح کرتے رہے۔ میں سمجھتا تھا کہ آپ کہیں باہر جا چکے ہیں وہ تو کل آپ

کے نوکر سے علوم ہوا کہ صاحب گھر پر ہی ہوتے ہیں بلکہ اب دفتر سے بھی جلد اُٹھ آتے ہیں۔

مسٹر جے نرائن۔ بھئی بات یہ ہے کہ پچھلے دنوں میری طبیعت خراب رہی۔ میں تو سیٹھی صاحب سے ملنے کے لئے بھی نہیں گیا۔ معلوم نہیں اُن کا کیا حال ہے آپ تو وہاں آتے جاتے ہونگے

ہردیال۔ پچھلے دنوں مجھے بے حد مصروفیت رہی دفتر کا اتنا کام تھا کہ گھر پر بھی کرنا پڑتا تھا۔ باقی رہا سیٹھی صاحب کا سوال تو اُن کی دلچسپیاں آج کل کچھ اور ہیں (تپائی پر سے ایک کتاب اُٹھاتے ہوئے) اور سُنا تو یہ بھی ہے کہ آپ بھی بعض دھندوں میں پھنسے رہے ہیں۔

جے نرائن۔ (ہاتھ بڑھاتے ہوئے) بھئی یہ کتاب . . . .

ہردیال۔ (ورق گردانی کرتے ہوئے) اوہو کتاب کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی آپ میری بات کا تو جواب دیجئے۔

جے نرائن۔ (کرسی سے اُٹھتے ہوئے گھبرا کر) بھئی یہ کتاب دے دو۔ اس میں ایک پرائیو . . . .

(مسٹر ہردیال ہاتھوں سے کتاب کو پرے بچاتے ہوئے ایک کاغذ نکال کر دیکھتے ہیں مسٹر جے نرائن بے تابی سے ان کی طرف بڑھتے ہیں)

ہردیال (کرسی سے اُٹھ کر کاغذ پڑھتے ہوئے) بھئی واہ! پران پیاری!

(مسٹر جے نرائن کاغذ چھیننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہردیال اٹھ کر کمرہ میں بچتے ہوئے اِدھر اُدھر چلنا شروع کر دیتے ہیں اور ہر دفعہ پہلو بچا کر کاغذ پڑھتے جاتے ہیں)

پران پیاری!

ع نہ دیکھنے کی قسم کھا کے بھی تجھے ہم نے
ہزار مرتبہ بے اختیار دیکھا ہے

"کئی دن سے کوشش کر رہا ہوں، سوچتا ہوں کہ نہیں کیا لکھوں (جے نرائن ہنستے ہوئے جھپٹ کر ہاتھ بڑھاتے ہیں) مگر آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے من کی بات جس طرح بھی ہو تم سے کہہ دوں . . . ."

ہردیال۔ (ہنستے ہوئے) واہ! کیا کہنے! دیکھو دوست اب تو میں اسے پڑھ کر ہی رہوں گا آرام سے بیٹھ جاؤ!

جے نرائن۔ (متین بن کر) بھئی یہ بہت بُری بات ہے۔

ہردیال۔ (پھر کاغذ پڑھتے ہوئے) میں ڈرتا ہوں کہ اس کا کیا نتیجہ ہوگا (ایکٹنگ کرتے ہوئے) تم سامنے بیٹھ کر اپنے کام میں مشغول رہتی ہو اور میں دن میں کئی کئی بار تمہیں دیکھتا ہوں۔

(رُک رُک کر پڑھتے ہوئے)۔ (جے نرائن کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے کاغذ چھیننے کی کوشش بے کار جاری رکھتے ہیں)

ہردیال۔ کئی بار دیکھتا ہوں "اچھا جی" اور اس وقت مجھ پر نشہ سا چھا جاتا ہے۔ مجھے دنیا جہان کی کوئی خبر نہیں ہوتی۔ آخر جب تھک کر، ہار کر، بیٹھ جاتا ہوں تو تمہاری تصویر آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے دنیا میں میرے لئے کچھ نہیں صرف ایک میرا دل ہے جو تڑپ تڑپ۔

(جے نرائن کاغذ چھین کر پھاڑ دیتے ہیں)

ہردیال (ہنستے ہوئے) بھئی واہ! بہت اچھا! مگر افسوس کہ ظالم پر کچھ اثر نہ ہوا خط میں تو تم نے دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

جے نرائن۔ (ندامت آمیز ہنسی کے ساتھ) حضور کی مرضی بھی تو گئی تھی۔

ہردیال۔ جی ہاں مگر آپ کی طرح گڑگڑایا نہیں تھا۔ بڑی شان سے لکھا تھا کہ ہم آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آج یہ وقت ٹھیک رہے گا

جے نرائن۔ (سر سے اشارہ کرتے ہوئے) صاف انکار! توبہ! (پھر ہنستے ہوئے) ہاں یہ تو بتائیے آپ کے ہاتھ کا کیا حال ہے سُنا ہے آپ کھڑکی میں سے کسی کی طرف دیکھ رہے تھے کہ ہاتھ کیلے کے چھلکے پر سے پھسل گیا کچھ چوٹ ووٹ تو نہیں آئی؟

ہردیال۔ (ہاتھ دیکھتے ہوئے) نہیں چوٹ تو ایسی نہیں آئی۔ ذرا خراش سی ہے، مگر آپ تک یہ خبر کیسے پہنچی۔ اس دن یوں ہی سڑک پر کچھ شور سا ہو رہا تھا میں جو دیکھنے گیا تو اُلٹا اپنا ہاتھ زخمی کر بیٹھا۔

جے نرائن۔ (ہنس کر) اور دل پہلے ہی زخمی تھا۔ واقعی بہت تکلیف اٹھائی آپ نے؟

ہردیال۔ سچ کہتا ہوں آپ کا خط بڑا دردناک تھا عجیب بات ہے آپ کے تحفے تو قبول کر لئے گئے مگر اس کی شنوائی نہ ہوئی کچھ دن ہوئے اپنے نوکر سے یہ سُن کر بے حد افسوس ہوا۔

(دونوں ہنستے ہیں)

جے نرائن۔ خیر صاحب! ہم آپ کو بھی سچا سمجھتے ہیں ہم نے زندگی بھر میں اتنی حسین لڑکی خود کہیں نہیں دیکھی تھی۔ مگر مجھے تو ان نوکروں پر خیال آتا ہے معلوم ہوتا ہے ان کمبختوں نے بھی ایک اچھی خاصی سبھا بنا رکھی ہے۔ خیر خوب سمجھا کہ جس طرح یہ

دوسروں کی ایک ایک بات مجھے آکر بتاتا ہے۔ کہیں اسی طرح
میری باتیں بھی دوسروں تک نہ پہنچتی ہوں۔ سو میرا خیال ٹھیک
نکلا۔ اور میں نے پرسوں اسے نکال دیا۔

ہردیال۔ اچھا تو میں بھی آج چل کر اپنی "بھیگی بلی" کا حساب بے باق کرتا ہوں۔

(مسٹر جے نرائن ہنستے ہیں)

ہردیال۔ اور یہ بات سنی آپ نے؟ سیٹھی صاحب اس لڑکی سے کئی
ملاقاتیں بھی کر آتے ہیں۔

جے نرائن۔ (حیرت سے) سچ؟

ہردیال۔ جی ہاں اب سمجھ لیجئے کہ وہ بیچاری تباہ ہوئی۔ بڑے گھاگ
ہوئے سیٹھی صاحب۔

جے نرائن۔ بھئی ان کے پاس پیسہ ہے، وہ کبھی ختم ہونے کا نہیں صورت
شکل اچھی ہے۔ پڑھے لکھے ہیں۔ باتیں بنانا بھی جانتے ہیں۔
پھر جو کچھ وہ چاہیں، کیوں نہ ہوا کرے؟

ہردیال۔ میں تو آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ میری تبدیلی ہو گئی ہے۔

جے نرائن۔ (حیران ہو کر) ارے، غضب ہو گیا!

ہردیال۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اچھا تو مجھے اجازت دیجئے۔ پھر آؤں گا۔

جے نرائن۔ یہ تبدیلی والی خبر تو آپ نے بہت بری سنائی۔ ٹھہرئیے میں
بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ مجھے اسٹیشن تک جانا ہے۔

ہردیال۔ کیوں؟ کس لئے؟

جے نرائن۔ ہماری بیگم صاحبہ سسرال سے آ رہی ہیں آج، وہاں ننھا بیمار
ہو گیا تھا۔ (ذرا ٹھہر کر) وہ کہیں گی تو سہی وہ نوکر کہاں ہے ....

ہردیال۔ (بات کاٹتے ہوئے ہنس کر) جی ہاں مگر اب انہیں کسی بات کا
پتہ تو نہیں لگ سکے گا۔

(دونوں ہنستے ہیں) (پردہ)

مسٹر سیٹھی لیلا کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ لیلا ذرا لیٹ کر ایک کرسی پر بیٹھی کچھ
بُن رہی ہے۔ ہاتھوں میں سلائیاں تیزی سے چل رہی ہیں)

مسٹر سیٹھی۔ آپ کی سلی ہوئی قمیصوں کی تعریف میں اب میں کیا کہوں۔

لیلا۔ (مسکرا کر) اس تعریف کے لئے شکریہ۔ مگر آپ کی ان قیمتی
کرسیوں اور قالین کی تو مجھے بالکل ضرورت نہیں آپ نے
ناحق بھجوا دیں۔

مسٹر سیٹھی۔ (مسکرا کر) لیکن اگر یہ اپنی جگہ پڑی رہیں تو شاید کوئی حرج بھی نہ ہو

لیلا۔ مگر میں تو آپ کے لئے بالکل اجنبی ہوں اور آپ کو ....

مسٹر سیٹھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو میری یہ جرأت ناگوار گذری ہے۔

لیلا۔ جی نہیں آپ بھی تو اپنی اس نوازش کو بے جا سمجھتے ہوں گے۔

مسٹر سیٹھی۔ (مسکراتے ہوئے) آپ اس معمولی سی بات پر مجھے بے حد شرمسار
کر رہی ہیں۔

لیلا۔ لیکن یہ چیزیں آپ کے گھر میں بھی تو اتنی ہی اچھی لگیں گی۔
بات یہ ہے کہ مجھے ان کی ضرورت ہی نہیں۔ معاف کیجئے میں
آپ کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے ....

مسٹر سیٹھی۔ (ذرا ہنس کر) جی یہ چیزیں اب میرے گھر تو جا ہی نہیں سکتیں۔
آپ کے ہاں تو یہ بازار سے آئیں۔ میرے گھر سے نہیں۔

لیلا۔ (متانت سے) میں آپ کا مطلب سمجھی نہیں۔

مسٹر سیٹھی (پھر ہنس کر) یہی کہ اگر یہ چیزیں یہاں سے میرے گھر گئیں تو پھر
مجھ پر آپ کی بے جا نوازش ہو جائے گی۔ میری نوازش تو صرف
آپ ہی جانتی ہیں۔ مجھ پر آپ کی نوازش کا علم سب کو ہو جائے گا

(خود ہی ہنستے ہیں)

لیلا۔ (ہلکی سی تیزی سے) خواہ مخواہ تکلیف کی آپ نے۔

مسٹر سیٹھی۔ آپ اسے قطعاً تکلیف نہ سمجھیں۔ میں آپ کا ہمسایہ ہوں کوئی
خدمت کر سکوں تو ایک فرض سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔

لیلا۔ (متانت سے) شکریہ!

مسٹر سیٹھی۔ (جیسے بڑے وثوق سے) یہ سینے پرونے کا کام بھی دراصل بڑا
مشکل ہے۔

لیلا۔ (آہستہ سے) جی ...... ای

مسٹر سیٹھی۔ لیکن میں حیران ہوں کہ آپ نے یہ کام کیوں شروع کیا۔ آپ تو...

لیلا۔ اس لئے کہ اس میں مجھے کوئی بندھن نہ ہو گا۔

مسٹر سیٹھی۔ اچھا تو گویا آپ نے اپنے کام کی پہل یہیں سے کی ہے؟

لیلا۔ جی!

مسٹر سیٹھی۔ میں سمجھتا ہوں آپ کے لئے یہ جگہ بہت اچھی رہے گی۔ پھر
ہم لوگ بھی آپ کے آرام کا خیال رکھیں گے۔

لیلا۔ (ہلکی سی مسکراہٹ سے) شکریہ!

مسٹر سیٹھی۔ (آہستہ سے) یہ قمیصوں کی سلائی!

(ہاتھ سے دس روپے کا نوٹ آگے بڑھاتے ہیں)

لیلا۔ (ہنستے ہوئے ذرا اوپر دیکھ کر) تین قمیصوں کی اُجرت صرف ایک روپیہ دو آنے ہے۔ میرے پاس باقی (شرمندہ ہو کر) آپ رہنے دیجئے۔

مسٹر سیٹھی۔ (مسکرا کر) آپ لیجئے تو سہی یہ تو میری مرضی ہے نا!

لیلا۔ (لجا کر) آپ اپنے درزی اور مجھ میں فرق کیوں کر رہے ہیں۔ جو کچھ آپ اسے دیتے ہیں، وہی مجھے دیجئے۔

مسٹر سیٹھی۔ (ہنس کر) اجی اس کی آپ نے ایک ہی کہی۔ (نوٹ تپائی پر رکھ کر اٹھتے ہوئے) آپ کا بہت وقت ضائع کیا ہے۔ (ہنس کر) کیا مجھے کبھی پھر حاضر ہونے کی اجازت ہے۔

لیلا۔ (نیچی نظروں سے اُٹھ کر) جی ہاں! جب آپ چاہیں۔ بلکہ میں تو آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ نے . . . .

مسٹر سیٹھی۔ (ہنس کر) اوہو! جانے بھی دیجئے۔

(مسٹر سیٹھی چلے جاتے ہیں۔ لیلا مسکراتی ہے اور پھر ایک عجیب انداز میں "جی جی سچ کہتی تھیں" کہہ کر آرام کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

(پردہ)

مسٹر سیٹھی اپنے ڈریسنگ روم میں قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے نکٹائی کی گرہ کھول رہے ہیں پھر تھوڑی دیر منہ سے سیٹی بجا کر آہستہ سے کہتے ہیں "رُوپ کہیں اس سے زیادہ نہیں دیکھا۔ ایک روپیہ دو آنے! کیوں میری جان کیوں نہیں! میرا سب کچھ کیوں نہیں" ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہیں اور پھر نکٹائی کو نیچے سے پکڑ کر غصہ سے جھٹکا دیتے ہوئے کہتے ہیں کھل بھی جا کمبخت!

نوکر داخل ہوتا ہے۔

نوکر۔ (دروازے کے باہر ہی سے) حضور شنکر سے باتیں کر رہے ہیں۔ تو میں یونہی ڈھونڈتا پھرا (دروازے میں کھڑے ہو کر حیرانی سے) شنکر نہیں یہاں جی (شرمسار ہو کر) میں سمجھا آپ سے بیٹھا باتیں کر رہا ہے (پھر تپائی پر رکھی ہوئی قمیصیں دیکھ کر) سل گئیں قمیصیں حضور؟

(مسٹر سیٹھی آئینہ کے سامنے خاموشی سے نکٹائی کی گرہ کھولنے میں مصروف رہتے ہیں)

نوکر۔ (مسکراتے ہوئے) حضور رہے نا لڑکی اپنے رُوپ اور اپنی چھب میں لاجواب۔

مسٹر سیٹھی۔ (انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے) اِدھر آؤ۔

نوکر۔ (ڈرتے ہوئے) حضور!

مسٹر سیٹھی۔ (زور سے) آگے آؤ!

نوکر ڈرتے ڈرتے ایک قدم آگے بڑھاتا ہے۔ سیٹھی صاحب خود آگے بڑھ کر زور سے اُسے ایک چپت رسید کرتے ہیں۔ مگر وہ بازوؤں سے بچا لیتا ہے۔

مسٹر سیٹھی۔ (غصہ میں) کمبخت اب تو حد سے بڑھ گیا ہے۔ سُن اگر آئندہ تو نے اُن بی بی جی کے متعلق کچھ کہا تو سمجھ لے تیری خیر نہیں۔ بدتمیز کہیں کا۔ جا کام کر۔

نوکر کمرہ سے باہر چلا جاتا ہے اور ذرا دُور جا کر آہستہ سے کہتا ہے "ایک آ آ کر سب کچھ بتائیں ایک مار کھائیں۔ لو آج بدتمیز بھی ہو گئے ہم"

(پردہ)

مسٹر سیٹھی لیلا کے کمرے میں بیٹھے ہیں۔ لیلا ایک نفیس ساڑھی پہنے ہوتے ہے

مسٹر سیٹھی۔ (سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے) نومبر، دسمبر دو مہینے ہو گئے یہاں آپ کو آئے ہوئے، میں آٹھ نومبر کو پہلی دفعہ اس کمرے میں آیا تھا۔ توبہ توبہ! یاد ہیں وہ پہلے دو تین دن! اور وہ کرسیاں اور قالین تو میں بھیج بیٹھا۔ مگر اس کا جواب آپ کو کیا دیتا کہ کیوں بھیجیں۔ یہ تو صاف کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ کیا میری جان بھی حاضر ہے۔

لیلا۔ (مسکراتے ہوئے) جی ہاں! اور یہ بھی آپ نے سوچا ہو گا کہ وہاں جا کر کھڑا کون رہے گا۔ (شوخی سے) کیوں ٹھیک ہے نا!

مسٹر سیٹھی۔ (ہنستے ہوئے) بہت دُور کی سوچتی ہیں آپ!

لیلا۔ خوب! سوچتے آپ ہیں اور نام میرا۔

مسٹر سیٹھی۔ اتنا شکر ہے کہ جب دوسری دفعہ میں ساڑھیاں لایا تو آپ نے زیادہ سوال نہیں کئے۔ پھر تو خیر؟

لیلا۔ ارے ہاں۔ میں آپ کے ہار کا شکریہ ادا کرنا تو بھول ہی گئی بہت خوبصورت ہے کیا قیمت ہے اس کی؟

مسٹر سیٹھی۔ بہت معمولی۔

لیلا۔ (لاڈ سے) پھر بھی

مسٹر سیٹھی۔ (جیسے کوئی بہت معمولی بات ہو) یہی . . . کوئی ساڑھے چھ سَو۔

لیلا۔ غضب کر دیا آپ نے۔ دیکھئے جی اب اتنی فضول خرچی نہ کیا کیجئے۔

مسٹر سیٹھی۔ (ہنستے ہوئے) اوہو! شادی سے پہلے ہی نصیحتیں!

لیلا - نہیں تو اور! چوڑیاں بھی لائے تو کم نہیں، چار سَو کی -
مسٹر سیٹھی - مگر، تو جناب ہی نے کہا تھا کہ آپ ایسے ہاتھوں کی تعریف کرتے ہیں جن میں چوڑیاں بھی نہیں - کیوں بھول گئیں آپ؟ اور ہار پہننے کو بھی تو میرا ہی جی چاہتا تھا
لیلا - (آنکھوں کی پتلیوں کو ایک عجیب طریقے سے حرکت دیتے ہوئے) سچ مانئے! میں نے تو یونہی کہا تھا - آپ لے آئے تو میں دھک سے رہ گئی - اچھا اور بہت نئے فیشنوں کی ساڑھیاں لے آتے ہیں جو آپ؟ (ہنستے ہوئے) اور ہاں اب اگر سینڈل لائیں تو ان کے پہننے کے طریقے بھی کسی میم سے پوچھ آیا کیجئے -
مسٹر سیٹھی - (قہقہہ لگاتے ہوئے) لیکن مَیں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری لائی ہوئی چیزوں میں سے ایک بھی آپ کی شانِ حسن کے مطابق نہیں ہوتی -
لیلا - (مسکرا کر) اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ عورتوں کے لئے چیزیں خریدنے کا ڈھنگ شاید آپ کو قدرت نے خود سکھا کر بھیجا تھا -
مسٹر سیٹھی - اچھا تو پھر آج سینما چل رہی ہیں نا؟
لیلا - (عجز سے) جی نہیں، آج نہیں -
مسٹر سیٹھی - کیوں؟
لیلا - یُوں ہی ہر روز سینما دیکھتے دیکھتے کچھ جی اُکتا سا گیا ہے - کچھ دن ٹھہر جائیے پھر دیکھ لوں گی آپ کتنی سیریں کراتے ہیں -
مسٹر سیٹھی - سچ! شادی کے بعد کہیں باہر چلیں گے -
لیلا - میں بھی یہی سوچا کرتی ہوں -
مسٹر سیٹھی - ہاں تو پھر آج......
لیلا - (منت سے) نہیں آج نہیں - سچ! آج بالکل دل نہیں چاہتا -
مسٹر سیٹھی - میری خاطر سے تکلیف اٹھائیے -
لیلا - چلئے آج آپ ہی میری خاطر سے اکیلے ہو آئیے - دیکھوں آپ میری بات بھی مانتے ہیں یا نہیں -
مسٹر سیٹھی - (ہنس کر) مسٹر موہن کے جانے سے تو اداس نہیں ہوئیں آپ؟
لیلا - جی نہیں - البتہ آپ نے اُن پر اپنا بڑا اچھا نقشہ جمایا! مان لیا آپ نے دعوت کی لیکن اگر وہ اتفاقاً آ بھی گئے تو آپ کو یُوں پریشان نہ ہونا چاہئے تھا - آپ تو انہیں یہاں دیکھ کر کٹے بکٹے رہ گئے - ایک آدمی اتنی دُور سے مجھے ملنے آیا پھر میرے ساتھ کھیلا ہُوا - میں اس سے باتیں تو کرتی رہی مگر ساتھ ساتھ آپ کی طرف بھی دیکھ رہی تھی - بس چُپ چاپ بیٹھے رہے جیسے مُنہ میں زبان ہی نہیں -
مسٹر سیٹھی - اُفوہ! نہیں نہیں (جیسے سمجھاتے ہوئے) کل میری طبیعت خراب تھی اور کوئی بات نہیں تھی -
لیلا - جی ہاں اور جب آپ کے نوکر نے کہا کہ باوجی گھر میں تو کہتے تھے جلدی کرو بھوک لگی ہے اور اب کچھ کھائے بنا ہی چلے گئے ہیں تو میں اور شرمسار ہوئی - آپ کھانا تو اچھی طرح کھا لیتے -
مسٹر سیٹھی - (مایوسانہ لہجے میں) بڑا پاگل کا بچہ ہے! بات ...... میں جانتا ہوں کہ مجھے یہاں بیٹھنا چاہئے تھا اگر میری طبیعت واقعی خراب تھی -
لیلا - اچھا جانے دیجئے اس بات کو - ہاں مسٹر موہن بہت افسوس کرتے تھے کہ اُن کی وجہ سے آپ کو تکلیف ہوئی - آپ سے معذرت کرنے کو کہہ گئے تھے -
مسٹر سیٹھی - (ہنس کر) معذرت کی اس میں کون سی بات ہے بلکہ اگر وہ یہاں ہوتے تو میں خود اُن سے معافی مانگتا -

(خاموشی)

لیلا - (نرم لہجہ میں) ناراض ہو گئے؟
مسٹر سیٹھی - (مسکراتے ہوئے) واہ! کس بات پر؟ ہاں بھئی دیکھئے مجھ سے اب یوں اکیلے نہیں رہا جاتا -
لیلا - اُفوہ! اتنی بے تابی! پہلے میری شرط تو پُوری کیجئے - آپ کا کیا مطلب ہے ہینگ لگے نہ پھٹکڑی آپ کی شادی ہو جائے، جی ہاں! بڑے بھولے ہیں آپ!
مسٹر سیٹھی - (ہنستے ہوئے) لیکن ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ محبت میں روپے کا سوال کہاں سے آ گیا - پھر کم بھی نہیں پُورے آٹھ ہزار!
لیلا - (بڑے ناز سے) اور ہماری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جب کسی کا روپیہ کسی کے اپنے کام ہی آنا ہو تو دوسرے پر احسان کیسا؟
مسٹر سیٹھی - کوئی بھلا کیا جانے کہ آٹھ ہزار روپے کسی کی ایک ادائے ناز کا بھی مول نہیں پا سکتے -

(تپائی پر آٹھ ہزار روپے کے نوٹ گِن گِن کر رکھ دیتے ہیں)

لیلا۔ (نوٹ اٹھاتے ہوئے) دیکھئے جی! اب آئندہ آپ کی سب فضول خرچیاں بالکل بند ہو جائیں۔ میرے لئے اگر آپ کوئی چیز لائے تو میں نہیں لُوں گی آپ کو گھر میں رہنا ہوگا۔ سیدھی سادی طرح۔ سب کچھ ہم خرچ کیا کریں گے اپنے گھر میں۔

مسٹر سیٹھی (حیران بن کر) پرماتما ہی ہے اب ہمارا۔ اب تو گھر میں دورانیاں راج کریں گی۔ ایک خوبصورتی۔ دُوسرے بیوی۔

لیلا۔ جی ہاں مَردوں نے تو یہ سمجھ رکھا ہے کہ بیوی گویا ایک ستار ہے، بجایا اور دیوار پر لٹکا دیا۔

مسٹر سیٹھی۔ جب میں پہلے دن آیا تو رانی صاحبہ اُس جگہ بیٹھی تھیں۔ نیلا جمپر پہنے اور موتیا رنگ کی ساڑھی۔ میں بھی کئی ساڑھیاں لایا ہوں مگر وہ کچھ بات ہی اور ہے۔ پھر بے پروایانہ انداز میں جو شہزادی صاحبہ نے میری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تو میری جان ہی نکل گئی۔ لیکن معاف کیجئے! رنگ جناب کا اس دن بھی میری صورت دیکھ کر سُرخ ہو گیا تھا۔ اور یہ ست و بیازی ہونٹ! جیسے ہوا میں ہراتی ہوئی پھول کی پتیاں!

(لیلا مسکرا دیتی ہے)

میری آنکھیں خود ہی جُھک گئیں کہ آپ کے پاؤں دیکھ لئے اُس دن پاس سیاہ مخمل کا سلیپر پڑا تھا۔ آپ نے جو دیکھا کہ میں جھکی جھکی آنکھوں سے پاؤں دیکھ رہا ہوں تو جھٹ ساڑھی میں چھپا لئے۔ مگر جناب پھر کئی روز تک یہ گورے گورے پاؤں آنکھوں کے سامنے ہی پھرتے رہے۔

لیلا۔ (مسکراتے ہوئے بڑے ناز سے) اب تو بڑی صاف چلنے لگی ہے زبان۔ اور جس دن آئے تھے "میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ میرا مقصد یہ ہے۔ دیکھئے نا! بات یہ ہے کہ" بس اسی میں بات پُوری ہو کر رہ جاتی تھی۔

(دونوں قہقہہ لگا کر ہنستے ہیں)

لیلا۔ (ہنسی روکتے ہوئے) اور معاف کیجئے میں آپ کو پہلے بھی دیکھ چکی تھی۔ وہ سامنے کھڑکی کے سامنے، دے چکّر پہ چکّر!

(دونوں پھر قہقہہ لگاتے ہیں۔ لیلا ہاتھوں سے پسلیاں تھام لیتی ہے)

اُف توبہ میری! اُس چھوٹی سی جگہ میں آپ ہر روز تین چار میل چلتے ہوں گے۔ تھک نہیں جاتے تھے؟

مسٹر سیٹھی۔ (ہنسی کو روکتے ہوئے) اچھا اب مذاق تو بہت ہو چکا۔ اب کوئی فیصلہ کر لیجئے۔

لیلا۔ فیصلہ، فیصلہ یہی کہ (گھڑی کو دیکھتے ہوئے) اس وقت ساڑھے بارہ بجے ہیں۔ آپ کی گھڑی خوب وقت دیتی ہے۔

مسٹر سیٹھی۔ (مسکراتے ہوئے) شکریہ! بات کیجئے۔

لیلا۔ ہاں تو میں کل صبح یہاں سے آپ کے ہاں چلی آؤں گی۔ آج شام آپ کھانا میرے ہاں کھائیے۔

مسٹر سیٹھی۔ (ہنس کر) نیکی اور پُوچھ پُوچھ۔ کچھ چیزیں بندہ بھی آپ کے ہاں بھجوا دے گا۔

لیلا۔ (ہنس کر) یہ اور بھی اچھا رہے گا۔

مسٹر سیٹھی۔ اچھا تو مجھے اجازت دیجئے۔ پانچ! نہیں چھ بجے کے قریب آؤں گا۔ (مسٹر سیٹھی چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

(سیٹھی صاحب کا ڈرائنگ روم۔ مسٹر جے نرائن اکیلے بیٹھے اخبار دیکھ رہے ہیں۔ مسٹر سیٹھی داخل ہوتے ہیں)

جے نرائن۔ (آنکھوں سے اخبار ہٹاتے ہوئے) بس اب تو کسی کام کا نہیں رہا۔ رنگ گئے تیرے یہ وطیرے۔

مسٹر سیٹھی۔ (بڑی خوشی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے) ہاتھ لا پہلے ہاتھ۔

جے نرائن۔ (حیران ہو کر ڈھیلا سا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) کیوں آکر آیا ہے کوئی قلعہ فتح؟

مسٹر سیٹھی۔ (جے نرائن سے ہاتھ ملا کر جھٹکتے ہوئے) مار لیا میدان!

جے نرائن۔ (ہاتھ پکڑ کر) بیٹھ تو سہی یار۔

مسٹر سیٹھی۔ (صوفے پر بیٹھتے ہوئے فرطِ مسرت سے) شادی!

جے نرائن۔ (حیران ہو کر) سچ؟

مسٹر سیٹھی۔ تیری قسم۔

جے نرائن۔ بھئی مان گئے!

مسٹر سیٹھی۔ (بڑے غرور سے) تجھ سے کہا نہ تھا میں نے؟

جے نرائن۔ (بڑے ولولے سے) بھابھی جان خوبصورت بڑی ہیں یار چھا!

مسٹر سیٹھی۔ تو ہم دو مہینے یُوں ہی رات دن ایک کرتے رہے ہیں؟

جے نرائن۔ محنت کا پھل۔

مسٹر سیٹھی۔ کل دعوت ہے استاد (ہنستے ہوئے) اپنی اُس بُڑھیا کو بھی لے آنا۔

جے نرائن - (ہنستے ہوئے جیسے مارنے کے لئے کرسی سے اٹھ کر) خبیث ہماری میم صاحبہ کی یہ گستاخی؟

مسٹر سیٹھی - (ہنستے ہوئے) او! نہیں بابا نہیں۔ مان لیا تیری جورو اپنے وقت کی پری ہے۔

جے نرائن - (اپنی جگہ پر بیٹھتے ہوئے) پھر وہی بکواس! وہ چٹک مٹک، پہننا اوڑھنا، ہنسی مذاق گھر کی عورتوں میں نہیں ہوتا۔

مسٹر سیٹھی - (جیسے ڈانٹ کر) ذرا سیدھے ہو کر بیٹھئے جی! اس کا مقابلہ تو آپ کی کوئی بڑی شریف خاندانی لڑکی بھی نہ کر سکے۔ وہ بڑے اونچے گھرانے کی ہے۔ دو مہینے سے وہاں جا رہا ہوں لیکن آج تک میں نے اس سے ہاتھ تک ملانے کی جرأت نہیں کی خاندان! خاندان!

جے نرائن - (ہنستے ہوئے) تو بڑی اچھی بات ہے۔ نہیں بھی کوئی قابو میں رکھنے والی آ رہی ہے۔

مسٹر سیٹھی - تیری قسم بڑی سلیقے والی لڑکی ہے۔ مجھے آج ہی ڈانٹ رہی تھیں فضول خرچی نہ کیا کرو۔

جے نرائن - (کرسی سے اٹھتے ہوئے) لو دوست میں جا رہا ہوں۔

مسٹر سیٹھی - ارے ٹھہرو یار۔ میرے ساتھ بازار تک چلو۔ تمہاری بھابی کے لئے کچھ چیزیں خریدیں گے۔

جے نرائن - (منت سے) نہیں بھئی میری طبیعت خراب ہے۔ نہیں تو اس سے بڑھ کر خوشی کا کیا کام ہوگا۔

مسٹر سیٹھی - اچھا رات کو آنا ذرا۔ پروگرام بنائیں گے کل کا۔

جے نرائن - (جاتے ہوئے) اچھا!

مسٹر سیٹھی - (بلند آواز سے) ضرور!

(پردہ)

(شام کے چھ بجے مسٹر سیٹھی لیلا کے کمرے میں تیز تیز داخل ہوتے ہیں)

لیلا - (مسٹر سیٹھی کو دیکھتے ہی) آگئے آپ۔ آپ ہی کے انتظار میں تھی۔

مسٹر سیٹھی - (مسکراتے ہوئے) چیزیں پہنچ گئیں؟ اور آپ نے اتنے سادہ کپڑے کیوں پہن لئے۔

لیلا - (ناز سے) صاحب بہادر کے لئے دو تین چیزیں اپنے ہاتھ سے تیار کروں گی۔

مسٹر سیٹھی - (خوشی سے) خوب!

لیلا - دیکھئے نہ میری عقل کو کیا ہوا۔ سچ! ایک کام کر دیجئے۔ (کاغذ دیتے ہوئے) یہ چیزیں لا دیجئے بازار سے۔

مسٹر سیٹھی - (کاغذ لیتے ہوئے) مجھے تو اپنے کام سے بھی بازار جانا ہے آپ کا کہنا سر آنکھوں پر۔

لیلا - (مسکراتے ہوئے) دیکھئے کچھ زیادہ خریدنے کی ضرورت نہیں کیا کچھ خریدنے جا رہے ہیں آپ؟

مسٹر سیٹھی - سب کچھ اپنی رانی کے لئے (کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر) اچھا تو جا رہا ہوں۔ اب کھانے کے وقت ہی شاید پہنچ سکوں۔

لیلا - جی اچھا۔ (مسٹر سیٹھی چلے جاتے ہیں)

(پردہ)

(شام ساڑھے سات بجے مسٹر سیٹھی اپنے کمرہ میں داخل ہوتے ہیں)

مسٹر سیٹھی - (نوکر کو آواز دیتے ہوئے) او! رگھو! رگھو کے بچے"! دینو! شنکر۔ رگھو۔ سب مر گئے کمبخت۔

(دور سے آواز آتی ہے آیا حضور۔ نوکر داخل ہوتا ہے)

مسٹر سیٹھی - کمبختو سو جاتے ہو کیا؟ جا سارا سامان گاڑی پر سے لے کر اوپر آ۔ اور دیکھ کھانا تیار ہو گیا ہے۔ جو کچھ کہا تھا۔۔۔۔۔۔

نوکر - بالکل تیار ہے حضور!

مسٹر سیٹھی - اچھا تو برتن اور کھانا بی بی کے ہاں بھجواتے جاؤ۔

نوکر - بہت اچھا حضور۔

مسٹر سیٹھی - اور ہاں دیکھو! یہ لو کارڈ۔ اور اس کاغذ پر نام لکھے ہوئے ہیں۔ ڈرائیور سے کہو منشی کے پاس چلا جائے اور اس سے کہے کہ ان نام کارڈوں پر پتے لکھ کر آج رات ہی بڑے ڈاک خانہ میں پوسٹ کر دے۔ پرسوں ہمارے ہاں کچھ دوست آئیں گے۔ سمجھے؟

نوکر - اجی سب کچھ سمجھ گیا حضور!

(نوکر چلا جاتا ہے۔ اور سیٹھی صاحب ڈریسنگ روم میں داخل ہو کر لباس تبدیل کرتے ہیں)

(نوکر آتا ہے)

مسٹر سیٹھی - (جلدی سے کوٹ پہنتے ہوئے) کیوں رگھو چلی گئیں چیزیں۔

نوکر - جی ہاں بس اب کے کوارٹر بلیٹیں اور چمچے لے جا رہا ہوں۔ میز پر چن دیا ہے حضور وہاں کھانا!

مسٹر سیٹھی - اچھا تو بی بی جی کو بول آنا صاحب بھی آ رہے ہیں۔
نوکر - اجی نیچے تو نہیں ہیں وہ!
مسٹر سیٹھی - (کوٹ کے بٹن بند کرتے ہوئے بے پروائی سے) ہاں وہ اوپر ہوں گی چھت پر۔
نوکر - اچھا حضور۔

(نوکر چلا جاتا ہے مسٹر سیٹھی سیٹی بجاتے ہوئے آئینے کے سامنے چلے جاتے ہیں اور پھر گنگناتے ہوئے چمڑے کے ایک سوٹ کیس میں اوپر نیچے ساڑھیاں رکھنا شروع کرتے ہیں۔ نوکر داخل ہوتا ہے۔)

نوکر - حضور بی بی جی تو اوپر بھی نہیں ہیں۔
مسٹر سیٹھی - (تیوریاں چڑھا کر) کیا بکواس کر رہے ہو؟ (سوٹ کیس میں ایک ساڑھی ٹھیک کرتے ہیں)
نوکر - (دبی آواز میں) اجی بی بی جی اوپر نہیں ہیں۔ راستے میں رام لال خانساماں ملا تھا۔ کہتا تھا۔ وہ تو گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ ہوا چلی بھی گئیں۔ اجی وہ رہتا ہے ان کے نیچے احاطے میں۔
مسٹر سیٹھی - (کھڑے ہو کر) پاگل کا بچہ!

(تیزی سے کمرے سے باہر نکل جاتے ہیں)

(ایلا کا کمرہ۔ مسٹر سیٹھی گھبرائے ہوئے چھت پر جاتے ہیں۔ اور پھر تیزی سے نیچے اتر آتے ہیں۔ مسٹر سیٹھی سراسیمگی کے عالم میں پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ اور پھر تپائی پر پیڈ کے ایک لکھتے ہوئے کاغذ اور بنڈل کی طرف بے تابی سے لپکتے ہیں۔ کاغذ اٹھا کر جلد جلد پڑھتے ہیں۔)

(مجھے ایک بہت ضروری کام پڑ گیا ہے۔ اس لئے جا رہی ہوں۔ میری اس پیازی ساڑھی اور جمپر کی آپ بہت تعریف کیا کرتے تھے۔ یادگار کے طور پر چھوڑ رہی ہوں۔ امید ہے آپ سے پھر جلد ہی ملوں گی

آپ کی ...... ایلا"

(مسٹر سیٹھی کاغذ ہاتھ میں لئے ہوئے آرام کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ کاغذ ہاتھ سے نیچے گر پڑتا ہے سیٹھی صاحب جھکے ہوئے سر کو ہاتھوں سے تھام لیتے ہیں سامنے میز پر چاندی کے برتن جگمگا رہے ہیں۔ گرم گرم چیزوں سے آہستہ آہستہ بھاپ اٹھ رہی ہے"

تیسرا سین

لکھنؤ۔ کی مال روڈ سے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک نیا اور خوبصورت بنگلہ جس کے دو دروازوں میں ایک پر ایل سدرشن لکھا ہے۔ کوٹھی کے اردگرد باغ اور گھاس کے خوشنما تختے ہیں۔ برآمدے پر چڑھی ہوئی بیلوں سے سرخ پھولوں کے گچھے ایک دوسرے پر لٹک رہے ہیں۔ اور گھاس کے تختوں میں بھی پھول جا بجا کثرت سے کھل رہے ہیں۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ ہر جگہ پھولوں سے ڈھکے ہوئے گملے پڑے ہیں۔ بڑے برآمدے کے بغلی کمرہ میں تیز خدوخال کا ایک نوجوان چست پاجامہ اور ریشمی مگر سادہ قمیض پہنے ہوئے خاموش بیٹھا سگرٹ پی رہا ہے۔ بال کچھ پریشان سے ہیں۔ سامنے تپائی پر ایک کتاب کھلی پڑی ہے۔ کمرہ کے سکلف فرش پر قیمتی کرسیاں پڑی ہیں۔ دیواروں پر ایکٹرسوں کی تصویروں کے علاوہ تاج محل اور ایک خوبصورت نظارے کی تصویریں بھی آویزاں ہیں۔ تپائی پر سگرٹوں کے اور ڈبے کھلے پڑے ہیں۔ یکایک موٹر کا ہارن سنائی دیتا ہے ......

قہقہوں کی آوازیں ..... ڈیوڑھی میں موٹر رک جاتی ہے۔ بھڑکیلے لباسوں میں ملبوس تین نوجوان نئی موٹر کے دروازوں کو ضرورت سے زیادہ زور کے ساتھ بند کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔)

سدرشن - (کرسی سے اٹھتے ہوئے) خاصی دیر کر دی تم لوگوں نے، ڈرائنگ روم میں نہ بیٹھیں؟
ایک نوجوان - (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) ٹھیک ہے یار۔ یہ نواب کے بچے تو آتے ہی نہیں تھے۔ کمار گھر چلا گیا اور کنور ٹامی کہتا تھا۔ میں شیو کے بغیر آج تک کبھی باہر ہی نہیں نکلا۔
کنور - (متانت سے کٹ اتارتے ہوئے بیٹھے ہوئے نوجوان سے) دلجیت یار! یہ ذرا اپنی ناک ادھر کرنا کوٹ ٹانگنا ہے۔

(سب ہنستے ہیں)

سدرشن - (ہنستے ہوئے) یار کوئی اتنی لمبی تو نہیں دلجیت کی ناک۔
کمار - بھئی ہمیں بھی کہیں بیٹھنے دو۔

(کرسی گھسیٹ کر سب کے نزدیک کر لیتا ہے)

کنور - کوئی گھر میں تو نہیں ہے۔
سدرشن - نہیں چچا ابھی چلے گئے ہیں واپس۔ بڑے خفا ہو کر گئے ہیں کہ تم ایسے ہو۔ ویسے ہو۔
کنور - (ہنس کر) بھئی واقعی سدرشن وہ ہیں بھی سچے۔ تم حد سے زیادہ آزادی سے کام لینا چاہتے ہو۔ وہ سب ہوئے پرانے خیالوں والے دیکھو نا بھئی پہلے بھی تم نے ......
سدرشن - جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد + پر طبیعت ادھر نہیں آتی
کنور - ہاں مگر تمہارے سب رشتہ دار یہی سمجھتے ہیں کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو

وہ ہمارے ساتھ بیٹھنے اُٹھنے کا نتیجہ ہے۔

کمار ۔ نہیں بھئی سوچنے کی تو یہ بات ہے کہ آخر اس کا کوئی نتیجہ بھی نکلے گا۔ تم اُس لڑکی سے تقریباً دو مہینے سے مِل رہے ہو۔ ہم مانتے ہیں تمہارے پاس روپیہ ہے لیکن اُسے یوں ضائع کر دینا عقلمندی کی بات نہیں۔ تم اُسے تین چار سو روپیہ ماہوار سے بھی کیا کم دیتے ہوگے۔ پھر تحفے تحائف الگ۔ اور میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں اس بات سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہم تو تمہارے لئے کہتے ہیں سچ تمہارا رنگ زرد ہوگیا ہے۔

سدرشن ۔ (سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے) بھئی میں کیا کروں۔ میں اُس کے بغیر ایک پل زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم روپیہ کہتے ہو۔ ہم اُس کے لئے اپنی جان تک دینے کو تیار ہیں۔

کمار ۔ لیکن اُس پر بھی تمہاری محبت کا کچھ اثر ہے یا نہیں۔ کیا وہ تم سے شادی کرے گی۔

سدرشن ۔ (سگرٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے) ہاں۔

کنور ۔ بھئی دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ یار یہ اخبار دینا ذرا۔

کمار ۔ نہ تمہارے ساتھ وہ کبھی سیر کو نکلی ہے نہ وہ کبھی یہاں آئی۔ اور جناب اگر وہ اتنی آزاد ہے کہ گھر میں اکیلی رہ کر ایک غیر آدمی سے ملنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی۔ تو اُسے کبھی یہاں بھی آنا چاہیئے تھا اگر وہ تمہیں ہر لحاظ سے دیکھ کر شادی کرنا چاہتی ہے تو میرا خیال ہے پھر اُسے یہاں . . . . .

سدرشن ۔ معاف کیجئے وہ ایک نہایت شریف لڑکی ہے جس کا دنیا میں کوئی نہیں۔ اور وہ کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتی جس سے تربیت یافتہ عورتیں بدنام ہوں۔

کمار ۔ ہاں بھئی مانتے ہیں۔ تمہیں اُس کے متعلق ہم سے زیادہ معلوم ہوگا۔

کنور ۔ دوستو! ہم تو یہ جانتے ہیں کہ لڑکی لاکھوں میں ایک ہے ۔ ہم نے اُسے ایک بار دیکھا تھا۔ بس شعلہ ہے نرا۔

سدرشن ۔ بکواس مت کرو جی۔

کنور ۔ اوفو ایسے ۔ اتنی حمایت ۔ میاں اگر اُن سے اتنی گہری چھنتی ہے تو ایک شام اُنہیں ذرا بلا تو دیکھو۔ آخر تم جو اُن پر جان و مال سے فدا ہو تو وہ تمہارا گھر بھی دیکھنا نہ چاہیں گی۔

سدرشن ۔ جی میں نے اُن سے کبھی کہا ہی نہیں اگر کہوں تو وہ سو بار آئیں۔

کنور ۔ معاف کیجئے گا اگر اُنہیں آپ سے اتنی محبت ہوتی تو اب تک شادی کبھی ہوتی۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ چاہتی ہیں بس ذرا دُور ہی سے بات رہے۔

سدرشن ۔ یہ آپ محض بک رہے ہیں محبت کو آزمانا تو ہر شادی سے پہلے جائز ہے۔

کنور ۔ تو سیدھی سادھی بات ہے کہ آج شام ذرا اُنہیں کھانے پر بلوا لیجئے آخر یہ تو اب سارے جانتے ہیں کہ آپ اُنہیں روز ملنے کے لئے جاتے ہیں اور وہ اکیلی ہیں۔ بے شک وہ اپنی جگہ بڑی شریف ہیں مگر لوگوں کو کیا معلوم اس صورت میں اُنہیں صرف آپ کی خاطر یہاں آنے میں بھی کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیئے۔

کمار ۔ بھئی بات تو معقول ہے۔

سدرشن ۔ ہاں مگر میں سمجھتا ہوں کہ جتنی سچی اور پاک محبت انہیں مجھ سے ہے شاید مجھے بھی اُن سے نہیں۔ تم سمجھتے نہیں عورت کی محبت کو۔ ابھی کمسن ہونا؟

کنور ۔ (ذرا ہنستے ہوئے) تو بلا دیجئے اُنہیں ذرا آج۔ آزما دیکھئے محبت کیوں بھئی دلجیت؟

دلجیت ۔ (اخبار پڑھتے ہوئے) بالکل!

سدرشن ۔ بندہ عرض کر رہا ہے کہ اُنہیں یہاں آنے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا اور آپ کو مُنہ کی کھانی پڑے گی (ہنستے ہوئے) اگر آپ آج شام نہیں کھانا کھانا چاہتے ہیں تو پہلے کی طرح اب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔

کنور ۔ جی نہیں اگر آپ چاہیں تو بڑی سے بڑی دعوت پر دام میں خرچ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ آپ اُنہیں بلانے والے نہیں وہ یوں آئیں گی ہی نہیں۔

سدرشن ۔ (چڑ کر) میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ تم یہ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو۔ میں نہیں بلانا چاہتا اُنہیں۔

کنور ۔ (ہنس کر) تو اگر آپ نے پہلے ہی فرما دیا ہوتا کہ انگور ابھی کھٹے ہیں تو بحث ہی نہ ہوتی۔

سدرشن ۔ اچھا صاحب اگر میں نے اُنہیں آج شام ہی کو کھانے پر بلا دیا تو کیا دیں گے۔

کنور۔ (ہنس کر) دیں گے کیا؟ اُلٹا تمہیں دینا چاہیئے تمہارے گھر پہلی دفعہ آئیں گی وہ۔

سدرشن۔ بس اسی بات پر پھدک رہے تھے۔ شرط لگایئے تو ہم تیار ہیں۔

کمار۔ چلو یار رہی شرط۔ ہم سب بھی ہو گئے نا یہاں!

سدرشن۔ اور نہیں کیا۔ جب وہ آجائیں گی تو کھانا کھاتے ہوئے چپکے سے سو روپیہ میری مٹھی میں رکھ دینا سمجھے۔

کمار۔ جی ہاں۔ اور اگر وہ نہ آئیں تو سو میں سے ایک ایک بجا کر لونگا دوست۔

سدرشن۔ مان لیا۔ لو بھئی دلجیت! یار یہ کیا بکواس ہے یہاں اخبار پڑھنے آئے تھے۔

دلجیت۔ ہاں بھئی ہاں سن رہا ہوں سو سو روپے کی شرط لگ گئی ہے (ہنستے ہوئے) میں اور کنور گواہ ہیں۔ لیکن کمار دوست ہار جاؤ گے سو روپیہ کم نہیں ہوتا۔

کمار۔ اماں رہنے دو یار۔ لاکھوں میں جیتیں گے۔

سدرشن۔ (ہنس کر) دیکھو بھئی کمار سوچ لو یہ مذاق نہیں ہے بعد میں کچھ نہیں ہو سکے گا اور اب اگر اپنی بات سے پھر بھی گئے تو سو روپیہ دھروا لوں گا۔

کمار۔ میری جان! بچن ہے بچن۔

سدرشن۔ بس ٹھیک ہے —— میں ابھی آیا۔

دلجیت۔ کہاں جا رہے ہو بھئی۔ ٹھہر تو جاؤ۔

سدرشن۔ یہیں ہوں ابھی آتا ہوں۔

(سدرشن چلا جاتا ہے)

دلجیت۔ (ہنس کر) عقل کے اندھے تُو نے کس برتے پہ شرط لگائی ہے۔ اُس کا یہاں آنا کون سی بڑی بات ہے۔

کنور۔ پٹھا تاؤ میں آگیا تھا۔

کمار۔ یار تم ہی لوگوں نے مجھے شہہ دی تھی۔ واقعی یار وہ تو آجائے گی۔

(سدرشن داخل ہوتا ہے)

سدرشن۔ (داخل ہوتے ہی) کیا کہا۔ آجائے گی کیوں ابھی

کمار۔ (ہنس کر) اوہو میں تو یہ کہہ رہا تھا۔ آئیں گی نہ آئیں گی۔

سدرشن۔ اچھا میں سمجھا پچھتا رہے ہو۔ مگر اب بنتا کیا ہے دوست۔ اچھا بھئی آج ساڑھے آٹھ۔ تم لوگ آٹھ بجے یہاں پہنچ جانا۔

دلجیت۔ ہم تو ابھی سے کمار کا شکریہ ادا کئے دیتے ہیں۔ یہ دعوت تو اسی کی وجہ سے ہوئی۔ پھر بھابی کو بھی دیکھ لیں گے ساتھ ہیں۔ اچھا بھئی میں جا رہا ہوں۔

کنور۔ ہاں ہاں اُٹھو یار۔ کمار تم بھی چلو گے۔

(سب اُٹھ بیٹھتے ہیں)

سدرشن۔ ہاں! اب میں تمہیں روک نہیں سکتا (ہنس کر) مجھے دعوت کا انتظام بھی تو کرنا ہے۔

(سب چلے جاتے ہیں)

دلجیت۔ (موٹر کا دروازہ کھلنے کی آواز) واہ! مسٹر کمار۔ کر گئے بچنا۔ وہ سدرشن! اُس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے۔

کنور۔ او کیا ہوا یار پھر۔

کمار۔ اجی سو روپیہ اُن کی جوتیوں پر وار کر پھینک دیں۔ دوستو تمہیں پتہ نہیں معلوم مجھے بھی تھا کہ (موٹر چلنے کی آواز آتی ہے) میں بھی جانتا تھا کہ وہ آجائیں گی۔ لیکن اب اُنہیں دیکھ تو لیں گے۔ سنا ہے بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ اور یوں تم سمجھتے ہو سدرشن بلاتا اُسے تمہیں دکھانے کے لئے۔ کیوں کیسی گہری چال تھی۔ اب شام ذرا دل لگی رہے گی۔ تم ہی روز کہا کرتے تھے۔ یار اُسے کبھی دیکھیں یار اُسے دیکھیں کسی دن۔

(آواز آہستہ آہستہ غائب ہو جاتی ہے)

(پردہ)

لیلا کی چھوٹی سی مگر خوشنما کوٹھی کا ڈرائنگ روم۔ مکلف فرش پر تین صوفے پڑے ہیں۔ جن پر آسمانی رنگ کا اطلس منڈھا ہے۔ ہر صوفے کے پاس چھوٹی سی تپائی پر راکھ جھاڑنے کی ایک چمکتی ہوئی طشتری نظر آتی ہے۔ صوفوں کے درمیان ایک بڑی تپائی پر گلدستہ رکھا ہے۔ دروازوں پر نہایت عمدہ گلشن کے پردے پڑے ہیں۔ لیلا آبی رنگ کی ایک ساڑھی میں ملبوس خاصدان میں گلوریاں رکھتے ہوئے گنگنا رہی ہے سر سے ساڑھی کا آنچل کھسک گیا ہے۔

کوٹھی کے باہر موٹر رکنے کی آواز آتی ہے۔ سدرشن سیاہ قیمتی اچکن۔ برف کی طرح سفید چست پاجامہ۔ پاؤں میں خوشنما سلیم شاہی جوتی پہنے ہوئے اور ایک بانکی ٹوپی خاص انداز سے سر پر دھرے برآمدہ میں داخل ہوتا ہے اور اپنے لباس پر ایک نظر دوڑاتے ہوئے ایک نازک سی چھڑی سے دروازہ کھٹکھٹاتا ہے

لیلا (ساڑھی کا آنچل سنبھالتے ہوئے) کون ؟

سدرشن۔ (مسکراتے ہوئے) میں ہوں ... جناب کا سدرشن !

(لیلا دروازہ کھولتی ہے)

سدرشن۔ (داخل ہوتے ہی مسکراتے ہوئے) معاف کیجئے ! میں کل کے مقررہ وقت پر حاضر نہ ہو سکا۔ چند دوست آ گئے اور پھر مال پر نئی موٹر خریدتے خریدتے دو گھنٹے اور لگ گئے کمبخت !

(صوفے پر بیٹھتے ہوئے بغل سے سگرٹوں کا ڈبہ نکال کر تپائی پر رکھ دیتا ہے)

لیلا۔ (بھولے پن سے) جی ہاں۔ آپ کو کیا ! کوئی جلتا رہے۔ انتظار کرتا رہے آپ کی بلا سے !

سدرشن۔ (تیکھی نظروں سے دیکھ کر) کیا کہا ذرا پھر تو فرمایئے گا۔

لیلا۔ (ایک ادا سے منہ موڑ کر) اب کوئی سنے بھی نہ تو ہم کیا کریں۔ ہم کسی سے کہنے گئے تھے کہ یوں ہی راہ چلتے دیکھ کر ہمیں کوئی خط بھیجے شروع کر دے۔ اور نہ ہم نے کسی سے یہ کہا تھا کہ جب ہم ایک کا جواب بھی نہ دیں تو پھر خود آ جائے اور لگے خواہ مخواہ محبت جتانے۔

سدرشن (مسکرا کر سگرٹ جلاتے ہوئے) اُف ! اوہ اتنا غصہ۔ ہمیں جو تم سے محبت ہے اُس کا حال ہمارا دل جانتا ہے۔ ہم جہاں بھی ہوتے ہیں۔ تمہاری پیاری پیاری صورت آنکھوں کے سامنے رہتی ہے دل ہے کہ اُڑا جاتا ہے۔

(اُٹھ کر لیلا کے صوفے پر بیٹھ جاتے ہیں)

لیلا۔ (تنک کر) اپنی جگہ پر بیٹھئے۔ اے واہ ! ایسی بھی کیا ہوئی ڈھٹائی۔ ہم نہیں اب بیٹھتے یہاں۔

سدرشن۔ (ساڑھی کے آنچل کا ایک کونہ پکڑ کر) تو نہ بیٹھئے۔ جائیے !

لیلا۔ (پیار سے جھڑک کر) آپ چھیڑ خانی سے باز نہیں آتے۔ جیسے ہم نے دیکھا نہیں آنچل پکڑے ہوئے ہیں اور کہتے ہیں۔ جائیے جائیے بس یہی باتیں تو ہمیں بھاتی نہیں۔ ہمیں نہیں لگتا ایسا مذاق اچھا۔

(سدرشن قہقہہ لگاتا ہے اور لیلا دوسرے صوفے پر بیٹھ جاتی ہے)

سدرشن۔ روٹھ گئیں ؟ ہم سے غلطی ہوئی۔

(لیلا گال کو ہاتھ کا سہارا دیئے خاموش رہتی ہے)

سدرشن (ذرا ٹھیر کر مسکراتے ہوئے) ہم اپنے تصور کی معافی چاہتے ہیں۔

لیلا۔ یہاں جانے ہم کس غم میں بیٹھے ہیں۔ انہیں دل لگیاں سوجھتی ہیں۔

سدرشن۔ آخر ہم بھی تو جانیں ایسی کیا بات ہو گئی۔

لیلا۔ آپ کیوں پوچھیں آپ موٹریں خریدیئے۔ دوستوں میں بیٹھئے۔ ہم کسی شمار میں نہیں۔

سدرشن۔ میری جان بولو تو سہی۔ کچھ کہو بھی۔ تمہیں یوں دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔

لیلا۔ اوپر سے نیچے، نیچے سے اُوپر، کڑھتی ہی رہی سارا دن !

سدرشن۔ کس نے تکلیف پہنچائی ؟ ہم نے ؟

لیلا۔ صبح صبح موئی بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی۔

سدرشن۔ (بیتاب ہو کر پیار سے) ہم کچھ نہیں سمجھ رہے آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ ہم آپ کے لئے وہ بھی کرنے کو تیار ہیں جو ہماری طاقت میں نہ ہو۔

لیلا۔ (ایک دلربا انداز سے گردن پھیرتے ہوئے) بس رہنے دیجئے۔ ہم نے دیکھ لیا۔

سدرشن۔ (حیران ہو کر) یہ کیا کہہ رہی ہو میری رانی۔ خدا کرے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔

(لیلا خاموش رہتی ہے)

سدرشن (عجز سے) بولو تو سہی میری جان۔

لیلا۔ بولیں کیا۔ ابھی ابھی ہمسائی آئی تھی۔ ہمیں ایسی صلواتیں سنائیں کہ ہم بعد میں رو رو کر مر گئے۔ بڑی بن کر کہنے لگی۔ بی بی جن سیٹھ صاحب سے تم نے ناتا جوڑا ہے اُن سے شریف عورتیں کوسوں دور بھاگتی ہیں اور جب ہم نے اُسے ڈانٹا اور آپ کی تعریف کی تو ناک پر ہاتھ دھر کر کہنے لگی۔ بی اُنہیں تم سے ایسی ہی لگاوٹ ہے تو کرایہ کے مکان میں کیوں رہتی ہو۔ یہی کوٹھی آٹھ ہزار میں بکتی ہے۔ لو کہو تو خرید دیں۔ سیٹھ ہیں۔ پر ہم جانتے ہیں کہ اگر تم نے یہ کہا تو وہ کبھی بھولے سے بھی ادھر کا رخ نہ کریں گے۔ اُن کی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔ ہم جب بھی یہ سوچتے ہیں تو رونے لگتے ہیں

سدرشن۔ اُف اوہ ! اب سمجھا۔ بس اتنی سی بات تھی ؟ ہم اُس عورت کی زبان گدی سے کھنچوا ڈالیں گے۔ اور آپ نے یہ بات ہم سے بے جھجک کیوں نہ کہی ؟ ہم کل سے اس سے بھی اچھی کوٹھی آپ کے لئے بنوانا شروع کریں گے۔

لیلا۔ (غمگین لہجہ میں) اگر ہم کوٹھی کو کیا کریں۔ آپ ہماری چیزیں بازار لے جا کر بکوا دیجئے۔ جب تک ہم اُسے آٹھ ہزار روپیہ نہ دکھا لیں ہم نہ سوئیں گے نہیں ہم کسی کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتے۔

سدرشن۔ تم سمجھتی ہو ہم اتنے ہی بے غیرت ہیں کہ نہیں شوق سے دی ہوئی چیزیں پھر بازار میں لے جاکر بکوا دیں گے۔ ہم ابھی آتے ہیں۔

(سدرشن جوش سے اُٹھتا ہے)

لیلا۔ (پیار سے) جلد آئیے گا ہم آج بہت اُداس ہیں۔

(سدرشن مسکراکر چلا جاتا ہے موٹر کے چلنے کی آواز آتی ہے ہارن کی آواز رفتہ رفتہ دُور ہوتی جاتی ہے۔ کچھ دیر بعد موٹر کے آکر کھڑا ہونے کی آواز آتی ہے۔ اور سدرشن ایک تیزی سے نمودار ہوتا ہے۔)

لیلا۔ (حیرانی سے) ارے پانچ منٹ میں واپس؟

سدرشن۔ (ایک ایک کر کے آٹھ ہزار کے نوٹ تپائی پر رکھ دیتا ہے) بس یہی بات تھی۔ اب ذرا مسکرا دیجئے تو؟

لیلا۔ (نیچی نظروں سے مسکراکر خوشی سے) میں پہلے ہی کہتی تھی۔ وہ ایسے نہیں ہوں گے۔ وہ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے (لجاکر) میری محبت آپ کو بہت مہنگی پڑی۔ سچ ہم بہت شرمندہ ہیں۔

سدرشن۔ مہنگی؟ اس کا کوئی مول نہیں۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش قسمت سمجھتا ہوں۔

لیلا۔ (محبت خیز اشارے سے) اور ہم؟ ہم اسی وقت اس عورت کو بلا کر یہ روپیہ دکھاتے ہیں۔ اور کل! کل کوٹھی لے لیں گے۔ (پیار سے) کیوں ٹھیک ہے نا۔

سدرشن۔ (مسکراکر) اچھا تو اب ایک ہماری بات بھی مانئے۔ آج کھانا ہمارے ہاں کھائیے گا۔

لیلا۔ اے واہ! تو آپ ہمارے ہاں کیوں نہ کھائیں۔

سدرشن۔ نہیں ہم یہاں کبھی پھر کھائیں گے (پیار سے) دیکھئے آپ نے انکار کیا تو ہمیں بہت افسوس ہوگا۔

لیلا۔ (ناز سے) سچ؟ تو پھر آپ کی خوشی۔

سدرشن۔ آج میں بہت خوش ہوں (پھر گھڑی دیکھ کر) اُف اوپونے سات۔ تو مجھے اب اجازت دیجئے۔ میں ایک گھنٹے تک موٹر بھیج دوں گا۔

لیلا۔ اور سنئے تو ہم لباس کون سا پہنیں۔

سدرشن۔ وہی آسمانی ساڑھی۔

(پردہ)

(سدرشن کا شاندار کھانا کھانے کا کمرہ۔ وسط میں میز پر کھانا کھانے کا سامان قرینے سے چُنا گیا ہے۔ دو نوکر سفید کوٹ پہنے ادھر اُدھر کچھ چیزوں کو سجا رہے ہیں۔ گھڑی پونے آٹھ بجاتی ہے۔ کمار، کنور اور دلجیت ہنستے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ نوکر چلے جاتے ہیں۔)

کنور۔ (میز کی طرف دیکھتے ہوئے) بہت خوب! دو کمار کی جان کو دعائیں۔

دلجیت۔ آج دیکھو ڈرائننگ روم کی سج دھج!

(سدرشن فوق البھڑک لباس میں داخل ہوتے ہیں)

سدرشن۔ واہ! خوب بن ٹھن کر آئے ہو یار (میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیوں یہ سب کچھ ٹھیک ہے نا!

کنور۔ او! بہت زیادہ۔

سدرشن۔ (ہنستے ہوئے) کیوں کمار تم نہیں بول رہے! دیکھو نا بیچارے کا چہرہ اُتر گیا ہے پچھتا رہا ہے۔ اماں دیکھ لیا ہوتا کس سے ٹکر لے رہے ہو۔ آج صبح میں وہاں گیا۔ سچ انہوں نے ایک بار نہیں کہا میں نہیں جاتی۔ بلکہ اُلٹی خوش ہوئیں۔

کمار۔ (متانت سے) سو روپے بھی لے آئے ہیں!

سدرشن۔ میرا خیال تھا نہیں ایک دو گھنٹے پہلے بلواؤں۔ مگر خود تو میں انتظام میں لگا ہوا تھا۔ ہاں بھئی دیکھو۔ وہ حد سے زیادہ تمیز دار اور ایک ایک بات سمجھ سوچ کر کرنے والی ہے۔ بے وقوفی کی باتوں پر مذاق اڑانا اسے بہت اچھا لگتا ہے اس لئے ذرا ....

کمار۔ اماں رہنے بھی دو یار تو ہم بدتمیز ہوئے سارے۔

سدرشن۔ او نہیں بھئی میرا یہ مطلب نہیں۔

(موٹر کے آنے کی آواز آتی ہے)

سدرشن۔ آگئیں! (جاتا ہے)

(سب نوجوان اپنے لباس کو ٹھیک کرتے اور دیکھتے ہیں)

موٹر ڈرائیور۔ (موٹر سے اترتے ہی) حضور وہ تو وہاں نہیں ہیں۔

سدرشن۔ پاگل ہو!

موٹر ڈرائیور۔ صاحب اسی کوٹھی میں جہاں کئی دفعہ گیا ہوں۔ میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں حضور!

سدرشن۔ (بے چینی سے) تو تم نے اندر جاکر دیکھا۔

موٹر ڈرائیور۔ اجی دس منٹ تک تو میں باہر ہارن بجاتا رہا۔ دروازے سارے کھلے تھے پھر اندر جاکر کونہ کونہ دیکھا وہاں تو کوئی نہیں تھا۔

سدرشن۔ (ذرا مسکراکر) اچھا شاید وہ پہلے چل پڑی ہوں مگر ..... (موٹر میں بیٹھتے ہوئے) اچھا میں خود جاتا ہوں۔ تم اندر جاکر کہہ دو صاحب

ابھی آتے ہیں اور کچھ نہ کہنا۔

سدرشن چلا جاتا ہے۔ لیلا کی کوٹھی کے سامنے موٹر رکتی ہے۔ سدرشن سب سے پہلے ہراساں و پریشاں ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔ سب سامان اسی طرح پڑا ہے سامنے تپائی پر گلدستہ کے پاس ایک بنڈل پڑا ہے اور پاس ایک کاغذ۔ سدرشن کاغذ اٹھا کر پڑھتا ہے۔

ڈیر سدرشن۔

ایک ضروری کام سے جا رہی ہوں اس ساڑھی کی آپ نے دو تین مرتبہ بہت بہت تعریف کی تھی۔ یادگار کے طور پر چھوڑ رہی ہوں۔ مگر جلد ہی آپ سے پھر ملوں گی

آپ کی .... لیلا

سدرشن (خط پڑھ کر جیسے جنون میں) ضروری کام ؟ اُف میں کہیں کا نہیں رہا (صوفے پر جیسے نیم بے ہوشی کی حالت میں گرتے ہوئے آہستہ سے) آٹھ ہزار .... بس جلد پھر ملوں گی۔ (صوفے پر لیٹ جاتا ہے)

آخری سین

کلکتہ کا ایڈن گارڈن - شام کا وقت ہے۔ آسمان پر بادل چھا رہے ہیں۔ باغ میں بہت چہل پہل ہے۔ کبھی کبھی ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑنے لگتی ہے۔ اس لئے سیر کو آئے ہوئے اکثر لوگ جلد جلد چلتے ہوئے نظر آتے ہیں مگر... فوارے کے قریب دو خوش وضع اور خوش پوش آدمی نہایت اطمینان سے ٹہلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ایک آدمی کی بغل میں ایک چھوٹا سا بنڈل ہے دوسرے سے ذرا پرے ہٹ کر ایک لڑکا اپنے پاس چمڑے کا ایک چھوٹا سا سوٹ کیس لئے بیٹھا ہے۔ دونوں آدمی کبھی کبھی کنکھیوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ لیتے ہیں۔ چالیس پینتالیس گز کے دائرہ میں اگر ایک شمال کی طرف سے آتا ہوا جنوب کی طرف جاتا ہے۔ تو دوسرا ذرا دور رہ کر مشرق سے مغرب کی طرف چلتا ہے۔ ننھی ننھی بوندیں برابر پڑ رہی ہیں)۔

ایک آدمی (دوسرے کو ذرا اپنے نزدیک پا کر بلند آواز سے) کیوں صاحب آپ کے پاس گھڑی..... کیا میں وقت پوچھ سکتا ہوں۔

دوسرا آدمی (فوراً نزدیک آ کر) کیا فرمایا آپ نے ؟

پہلا آدمی - (بڑے لحاظ سے) میں وقت پوچھ رہا تھا۔

دوسرا آدمی (کلائی سے کوٹ کی آستین ذرا اوپر کر کے) صاحب پونے چھ بجے ہیں .... آپ ...

پہلا آدمی (اپنی گھڑی دیکھ کر) جی ؟

دوسرا آدمی :- آپ شاید کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔

پہلا آدمی - جی ہاں۔

دوسرا آدمی - (مسکرا کر) اچھا ! اتفاق کی بات ہے مجھے بھی ایک صاحب نے اسی جگہ انتظار کرنے کو کہا تھا۔

پہلا آدمی (آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے) بارش خوب ہونے لگی۔

دوسرا آدمی - جی ہاں ایسے پھوار ہی ہے۔

(خاموشی)

دوسرا آدمی - تو آپ کلکتے ہی کے رہنے والے ہیں۔

پہلا آدمی (ذرا ٹانگیں پھیلا کر کھڑے ہوتے ہوئے) جی میں کلکتہ کا تو نہیں۔ مگر یہاں رہتے ہوئے اتنا عرصہ ہو گیا ہے کہ کلکتہ ہی کا سمجھ لیجئے۔ آپ تو شاید دہلی سے سیر......

دوسرا آدمی - جی نہیں میں لکھنؤ کا رہنے والا ہوں ..... مجھے

پہلا آدمی - خوب ! (ذرا ٹھہر کر لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے) یہ آپ کے صاحبزادے ......

دوسرا آدمی - جی نہیں یہ تو میرا ملازم ہے۔

(پہلے آدمی کے چہرے پر ندامت کی ہلکی سی رو دوڑ جاتی ہے)

(متانت سے) آپ کے کوئی دوست پہنچ رہے ہیں یہاں۔

پہلا آدمی - جی ! جی ہاں (پھر گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے) ساڑھے پانچ سے چھ بجے کا وقت مقرر تھا اُن سے، معلوم نہیں اب تک کیوں نہیں آئے

دوسرا - (ہنس کر) صاحب میں پھر آپ سے کہوں گا کہ یہ عجیب اتفاق ہے جن صاحب سے مجھے ملنا ہے انہوں نے بھی آج عین اسی وقت کے درمیان مجھے انتظار کرنے کو کہا ہے۔

پہلا آدمی - (نہایت متانت اور بے پروائی سے) "جہاں" ہو جاتا ہے اتفاق !

دوسرا - کیا فرمایا آپ نے !

پہلا آدمی - (ذرا ہنس کر مگر مسکراتے ہوئے) صاحب میں حیران ہوں کہ آپ اس بات کو اتنا دلچسپ کیوں سمجھ رہے ہیں۔ میں عرض کر رہا ہوں کہ معمولی اتفاق ہے۔

دوسرا - اخوہ ! معاف کیجئے شاید میری باتیں آپ کو ناگوار گزر رہی ہیں

پہلا - (مسکرا کر بناوٹی لہجہ میں) جی نہیں۔ ہرگز نہیں۔

دوسرا (نہایت خندہ پیشانی سے سگریٹ باکس بڑھاتے ہوئے) سگریٹ ہی پیجئے گا۔

پہلا۔ (ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر) جی نہیں! شکریہ!

(دوسرا آدمی تنبا کو کو ہموار کرنے کے لئے سگریٹ کو آہستہ آہستہ دو تین دفعہ سگریٹ کیس پر ٹھونک کر سلگاتا ہے۔)

(خاموشی)

دوسرا۔ (سانس لے کر) اچھا صاحب!

(سگرٹ کا کش لگا کر ٹہلنے لگتا ہے۔ پہلا آدمی اپنی باہیں ایک دوسرے سے جوڑ کر آہستہ آہستہ دوسری طرف چل دیتا ہے)

لیلا۔ ایک خوبصورت نوجوان کے ساتھ ہلکے رنگ کی زرد ساڑھی میں ملبوس مسکراتی ہوئی آرہی ہے۔ مسٹر موہن کے چہرے پر ایک خاص بشاشت ہے لیلا ذرا قریب پہنچ کر پہلے آدمی کو خود فراموشی کے عالم میں ٹہلتے دیکھ کر قہقہہ لگائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ صاحب چونک کر لیلا کی طرف دیکھتے ہیں۔ دوسرا آدمی تیز قدم اٹھاتے ہوئے بیک وقت لیلا اور پہلے صاحب کی طرف بڑھتا ہے

پہلا آدمی ۔ (سدرشن کی طرف دیکھتے ہوئے جھنجھلا کر) معاف کیجئے

دوسرا آدمی۔ مجھے ذرا ان خاتون سے آپ؟

لیلا (آگے بڑھ کر ہانپتے ہوئے) ہیلو مسٹر سدرشن! اخاہ! سیٹھی صاحب! کہئے آپ لوگوں کے مزاج تو اچھے ہیں۔

مسٹر موہن خاموش کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ سیٹھی صاحب کے چہرہ پر اضطراب چھا رہا ہے۔ سدرشن کچھ گھبرا سا گیا ہے۔

لیلا! اوہ! آپ کا تعارف تو کراؤں۔ مسٹر سدرشن یہ میرے شوہر ہیں مسٹر موہن (پہلے موہن اور پھر سدرشن کی طرف دیکھتے ہوئے) موہن! یہ لکھنؤ کے بہت بڑے سیٹھ ہیں اور ہمارے چھوٹے بہنوئی ہونے ہیں

سدرشن (موہن سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی (مگر چہرہ کا رنگ بدل جاتا ہے)

لیلا (مسکرا کر سیٹھی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے) ہمارے بڑے بہنوئی ہیں سیٹھی صاحب آپ تو موہن کو جانتے ہیں۔ ان سے میری شادی ہوئے پانچ دن ہوئے ہیں۔

مسٹر سیٹھی (مسکرانے کی کوشش کرکے) بہت خوب۔

(سیٹھی صاحب بے حس نظر آتے ہیں)

لیلا۔ مسٹر سدرشن! (سیٹھی صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے) آپ کا نام کاماتا پرشاد سیٹھی ہے۔ کلکتہ کے بہت بڑے رئیس ہیں۔

سدرشن (سیٹھی صاحب سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی

لیلا۔ تو آیئے نا اس بنچ پر بیٹھیں۔

(چاروں ایک قریبی بنچ کی طرف چل پڑتے ہیں) لیلا بنچ کے ایک طرف بیٹھ جاتی ہے اس کے بعد موہن پھر سدرشن اور سیٹھی صاحب، سدرشن اور سیٹھی صاحب کے چہروں پر وہی پریشانی موجود ہے۔

لیلا (ذرا آگے کو جھکتے ہوئے) میں آپ لوگوں کا بہت شکریہ ادا کرتی ہوں کہ آپ میرے کہنے پر آج یہاں تشریف لے آئے میں نے آپ کو ایک ہی دن خط لکھے تھے۔

سدرشن۔ (بڑے ادب سے) جی"....

(مسٹر سیٹھی کنکھیوں سے لیلا کی طرف دیکھتے ہیں)

لیلا۔ ہم تین بہنیں ہیں۔ میرا نام تو آپ جانتے ہی ہیں۔ میری بڑی بہن کا نام شیاما ہے اور چھوٹی کا موہنی ہمارے پتاجی کو اس جہان سے سدھارے اب تیسرا سال ہے۔ ان کی موت کے بعد ہم پڑھی لکھی بہنوں نے اس غریبی کے اتنے دکھ جھیلے کہ میری دونوں بہنوں کو خود کمانے کے لئے گھر سے باہر نکلنا پڑا۔ سیٹھی صاحب نے یہاں شیاما سے بیاہ کر لیا۔ اور انہیں پر تملانے ایک بچہ بھی دیا۔ موہنی لکھنؤ چلی گئی۔ اور مسٹر سدرشن نے ان سے شادی کر لی مگر جب دونوں بہنیں روتی ہوئی گھر آگئیں تو میری بیوہ ماں اور میری آنکھوں میں دنیا اندھیر ہوگئی سیٹھی صاحب آپ سے میں نے جو روپیہ لیا وہ آپ کی بیوی اور بچے کے کام آئے گا اور سدرشن صاحب آپ کے روپیہ سے آپ کی بیوی کا گزارہ ہونا اب کوئی مشکل نہیں۔ بس میں نے یہی عرض کرنے کے لئے آپ لوگوں کو تکلیف دی تھی۔ سو اب ہمیں اجازت دیجئے۔

(لیلا اور موہن اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ موہن مسٹر سیٹھی اور سدرشن سے ہاتھ ملاتے ہیں مسٹر سیٹھی اور سدرشن بڑے ادب سے لیلا کو نمسکار کہتے ہیں لیلا اور موہن چل دیتے ہیں۔

ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ باغ کے پھول اپنے پودے جوبن پر ہیں کبھی کبھی کوئی بوند بھی گر جاتی ہے۔ مسٹر سیٹھی اور سدرشن سر جھکائے مخالف سمتوں کو آہستہ آہستہ جا رہے ہیں۔ مسٹر سدرشن کے پیچھے ایک چھوٹا لڑکا ہاتھ میں سوٹ کیس لئے اپنی جوتی سے ایک کنکر کو دگے دگے ٹھوکر لگاتا ہوا جا رہا ہے۔)

فاروق علی خاں

پنجرے کا شیر

لرزتے تھے بیاباں و نیستاں اس کی ہیبت سے
چرندے اور پرندے کانپتے تھے اس کی صورت سے

جبال و دشت ہلتے تھے جب اٹھتی تھی صدا اس کی
پجاری بن کے کرتے تھے پرستش دیوتا اس کی

درندے اس کی صورت دیکھتے ہی سر جھکاتے تھے
صدا کو اس کی سن کر سام و رستم کانپ جاتے تھے

درندوں میں کہا کرتے تھے سب شیرِ ژیاں اس کو
بنایا تھا خدا نے جنگلوں کا حکمراں اس کو

گرجتا تھا یہ بادل کی طرح کوہ و بیاباں میں
کڑکتا تھا یہ بجلی کی طرح کنجِ نیستاں میں

کسی وادی میں جب تھک کر یہ محوِ خواب ہوتا تھا
تو اس کو دیکھ کر انساں کا زہرہ آب ہوتا تھا

رواں تھا اُس کی دارائی کا سکہ دشت و دریا پر
مثالِ آسماں چھایا ہوا تھا کوہ و صحرا پر

یہ آنکھیں اس کی دو تابندہ شمشیروں کی دھاریں تھیں
کہ روشن جن کی تابانی سے ہیبت ناک غاریں تھیں

تماشا ہے یہ لوہے کے قفس میں آج بیٹھا ہے
یقیں آتا نہیں مجھ کو یہی وہ شیرِ صحرا ہے

اسی لوہے کے جنگلے میں اب اس کی حکمرانی ہے
نہ ٹیلے ہیں نہ غاریں ہیں نہ سبزہ ہے نہ پانی ہے

کیا ہے بھوک نے یہ حال اس کا دامِ غربت میں
نہ وہ قوت ہے پنجے میں نہ وہ ہیبت ہے صورت میں

اب اس خونخوار چوپائے سے بچے بھی نہیں ڈرتے
رواں ہیں جسم پر مور و مگس اٹھکیلیاں کرتے

مگر اب بھی کبھی کنجِ قفس میں جب بپھرتا ہے
تو اس کی زلزلہ افگن صدا سے دل دہلتا ہے

تأمل ہے جوانمردوں کو بھی نزدیک آنے سے
پرے ہٹ کر کھڑے ہوتے ہیں اس کے قید خانے سے

نہیں یہ بات حیرت کی نہیں یہ ماجرا غم کا
یہ گردوں دشمنِ جاں ہے جواں مردانِ عالم کا

شغال و خوک کی تقدیر میں زنداں نہیں ہوتا
کوئی سگ کو قفس میں ڈال کر شاداں نہیں ہوتا

لکھی ہے یہ سعادت شیر کی قسمت میں قدرت نے
عطا کی ہے اسی کو یہ فضیلت دستِ فطرت نے

کوئی روباہ کا اے ہم نشیں دشمن نہیں ہوتا
کوئی دوں ہمتوں کی فکر میں جاں کو نہیں کھوتا

شکارِ شیر میں انساں جاں پر کھیل جاتا ہے
بڑا ہے نام جس کا اس کی قیمت بھی زیادہ ہے

بتاتی ہے یہ تابانی زلیخا کے شبستاں کی
مہِ کنعاں سے نسبت ہے اسیرِ کنجِ زنداں کی

اصغر حسین خاں نظیر

غزل

بسکہ نہ کام آ سکا عشق میں دل دیا ہُوا
حاصلِ زیست ہو گیا نام ترا لیا ہُوا

حدِّ جنوں سے ہوں پرے ورنہ کہاں کہ رہ سکے
خندۂ نوبہار سے چاکِ جگر سیا ہُوا

عشق کی آبرو وفا حُسن کی آرزو فنا
میرا کیا تو کیا ہُوا آپ نے جو کیا ہُوا

تیرے کرم سے گو اُٹھا لطفِ جہانِ مدعا
کم نہ مگر ہُوا ترا ذوقِ ستم دیا ہُوا

کیوں نہ ہوائے بے خودی ہو مجھے وجہِ خوشی
دے کے سکونِ زندگی ہے یہ جنوں لیا ہُوا

چارہ گرِ حیات نے موت سی شے بھی دی تو کیا
شوقِ طلب میں بارہا زہر یہ تھا پیا ہُوا

قیوّم نظر

دیہات سدھار و امداد باہمی پر نادر کتابیں

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	داستان دہقان	1/-
۲	دیہاتی زندگی	1/4/-
۳	مناظر امداد باہمی	1/-/-
۴	امداد باہمی اور ہندوستان	1/8/-
۵	مالیات دیہات	1/8/-
۶	آئینہ پنجاب	/12/-
۷	جمہوریت امداد باہمی	/4/-
۸	امداد باہمی اور برہما	/4/-
۹	معاشیات دیہات	/12/-
۱۰	بنک ہائے عوام	1/8/-
۱۱	حیات دیہات	/4/-
۱۲	رسالہ کوآپریشن (ماہواری) سالانہ چندہ	3/-/-

رجسٹر برائے انجمن امداد باہمی کفایت شعاری و قرضہ

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
۱	روکڑ بہی	1/14/-
۲	کھاتہ بہی	1/14/-
۳	تمسک	1/2/-
۴	کارروائی	1/2/-
۵	حد قرضہ	1/2/-
۶	ممبران	1/2/-
۷	قسطبندی	1/2/-
۸	حصہ داری	1/2/-
۹	ضمانت نامہ خورد	1/2/-
۱۰	ضمانت نامہ کلاں	1/12/-
۱۱	پاس بک	1/2

محصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔ ہر کتاب مجلد ہے۔

ملنے کا پتہ پنجاب کوآپریٹو یونین لاہور

ہمالیہ پربت کی طرح مشہور و لاثانی
KHAKI
خاکی
DRILLS TWILLS CANVAS
& BEDFORD CORD
ڈرِل۔ ٹوِل۔ کینوس اینڈ بیڈفورڈ کارڈ
اپنے شہر کے کپڑے کے ہر ایک سٹور سے طلب کریں!
تیار کردہ
دی بکنگھم اینڈ کرناٹک کمپنی لمیٹڈ مدراس۔
سول ڈسٹری بیوٹرز } برجموہن کرشن پرشاد کٹڑہ اہلووالیاں امرتسر
دیگر دفاتر۔ لاہور۔ راولپنڈی۔ پشاور۔
دہلی۔ کانپور۔ بمبئی